زندگی خالقِ حقیقی کی امانت ہے۔
قدرت کی طرف سے سب سے حسین تحفہ بھی۔

اور جب ایک بندہ اسے پوری محبت سے ایک عبادت کی طرح گزار کر خالقِ حقیقی کے سپرد کرتا ہے تو بندہ اپنے رب سے راضی، اور رب اس سے راضی۔ آواز آتی ہے میرے بندے میری جنت میں داخل ہو جا۔

بشیر آرائیں کی زندگی بھی ایک مسلسل جدوجہد ہے۔ جس میں خوفِ خدا بھی ہے اور خدا کی مخلوق سے دلی محبت بھی، اپنے اردگرد کا درد بھی۔ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کو نواز رہے ہیں۔ رحیم و کریم انھیں نواز رہا ہے۔ ان کی منزلیں آسان کر رہا ہے۔ وہ کچی گلیاں نہیں بھولے تو کچی گلیاں بھی انھیں نہیں بھولی ہیں۔

خودنوشت صدیوں سے قارئین میں سب سے مقبول صنف رہی ہے۔ اس سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے۔ قدم قدم پر مشکلیں، مقابلے سے ہمت اور تدبر، ہر گام مصائب، سامنے تحمل، برداشت اور ادراک۔ جس محبت اور خلوص سے جیون گزارا، اسی لگن سے کہانی بیان کی گئی ہے۔ جتنی سادہ زندگی، اتنی ہی سادہ طرزِ نگارش۔ پڑھنے والا کتنا پتھر دل ہو، اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

پاکستان کی یہ سات دہائیاں جتنی بے یقینیوں اور بے چینیوں میں گزری ہیں، وہ سب اس آپ بیتی میں سطر سطر نقش ہیں، لیکن وہ عملاً مایوسی میں نہیں ڈھلتی۔ اور بیان کرنے والا بھی ناامیدی کی طرف لے کر نہیں جاتا۔

''خاک سا خاکی'' اردو ادب میں یقیناً ایک خوش گوار اضافہ ہوگا۔

محمود شام

خاک سا خاکی
بریگیڈیئر بشیر آرائیں
AB
ACADEMY BAZYAFT

خاک سا خاکی | بریگیڈیئر بشیر آرائیں

خاک سا خاکی

بریگیڈیئر بشیر آرائیں

اکادمی بازیافت

اپنی شخصیت پر اثر انداز ہونے والی تین خواتین کے نام

بی بی جی سائرہ نور جو میری ماں،

میری پیر، میری مرشد اور میری رہبر ہے۔

شریکِ حیات ڈاکٹر طلعت زہرہ جو بیوی سے زیادہ

میری محسنہ ہے، جو صلہ رحمی اور محبتوں کی جیتی جاگتی مثال ہے۔

بیٹی معصومہ حمزہ جو میری عزت، محبت اور میری انا ہے۔

جو میرے سر کا تاج اور میرا غرور ہے۔

فہرست

لانگ مارچ

میری بے ایمانیاں

مشکلیں ہزار

دیارِ غیر میں

کورونا کے دن

بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن

❑❑❑

چلا جاتا ہوں، ہنستا کھیلتا...

مئی ۲۰۲۲ء کی ایک تپتی ہوئی دوپہر میں گھر واپس آیا، دیکھا موبائل میں ایک بے نام مسڈ کال موجود تھی۔ رابطہ کیا، دوسری طرف ایک قدرے مانوس آواز نے دعا سلام کے بعد اپنے مخصوص، بے تکلّفانہ لہجے میں کہا، بریگیڈیئر بشیر آرائیں بول رہا ہوں، میری خودنوشت چھپنے جارہی ہے، مبین مرزا کے ادارے سے چھپوا رہا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ اس کا دیباچہ تم لکھو۔ میں نے جواباً کہا کہ بہتر ہوگا یہ تحریر کوئی نثار لکھے۔ کہو تو میں کسی سے بات کروں؟

''نہیں تم مجھے گزشتہ چالیس برس سے جانتے ہو۔ ہم نے ایک ساتھ سات سال میڈیکل کالج کے ہاسٹل میں ہم جماعت اور ایک دوست کی حیثیت سے وقت گزارا ہے۔ تم ہی لکھو گے۔''

بشیر صاحب نے جواب دیا۔ اس محبت آمیز تقاضے کے آگے میں ہاں نہ کرتا تو اور کیا کرتا۔

یہ جون ۲۰۲۲ء کا پہلا دن ہے۔ گزشتہ برسوں کے کورونا کی مسلسل گھٹن اور جبر نے طبیعت میں شدید اکتاہٹ پیدا کردی تھی، سو میں اور میری فیملی کچھ دن کے لیے سکون کا سانس لینے کی غرض سے کراچی چھوڑ کر ناران کی دل فریب وادی میں آنکلے۔ اس وقت جب کہ میرے بچے دل فریب وادی کے حسین نظاروں کی دریافت میں مزید اونچائیوں کے سفر پر روانہ ہوگئے ہیں، میں تنہا، ہوٹل کے کمرے میں، اپنے دیرینہ رفیق، ہم جماعت کے حوالے سے اپنے خیالات مجتمع کررہا ہوں۔

صاحبو! ایک ایسے لکھاری دوست کے ادب پارے پر، جس کے ہم راہ آپ نے زندگی کے نہایت پرجوش، ان گنت لمحے اور کھٹے میٹھے دن رات مل جل کر گزارے ہوں، اُس کی ذات

کے حوالے سے متوازن اظہارِ خیال آسان کام نہیں۔ لحاظ، مروت اور اپنائیت، تحریر کی روانی کو غیر محسوس طریقے سے متاثر کر ہی دیتے ہیں۔ میری بھرپور کوشش ہوگی کہ لفظ، علم، ادب، ڈاکٹر بشیر اور اس کتاب کے تعلق سے جو کچھ میں نے جانا، سمجھا اُسے پوری ایمان داری کے ساتھ سپردِ قلم کروں۔ بریگیڈیئر ڈاکٹر بشیر سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ صرف بشیر تھے۔

۷۶۔۱۹۷۵ء میں لیاقت میڈیکل کالج (آج کی لیاقت یونی ورسٹی آف میڈیکل سائنسز) میں سندھ بھر سے پانچ سو سے زیادہ طلبہ کا داخلہ ممکن ہوا۔ طلبہ و طالبات پر مشتمل یہ جماعت (کلاس) ایک دوسرے سے متعارف اور مانوس ہونے کے مرحلے میں تھی۔ دیگر شہروں سے آنے والے طلبہ ہاسٹل میں رہتے۔ ''المہر ان ہاسٹل'' میں، میں اور بشیر دونوں دیگر سیکڑوں طلبہ کے ساتھ رہتے تھے۔ ہاسٹل میں کھانے اور خوراک کی ضروریات کو طلبہ آپس میں امداد و تعاونِ باہمی کے ذریعے پورا کرتے تھے۔

یہ تو یاد نہیں کہ کب اور کس طرح لیکن یہ یاد ہے کہ بشیر ہمارے میس کے منیجر یا منتظم بن چکے تھے۔ اس بہانے اُن سے اکثر ملاقات اور آنا جانا تھا۔ بہت جلد بشیر دوستوں میں مقبول ہو گئے۔ تب وہ ایک نہایت چلبلے، زندگی سے بھرپور، کمال کے فقرہ باز آدمی تھے۔ ان کے جملوں پر دوستوں کے قہقہے بے اختیار پھوٹ پڑتے۔ میں ان کے قریب تر ہوتا چلا گیا، تب مجھ پر اس محفل باز، فقرہ طراز کی شخصیت کی جزئیات بھی ظاہر ہونا شروع ہو گئیں۔ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، گھومنے پھرنے کا یہ شوقین شخص ہر کلاس کے دیگر لڑکے لڑکیوں سے مختصر ملاقات میں گھل مل جاتا۔ بلا امتیازِ رنگ و نسل، علاقہ و زبان سب میں مقبول ہو جاتا۔ ان کی شخصیات کے رنگوں کو بھانپ کر اُن پر چست اور دل کش تبصرے کرتا۔ احباب کو ساتھ ملا کر رکھتا۔ محفل اس کے دم سے زعفران زار اور پُر رونق رہتی۔ روز روز نت نئے ارادے اور منصوبے بنانے والا بشیر سینما دیکھنا ہے، دریائے سندھ پر بارش میں پلّا مچھلی کھانی ہے، رات کے وقت جام شورو کے ریلوے پھاٹک پر بنے پُر فضا ہوٹل میں کڑاھی گوشت اور چائے پی کر لتا منگیشکر کے مقبول گانے سننے ہیں، کراچی سمندر پر جا کر ہلا گلا، پکنک منانی ہو تو ایسے سب منصوبوں کے مرکزی کردار بشیر ہی ہوتے۔ کالج کا میگزین نکالنا ہے تو بشیر کی مدد چاہیے۔ طلبہ کا دل چسپ انٹرویو کرنا ہے تو بشیر ضرور ساتھ ہوں گے۔ کالج کی یونین کا الیکشن ہے، بشیر کی رہنمائی چاہیے۔ تو جناب، یہ تھے ہمارے ماضی کے

ڈاکٹر بریگیڈیئر بشیر آرائیں۔ جی ہاں۔ سب ان کی صلاحیتوں کے معترف و مرعوب تھے۔

مگر کسی کو اس بات کا اندازہ نہیں تھا آگے جا کر، زندگی کے کسی موڑ پر بشیر زندگی کو انفرادی اور اجتماعی صورت میں ایک ادیب کی طرح نہ صرف دیکھیں اور سمجھیں گے بلکہ اس کے ڈھنگوں اور رنگوں کو نہایت مشاقی کے ساتھ صفحۂ قرطاس پر اس طرح منتقل کر دیں گے کہ وہ ہر پڑھنے والے کی داستان بن جائے گی اور ایک دن اُن کے احباب، رشتہ دار، ہم جماعت اُن کی آپ بیتی کو فخر و انبساط کے ساتھ پڑھیں گے اور سراہیں گے (جی ہاں مجھے اپنی بات پر کامل یقین ہے)۔ میری اس بات کے حق میں دلیل یہ ہے کہ میں نے جستہ جستہ سوشل میڈیا پر نہ صرف ڈاکٹر بشیر کی ان تحریروں کو پڑھا ہے بلکہ ان تحریروں پر ہزارہا تہنیتی اور تعریفی تبصرے بھی دیکھے ہیں۔ انھوں نے جابجا اپنی تحریر سے ثابت کیا ہے کہ:

چشم ہو تو آئنہ خانہ ہے دہر

بریگیڈیئر ڈاکٹر بشیر فوج میں ایک بھرپور اور فعال زندگی گزاریں گے، اس کا ہم دوستوں کو بخوبی اندازہ تھا، لیکن وہ اپنی سرگزشت، مشاہدات اور تجربات میں اپنے دوستوں اور چاہنے والوں کو نہایت رسیلے اور دل کش انداز میں شریک بھی کریں گے، یہ واقعی حیرت و مسرت کا مقام ہے:

وہ کہے اور ہنسا کرے کوئی

کا مرقع تو وہ تھے ہی مگر ایک دن:

وہ لکھے اور پڑھا کرے اور کوئی

کی مثال بھی قائم کر دیں گے۔ اس کا اندازہ کسی کو نہ تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی تحریر کا انداز نہایت سادہ اور پرکار ہے۔ جرأت بیانی ان کا خاصۂ تحریر، حقیقت پسندانہ خود اعتمادی کے ذریعے وہ اپنی زندگی کے کم زور سے کم زور (بظاہر) پہلوؤں کو بھی مزے لے لے کر بیان کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے موضوع یا مضمون کو بیان کرتے وقت قاری کو ذرا بھی اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیتے۔ ان کی کہی بات یا موضوع آسانی کے ساتھ پڑھنے والے کے اندر منتقل ہو جاتا ہے۔

بریگیڈیئر صاحب کا شخصی اعتماد جابجا اُن کی تحریر میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ آج اتنے بڑے عہدے پر متمکن ہو کر بھی اپنے ماضی کی غریب اور دیہاتی زندگی کو من و عن بیان کر دیتے ہیں۔ رتی بھر بھی تأمل یا جھجک محسوس نہیں کرتے، بلکہ وہ اس بات کا احساس بہ بانگِ دہل دلاتے رہتے

ہیں کہ یہ پس منظر اور (بظاہر) کم زوری ہی دراصل ان کی کامیاب زندگی کا محرک رہی ہے۔ یہی اُن کی قوت اور اُن کا سرمایہ ہے۔ وہ مشترکہ خاندانی نظام کو چاہے وہ کسی بھی حالت میں ہو ہر حال میں جدید مال دار اور ماڈرن زندگی کے مقابلے میں بدرجہ بہتر سمجھتے ہیں۔

بریگیڈیئر صاحب نے دنیا بھر کے سفر کیے ہیں، اُسے جی بھر کے دیکھا ہے۔ اسے وسیلۂ ظفر بھی بنایا ہے۔ ایک حساس، ذہین اور ہوش مند انسان کی طرح اس کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کے باریک سے باریک گوشوں اور پہلوؤں پر نگاہ ڈالی ہے، ایسے باخبر اور معاملہ فہم لکھنے والے کی آپ بیتی یا سرگزشت یقیناً اہلِ دل اور اہلِ لفظ و کتاب کے لیے انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح سے وژن میں کشادگی اور گہرائی کا وسیلہ بنتی ہے۔

ایک اور بات جو میں ادب کے ساتھ کہنا پسند کروں گا کہ بریگیڈیئر صاحب نے اپنی کتاب میں زندگی کے کم و بیش تمام رنگوں کا احاطہ کیا ہے۔ اپنی خواہشات، حسرتیں، کامیابیاں، ناکامیاں، امید اور مایوسیاں سب کچھ بلاتکلف سامنے لا رکھی ہیں، گویا اپنے جوہرِ بیاں سے خوب کام لیا ہے۔ مگر نہ جانے کیوں دو مقامات ایسے ہیں جہاں انھوں نے دانستہ یا نادانستہ اغماز برتا ہے۔ ایک تو ان کی ذاتی اور گھریلو زندگی، دوسرے میڈیکل کالج میں گزارے سات قیمتی اور جدوجہد سے بھرپور سال کا عرصہ۔

مجھے امید ہے پڑھنے والوں کو، اپنے چاہنے والوں کو وہ زندگی کے ان دونوں اہم مقامات کی بھی سیر کرائیں گے جس کے لیے ہم ان کی اگلی کتاب کا انتظار کر سکتے ہیں۔

خیر، کچھ بھی ہو، جو کچھ انھوں نے لکھ دیا وہ بھی کیا کم ہے۔ اس طرح انھوں نے خود کو اردو ادب کے سپاہیوں کی اُس خوب صورت کہکشاں کا ایک معتبر حصہ بنالیا ہے جس نے ہمارے ادبی سفر کو مالا مال کرنے میں اپنا یادگار حصہ ڈالا ہے۔

میں انھیں دل کی گہرائیوں سے اس کارنامے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

بصد اخلاص

اقبال پیرزادہ

جون ۲۰۲۲ء

تأثرات

جب مجھے بریگیڈئیر بشیر آرائیں کی کتاب ''خاک ساخاکی'' کا مسودہ پڑھنے کو ملا کہ اس پر اپنی رائے کا اظہار کروں تو مجھے وہ بشیر آرائیں یاد آ گیا جو لیاقت میڈیکل کالج جام شورو کے مہران ہاسٹل کے کمرہ نمبر چار میں رہتا تھا۔ میں اس سے دو سال جونیئر تھا۔ کالج پہنچا تو رہنے کی جگہ نہ تھی۔ کسی نے بتایا کہ مہران ہاسٹل میں یونائیٹڈ میس کے انچارج بشیر آرائیں سے ملو، وہ تمام مسائل کا حل ڈھونڈ نکالے گا۔

کوئی سو طالب علموں نے بشیر آرائیں کو چن کر اپنا میس انچارج بنایا ہوا تھا۔ وہ اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ اتنے لوگوں کی میس کے معاملات بھی دیکھتا تھا۔ تمام لوگوں سے ماہانہ پیسے اکٹھے کرنا۔ کھانے پینے کا سامان خریدنا، سب کو وقت پر کھانا ملنا، میس ممبرز کے بل بنانا اور میس کے اسٹاف کی تنخواہوں کے معاملات خوش اسلوبی سے نبھانا یہ سب اس کے دائیں کا کام تھا۔ میں نے میس میں شمولیت سے پہلے بتایا کہ میرے پاس تو رہنے کی جگہ بھی نہیں ہے۔ وہ کہنے لگا، جب تک انتظام نہیں ہوتا میرے کمرے میں رہ لو۔ یہ بہت ہی غیر معمولی پیش کش تھی جو میرے لیے حیران کن تھی۔ اس طرح کی پیش کش جونیئرز کو کوئی نہیں کرتا تھا، مگر یہ شخص بیس سال کی عمر میں بھی بڑے دل کا مالک تھا۔ پھر تو میں اس کے ساتھ ایک سال رہا۔ وہ بہت اصول پرست میس انچارج تھا۔ کوئی میس کے پیسے دینے میں دیر کرتا تو اس کا کھانا بند ہو جاتا کہ اس کا اثر دوسروں پر نہ پڑے مگر میری طرح بہت سے طالب علم اسے اپنی مالی مجبوریاں بھی بتاتے تو وہ چپکے سے ان کا کھانا کھول دیتا اور کہتا کہ کسی کو مت بتانا کہ تم نے ابھی ادائیگی نہیں کی۔ پھر آہستہ

آہستہ یہ بھی پتا چلتا گیا کہ وہ کئی لوگوں کے پردے رکھے ہوئے ہے۔

ساتھ رہنے سے انسان کی اچھائیاں، برائیاں اور کم زوریاں سب کھلتی چلی جاتی ہیں۔ میں آج اس کے بارے میں لکھنے بیٹھا ہوں تو سوائے اس کی اچھی باتوں کے کچھ یاد نہیں آ رہا۔ وہ ہماری طرح چھوٹے سے گاؤں سے ہی آیا تھا، مگر کمال کی خود اعتمادی پائی تھی۔ اپنے ارد گرد سب کے لیے ایک امید کی کرن تھا، مددگار تھا۔ دیہاتی پس منظر کے باوجود کالج کے میگزین میں ہمارا ساتھی رہا۔ انتہائی خوب صورتی سے اپنی ذمہ داری نبھاتا۔ طالب علمی میں بھی کبھی کبھار اس کی طنز و مزاح سے بھرپور تحریر پڑھنے کو مل جاتی تھی تو لطف آتا تھا۔ پھر ہمارے راستے الگ ہو گئے۔ وہ فوج میں چلا گیا اور میں سعودی عرب۔ سنتے تھے کہ فوج میں بھی اس نے خوب عزت کمائی ہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد تو زندگی کو خلقِ خدا کی خدمت کے لیے وقف کیے بیٹھا ہے۔ اب سالوں بعد ملاقات ہوئی ہے مگر اس کی محبتیں ویسی ہی دیکھنے کو ملیں۔ اسی چاہت کا احساس دلاتا ہے۔

اس کی تحریروں میں الفاظ کا ہیر پھیر نہیں ہے۔ سچ لکھنے پر اسے کمال حاصل ہے۔ پڑھنا شروع کریں تو آپ خود بھی تحریر کے کرداروں سے جڑ جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں جیسے آپ بھی اس کہانی کا حصہ ہیں اور پھر کوئی تحریر آپ مکمل پڑھے بغیر چھوڑ نہیں سکتے۔

اگرچہ کہ ''خاک سا خاکی'' میں بشیر آرائیں نے اپنے طالب علمی کے زمانے اور جام شورو کے دنوں کی یادیں شامل نہیں کیں، مگر جو کچھ لکھا ہے وہ دل کو چھوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے میں بھی اس کا چشم دید گواہ ہوں۔

خاندانی روایات کو زندہ رکھنے میں جس طرح اس نے اپنے والدین کا ذکر کیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ پڑھ کر دل چاہتا ہے کہ ہم بھی اپنے بچوں کی تربیت انھی خطوط پر کر پائیں۔ بشیر آرائیں نے جو لکھا ہے وہ نئی نسل کے لیے تو یقیناً مشعلِ راہ ہے، مگر عمومی طور پر یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی ہر تحریر کی روشنی میں خیر کے دروازے کھلنے کی امید نظر آنے لگتی ہے۔ ہم شکریہ ہی ادا کر سکتے ہیں کہ اس نے اچھی کتابوں میں ایک اور کتاب کا اضافہ کر دیا ہے۔ اللہ کرے وہ لکھتا رہے تا کہ ہماری پڑھنے کی عادت برقرار رہ سکے اور اس معاشرے میں خیر کا عمل بھی آگے بڑھتا رہے۔

ڈاکٹر عابد علی عابد

❑❑❑

شخصیت کا آئینہ

میں ایک فوجی ڈاکٹر ہوں۔ ملٹری اور مسیحائی کا یہ امتزاج بظاہر بہت رومانٹک لگتا ہے مگر اس کی ذمہ داریاں نبھانا بسا اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے میں آپ کی فیملی، ساتھی آفیسرز اور سینئرز آپ کا سہارا بنتے ہیں۔ بریگیڈیئر بشیر آرائیں کو میں پچھلی تین دہائیوں سے ایک ایسے ہی سینئر کی حیثیت سے جانتی ہوں۔ مجھ سمیت بہت سارے لوگوں کو اُن کی پُرخلوص رہنمائی ہمیشہ میسر رہی۔

تحریر لکھاری کی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے اور یہ تحریر اگر سچی آپ بیتی ہو اور اس کے بہت سارے گواہان بھی ہوں تو پھر یہ ایک بے باک اور بے لاگ آئینے سے کم خطرناک نہیں ہوتی اور بریگیڈیئر بشیر آرائیں کی تحریریں تو خود ان کا اپنا لحاظ نہیں کرتیں۔ بس جو جب ہوا، جہاں ہوا اور جیسے ہوا، وہ بغیر کسی تکلف اور رد و بدل کے صفحۂ قرطاس پہ لکھتے جاتے ہیں اور پتا اس وقت چلتا ہے، جب ایک کہانی جنم لیتی ہے۔ مدتوں کی شناسائی کی وجہ سے ان کے بہت کچھ لکھے کی میں خود گواہ بھی ہوں مگر اب ان کی تحریں پڑھیں تو ان کی زندگی اور شخصیت کے کتنے ہی نئے پہلوؤں سے بھی شناسائی ہوئی۔

اس کتاب میں شامل قصے پڑھتے پڑھتے کبھی کبھار تو شک سا ہونے لگتا ہے کہ شاید ہم بھی نواب شاہ کے اسی چھوٹے سے گاؤں گوٹھ میں ہی پیدا ہوئے تھے اور بی بی جی جیسی ماں کے ہاتھوں کے اچار، پراٹھے اور میاں جی کی کراری ڈانٹ کھا کھا کر بریگیڈیئر بشیر آرائیں کے

ساتھ ہی بڑے ہوئے ہیں۔ ان کی لکھی اَن ہونی سی باتیں بالکل اَن ہونی نہیں لگتی کیوں کہ سب آنکھوں دیکھا ہے، سب کانوں سنا ہے۔

ایک اچھا لکھاری اپنے قاری کو اپنی انگلی پکڑا کر دنیا کے سفر پر ساتھ لے جاتا ہے۔ بریگیڈیئر بشیر آرائیں اس سے بھی ایک قدم آگے ہیں۔ اُن کی اکثر تحریریں پڑھ کر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ کاغذ پر نہیں لکھتے بلکہ سب کچھ اسکرین پر دکھاتے ہیں اور جو ان کی تحریر کی محفل میں ایک بار آجائے وہ پھر بنا انگلی تھامے خود بہ خود ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ کسی کہانی کا کوئی کردار بن کر وہ سب کچھ خود بھی سہتا ہے۔ کبھی تو پڑھتے پڑھتے اندر ہی اندر آنسو گرنے لگتے ہیں۔ اندازہ تب ہوتا ہے جب ان کی نمی اپنے رخساروں پر محسوس ہوتی ہے۔

بریگیڈیئر بشیر آرائیں کی اس کتاب میں آپ بیتیاں ہوں یا جگ بیتیاں، تحریر کرتے وقت اپنی غلطیوں کا برملا اعتراف، اپنی خوبیوں کا شرماتا ہوا اظہار اور دوسروں کی خامیوں کے لیے خوب صورت اور معصوم سے جواز ڈھونڈ لانا ان کی ذات اور شخصیت کے آئینے ہیں۔ آپ ان آئینوں میں خود کو بھی دیکھ سکتے ہیں اور دوسروں کو بھی۔ یہ محض کتاب نہیں ہے بلکہ انسانی اچھائیوں، خاندانی قدروں اور سماجی ذمہ داریوں کی طویل داستان ہے جو نئ نسل کے لیے روشنی کی کرن بھی ہے۔ صفحے الٹتے جایئے، نئے طریقوں اور نئ امیدوں کے ساتھ جینا سیکھتے جایئے۔

زندگی میں بے اعتباری بڑھنے لگے، دوستی پر یقین نہ رہے تو کتاب ''خاک ساخاکی'' کے ساتھ دوستی کر کے دیکھیے۔ اس کا ایک ایک لفظ، قدم قدم پر ہنسنے، مسکرانے، سنبھلنے، معافی مانگنے اور معاف کرنے کے نت طریقے سکھائے گا۔ یہ سادہ سے قصے انتہائی معصومیت سے زندگی کے راز بتاتے اور نئے راستے دکھاتے ہیں۔ ہر صفحے پر نئے سبق ہیں، نئے تجربے اور نئ امیدیں۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

بریگیڈیئر مبشرہ ثمینہ
ملیر کینٹ کراچی

حرفِ اوّل

میرے بچپن، لڑکپن، طالبِ علمی، فوج اور سول میں گزرے دنوں کی بہت سی یادیں ایسی ہیں جو جاگتے سوتے کبھی ہنساتی ہیں اور کبھی رلاتی ہیں۔ انھیں بھلایا جا ہی نہیں سکتا کیوں کہ انھیں سوچنا، انھیں دُہرانا، انھیں سننا اور سنانا بہت اچھا لگتا ہے اور اس کے لیے بہت کچھ لکھنا ضروری ہے۔ بہت کچھ کہنا ضروری ہے۔ اِدھر اُدھر کی کچھ یادیں لکھیں تو قربت داروں نے پڑھ کر مطالبہ کر دیا کہ اور لکھو، سب لکھو۔ وہ سب باتیں لکھو جو خوش رہنے کا سبب ہیں۔ وہ سب یادیں لکھو جو آج بھی آپ کی آنکھوں سے چھلکتی ہیں۔ جو بچپن میں تپتی دھوپ میں جلاتی تھیں یا ٹھنڈی ٹھار راتوں میں جگاتی تھیں۔ ہر اس سفر کا ذکر کرو جس نے زندگی سے وفا کی یا جفا کی، لیکن میں تو یہ سوچتا رہتا ہوں کہ میرے پاس ربِ کریم کے کرم، ماں باپ کی دعاؤں اور شفیق اساتذہ کی مہربانیوں کے علاوہ ہے ہی کیا جو لکھوں۔ میری تو عام سی آپ بیتی ہے، جسے یاد کر کے کبھی خوش ہوتا ہوں، کبھی آبدیدہ۔ لکھنے لگوں تو میرے دامن میں پچھتاوے زیادہ ہیں اور کارنامے کم۔ یہ سب کچھ یا تو میری ذات سے متعلق ہے یا ان لوگوں سے جڑی کہانیاں ہیں جو میری ذات کا حصہ ہیں تو پھر دوسرے لوگ انھیں پڑھ کر کیا کریں گے، مگر دوست احباب کہتے ہیں جو کچھ ہم سن کر، جان کر خوش ہوتے ہیں اسے کتابی شکل دے دو۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ اس افراتفری اور نفسانفسی کے عالم میں مجھ جیسے عام سے خاکی کی

سوانحِ حیات پڑھنے سے کسی کو نہ تو دل چسپی ہو گی، نہ ہی اس کے لیے وقت۔ ایک بریگیڈیئر عہدے کے فوجی آفیسر کی تو بہادری کی کہانیاں ہونی چاہییں، چونکا دینے والے قصے ہونے چاہییں۔ لوگ کسی فوجی کے ملک وقوم کی تقدیر بدلنے والے قصے پڑھنا چاہتے ہیں۔ آج کل تو لوگ سوشل میڈیا پر بھی کسی تحریر کو ایک منٹ میں پڑھنے کے بعد بٹن دبا کر نیچے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تحریر آگے کتنی باقی ہے۔ مجھے اس خیال سے اپنی سوانحِ حیات لکھنے کا خیال گھاٹے کا سودا ہی لگتا ہے۔ اس سے بچنے کا ایک ہی طریقہ سمجھ میں آیا کہ جب بھی وقت ملے، کچھ نہ کچھ لکھ لیا کروں۔ بے شک اس کا کسی پچھلی تحریر سے یا بعد میں لکھے کسی واقعے سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ کوشش یہی رہی کہ ہر تحریر بے شک ایک صفحے کی ہو، قاری کو مکمل ہی لگے اور اس کے پاس اگر پوری کتاب پڑھنے کا وقت نہ بھی ہو تو میری کسی ایک تحریر کو پڑھ کر بھی اسے رَتی برابر تشنگی کا احساس نہ ہو۔

میں نے افسری کے لبادے سے آزاد رہ کر اپنا پس منظر بیان کیا۔ اپنی ماں کے بارے میں جسے ہم بی بی جی پکارتے تھے، بہت کچھ لکھا۔ ہر بات لکھنے کی کوشش کی، کیوں کہ ہماری جیسی بھی تربیت ہوئی، اس کے سارے تانے بانے انھی کی ذات سے جا ملتے ہیں اور اگر مجھ سمیت میرے بہن بھائیوں میں کوئی شخصی کمی نظر آتی ہے تو وہ خالصتاً ہماری اپنی کوتاہی اور کم زوری ہے۔ ماں باپ نے تو اپنی ذمے داری خوب ایمان داری سے نبھائی تھی۔ میاں جی کی حلال روزی کمانے والی جفاکش شخصیت اور ان کی محنت کی ساری یادیں لکھیں ہیں۔ اپنے بچپن کی مشکلیں، جدوجہد اور وہ سارے سفر کے قصے بھی لکھے جو پاؤں کے چھالوں کا سبب بنے یا پھر منزلِ مقصود پر بحفاظت لے پہنچے۔ ہر وہ واقعہ بھی لکھا جس نے بن پروں کے اڑنا سکھایا۔ میری کامیابیوں میں کس نے کتنا حصہ ڈالا، ایمان داری سے بیان کیا۔ اپنی اچھائیاں برائیاں بے ایمانیاں اور انسانوں سے محبت کے تانے بانے من وعن بیان کیے۔ اپنی تنگ دستیاں کھل کر بتائیں مگر صاحبِ حیثیت ہونے پر اگر کہیں خلقِ خدا کی مدد کو ہاتھ بڑھایا تو بہت عاجزی سے ذکر کرنے کو ترجیح دی۔

چھوٹے سے گاؤں ڈھولے والی گوٹھ، سانگھڑ روڈ نواب شاہ کے کچے پکے مکانوں،

لہلہاتے کھیتوں اور مال مویشیوں کے درمیان گلی ڈنڈا اور کبڈی کھیلتے بچپن گزار کر، روکھی سوکھی کھا کر سردی گرمی جھیلتے پیدل اسکول جاتے بچوں کے جھرمٹ سے نکل کر یونی ورسٹی سے ڈگریاں لیتے لیتے یورپ میں یونائیٹڈ نیشنز کے دفتروں میں جا بیٹھنا۔ فوج میں بریگیڈیئر رینک تک پہنچنا اور بہ حیثیت چانسلر اپنی ذاتی یونی ورسٹی کی بنیاد رکھ کر سندھ میں اپنی برادری کا سرپرستِ اعلیٰ بننے تک کا سفر خواب سا لگتا ہے، مگر اب ان خوابوں کو کھلی آنکھوں حقیقت بنتے دیکھ کر لفظوں میں ڈھال رہا ہوں اور پڑھنے والوں سے امید رکھتا ہوں کہ وہ میری ہر تحریر کو اسی پس منظر میں پڑھیں گے، کیوں کہ یہ سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ بھولی بسری اِدھر اُدھر کی یادیں ہیں جو جس دن ذہن میں آتی گئیں، لکھتا گیا اور اسی طرح اب آپ کی نذر ہیں۔

اپنی زندگی کے سفر یا اپنے بزرگوں کی جہدِ مسلسل کے بارے میں لکھتا ہوں تو خوشی ہوتی ہے۔ ایک اطمینان سا محسوس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے یہ مسلسل ترقی کا سفر تھا جیسے میرا ہر دن پچھلے دن سے بہتر ہو رہا تھا، مگر دوسری طرف فوجی زندگی کا پچھلی دو دہائیوں اور آج کا تقابلی جائزہ لینا ہو تو دل دکھتا ہے۔ فوجی زندگی میں ہماری پوری دنیا اپنی یونٹ، کھیل اور جنگی مشقوں کے میدان یا اپنی میس ہوتی تھی۔ کہیں تربیتی کیمپ لگتے تو لوگ دور کھڑے محبت سے ہاتھ ہلا کر اپنائیت کا احساس دلاتے اور ہم خاکی وردی میں اِتراتے تھے کہ ہم قوم کے لاڈلے ہیں۔ یہی وہ لاڈلے پن کا احساس تھا جو ملک و قوم پر قربان ہونے کی تحریک دیتا اور شہادت کو گلے لگانا سپاہیانہ شان تھی۔ مگر اب تو وہ محبتیں، وہ لاڈلے پن کا احساس، وہ وردی میں اِترانا سب کچھ کہیں کھو گیا ہے۔

اس کے علاوہ ایسی یادیں بھی لکھیں ہیں جن کا تعلق براہِ راست معاشرے کے تبدیل ہوتے رسم و رواج سے ہے۔ بدلتی خاندانی قدروں سے ہے۔ ملکی حالات سے ہے یا اپنے سابقہ اور موجودہ قومی رہبروں کی پاکستانی قوم سے بے وفائیوں یا زیادتیوں سے ہے۔ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوا لکھا ہے۔ سنی سنائی پر نہ یقین کرتا ہوں نہ ذکر کرتا ہوں۔ کتاب میں لکھے ایک ایک لفظ کا چشم دید گواہ ہوں۔ اگر آپ ایک حساس دل کے مالک ہیں تو اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ لفظ لفظ میں سیاہی نہیں میرا خون خرچ ہوا ہے۔ دل پر آری سی چلتی رہی ہے، لیکن پھر بھی

میں نے بہت کوشش کی کہ ایسی کسی تلخ یاد کو الفاظ کی زبان نہ دوں جو پڑھنے والے کے لیے افسردگی اور مایوسی کا سبب بن جائے۔

کوشش کی ہے کہ قاری میری تلخ یادیں پڑھ کر بھی روشن صبح کی امید لگائے رکھے۔

۲؍جون۲۰۲۲ء

بریگیڈیئر بشیر آرائیں

دفتر:25/A، بلاکE

گلشنِ جمال، نیشنل اسٹیڈیم روڈ

کراچی، پاکستان

Email:ceo@bashsonpharma.com

Cell: 03000300098

Tel: 021-34688125

سفرِحیات

سبولی فرام جاپان

۱۹۷۵ء کی بات ہے، میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان دے کر فارغ ہوا تو کچھ دن کے بعد ہی بی بی جی نے پاس بٹھا کر پوچھا کہ بیٹا تمھارا ڈاکٹری میں داخلہ کب ہوگا؟ میں نے بتایا بی بی جی ابھی تو سات آٹھ ماہ لگیں گے۔ قسمت سے اچھے نمبر آ گئے تو میڈیکل کالج میں داخلہ ہوگا ورنہ کوئی کام کرلوں گا۔ بی بی جی کہنے لگیں، بیٹا فارغ ہو، ابھی سے کوئی کام کرلو۔ کچھ پیسے ہی کما لو گے۔ داخلہ ہوگیا تو چھوڑ کر ڈاکٹری پڑھنے چلے جانا تب یہ کمائے ہوئے پیسے تمھارے کام آئیں گے۔ میری عمر اٹھارہ سال تھی اور بڑوں کو صرف کھیتی باڑی کرتے ہی دیکھا تھا۔ پورے خاندان میں کاروبار یا نوکری کوئی نہیں کرتا تھا۔

میں گاؤں سے روزانہ نواب شاہ شہر جاتا۔ اِدھر اُدھر گھومتا۔ دکان داروں سے کام پوچھتا اور آخر میں گول چکرہ بازار کی لائبریری میں جا کر کوئی کتاب یا اخبار پڑھتا رہتا۔ ایک دن ایک اشتہار دیکھا کہ کراچی کی ایک مینڈوزا نامی کمپنی کو اپنی زنانہ کاسمیٹکس سبولی فرام جاپان کے لیے اچھی ساکھ کے ڈسٹری بیوٹرز کی ضرورت ہے۔ میں نے بی بی جی سے بات کی۔ کہنے لگیں کہ یہ کیا کام ہے، تم نے سمجھا بھی ہے کہ نہیں۔ میں نے کچھ رقم کا تقاضا کیا تو کہنے لگیں، بیٹا میرے پاس پورے سال کی بچت اور جمع پونجی صرف ۱۲۰۰ روپے ہیں۔ اس میں تم کو یہ کام کیسے ملے گا؟ میں نے کہا، بی بی جی کوشش کرنے میں کیا حرج ہے تو انھوں نے ٹرنک کا تالا کھول کر پیسے مجھے تھما دیے۔

میں ایک صبح نواب شاہ سے ٹرین میں بیٹھا اور پاکستان چوک کراچی، چاس اے مینڈوزا کے دفتر پہنچ گیا۔ کمپنی کے منیجر سے ملنے میں دو گھنٹے لگے مگر دومنٹ میں جواب ملا کہ جاؤ کوئی اور کام ڈھونڈو۔ ہم صرف کسی کمپنی کو ہی ڈسٹری بیوشن دیتے ہیں۔ میں پھر آ کر استقبالیہ میں بیٹھ گیا۔ مجھے دو چار دفعہ کہا گیا کہ جاؤ چلے جاؤ یہاں سے مگر میں بضد رہا کہ مجھے کمپنی کے مالک سے ملنا ہے۔ لنچ کے بعد ایک ادھیڑ عمر شخص باہر جانے کو استقبالیہ پر آئے تو اسے بتایا گیا کہ میں پچھلے چار گھنٹوں سے ان سے ملنے کو یہاں بیٹھا ہوں۔ اس شخص نے حیرت سے مجھ سے آنے کی وجہ پوچھی تو میں نے کہا کہ نواب شاہ شہر کے لیے سبولی فرام جاپان کی ڈسٹری بیوشن چاہیے۔ وہ زور سے ہنسے اور پوچھا کتنا سرمایہ ہے تمھارے پاس؟ میں نے کہا ۱۲۰۰ روپے۔ وہ واپس اپنے آفس کی طرف مڑے اور مجھے کہا آؤ میرے ساتھ۔ مجھے سمجھانے لگے کہ بیٹا اس کاروبار کے لیے ہم کم از کم دس ہزار سکیورٹی رکھتے ہیں۔ تم ان پیسوں سے کچھ اور کام کرلو۔ میں نے کہا، نواب شاہ سے آپ کے پاس میں پہلے آیا ہوں۔ آپ مجھے کیش پر صرف ۱۲۰۰/روپے کا ہی سامان دے دیں۔ سکیورٹی کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

وہ لاجواب ہوگئے۔ گھنٹی بجائی۔ منیجر کو بلوایا اور کہا کہ نواب شاہ کے لیے یہ بچہ جو مانگتا ہے اسے کیش پر دے دو اور کمپنی کا منافع بھی چھوڑ دو۔ کچھ دیر بعد میں سبولی فرام جاپان کی کاسمیٹکس لے کر چھلانگیں مارتا نواب شاہ جانے کے لیے شام کی ٹرین میں جا بیٹھا۔

میں صبح سویرے اپنے گاؤں ڈھولے والی گوٹھ پہنچا جو اس وقت شہر سے چار کلومیٹر دور ہوتا تھا اور ہم اکثر یہ سفر ہنستے کھیلتے پیدل ہی کیا کرتے تھے۔ ان دنوں وہاں نہ بجلی ہوتی تھی نہ کوئی اور سہولت، اس لیے میاں جی نے میرے چھٹی کلاس میں جانے پر شہر میں فوراً ہی ایک کمرے کا مکان کرایے پر لے دیا تھا تاکہ پڑھائی میں آسانی ہو جائے۔ گھر پہنچنے پر بی بی جی نے مجھے سامان کے ساتھ دیکھ کر ڈھیروں دعائیں دیں کہ اب میں بھی فارغ نہیں بیٹھوں گا کیوں کہ دونوں بڑے بھائی تو چھٹیوں میں کھیتی باڑی میں میاں جی کا ہاتھ بٹاتے رہتے تھے۔

دوسرے دن میں نواب شاہ کی مشہور لیاقت مارکیٹ گیا اور سبولی فرام جاپان کا فیس پاؤڈر، لپ اسٹک اور نیل پالش دکانوں پر دکھائی۔ میں حیران رہ گیا کہ ہر دکان دار پورا اسٹاک ہی

لینا چاہتا تھا کیوں کہ خواتین جاپان کی چیزیں بہت پسند کرتی تھیں اور یہ پروڈکٹس پہلی دفعہ نواب شاہ آئی تھیں۔ میں نے اگلے تین دن میں سب کچھ نقد پر بیچ ڈالا۔اب میری جیب میں ۱۶۰۰/روپے تھے اور میں یہ لے کر کراچی بھاگا اور دوبارہ سامان خرید لایا۔ میں نے منیر پرنٹنگ پریس گول چکرہ بازار سے تمام پروڈکٹس کے نام والے پمفلٹ چھپوا کر نواب شاہ گرلز ڈگری کالج کے گیٹ کے چوکی دار کو کچھ اجرت دے کر آنے جانے والی اسٹوڈنٹس میں تقسیم کروا دیے۔

پھر جب میں بیس دن میں چوتھی مرتبہ سامان لینے کمپنی میں گیا تو کمپنی کے مالک نے مجھے تین ہزار نقد کے بدلے دس ہزار کا سامان دے دیا اور کہا کہ پہلے ہم آپ سے نفع نہیں لیتے تھے مگر اب کمپنی کا منافع بھی شامل ہوگا، اس لیے قیمت میں تھوڑا سا فرق آئے گا۔ کہنے لگے، میاں ایک بات پلے باندھ لو کہ بے شک منافع ایک آنا ملے، سودا نقد بیچنا۔ میں اب کی بار چالیس کلو میٹر دور سانگھڑ پہنچ گیا۔ پھر دن گزرتے گئے اور میں دن رات بھاگتا رہا۔ بی بی جی کے پاس پیسے رکھواتا تو ان کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی۔ میں نے دوسرے ماہ بی بی جی کے پیسے واپس کر دیے۔ مجھے یہ کام کرتے پانچ ماہ گزرے تو انٹرمیڈیٹ کا رزلٹ آ گیا۔ نواب شاہ ضلع کی میڈیکل کالج میں پچاس سیٹیں مختص تھیں اور میرا میرٹ نمبر اٹھارہ بن رہا تھا میں نے ساری صورتِ حال میاں جی اور بی بی جی کو بتائی تو انھوں نے کہا، بیٹا تمھیں ڈاکٹر بننا ہے اس لیے جو کام کر رہے ہو، اسے سمیٹنا شروع کر دو۔ میں اب تک اپنے میڈیکل کالج میں داخلے اور ہاسٹل کے لیے بہت سارے پیسے کما چکا تھا۔

کراچی کمپنی گیا اور مالک سے ملنے کی درخواست کی۔ ملنے پر ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ فروری ۱۹۷۶ء سے نواب شاہ کے لیے آپ اپنی پروڈکٹس کسی کو بھی دے سکتے ہیں کیوں کہ میں میڈیکل کالج میں داخلہ لے رہا ہوں۔ مجھے آج بھی کمپنی کے مالک کی شفقت یاد ہے۔ سمجھاتے رہے کہ بیٹا تم نے پچھلے پانچ ماہ میں جو محنت کی ہے، میں اس سے بہت متاثر ہوں۔ چھوڑو ڈاکٹری کو۔ میں تمھیں سندھ کے شہروں کے لیے کریڈٹ پر سب کچھ دینے کو تیار ہوں، تم کمپنی کے لیے کام کرو۔ مجھے پیسے کمانا اچھا لگنے لگا تھا مگر بی بی جی اور میاں جی کی نصیحت کہ ڈاکٹر بننا ہے پر عمل کرتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کرتا رہا اور معذرت کرتا رہا کہ میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ مجھے

اس شخص کا اب نہ چہرہ یاد ہے نہ نام مگر اس نے جس طرح مجھے گلے لگا کر رخصت کیا، وہ یاد ہے۔

پھر میں میڈیکل کالج چلا گیا۔ میاں جی سے پانچ سال تک صرف تین سو روپے ماہانہ لے کر باقی بی بی جی کے پاس اپنی کمائی ہوئی جمع پونجی سے لے لے کر مزے سے تعلیم مکمل کی۔ ڈاکٹر بن گیا۔ فوج جوائن کر لی۔ فوج نے تین دفعہ حج پر بھیجا۔ تین دفعہ یونائیٹڈ نیشن مشن پر بھیجا۔ بریگیڈیئر بن کر ریٹائر ہوا۔ آج بھی اللہ کے سامنے عاجزی سے کھڑا ہو کر کہہ سکتا ہوں کہ حلال کے سوا کبھی ایک پیسا بھی گھر نہیں لایا۔ یہ سب اپنی تیسری پیڑھی کے بچوں کے لیے بتا رہا ہوں کہ انسان حرام کی کمائی سے امیر نہیں ہوتا، اللہ دیتا ہے تو گھر بھر جاتا ہے۔

ریٹائر ہوا تو میڈیکل سپلائیز کا کاروبار شروع کر دیا۔ سمجھ ہی نہیں آتا کہ اللہ مجھے میری اوقات سے زیادہ کس لیے دیتا ہے۔ زیادہ ملنے لگا تو خلقِ خدا کے بھلے کے کام شروع کر دیے اور اب تو چھپر پھاڑ کر ملتا ہے۔ سب کچھ بھول بھی جاؤں تو دو باتیں کسی طرح نہیں بھول پاتا۔

پہلا بی بی جی کے جمع کیے ہوئے وہ ۱۲۰۰/ روپے جو انھوں نے مجھے زندگی کے پہلے کاروبار کے لیے دیے تھے۔ جب سے کمانا شروع کیا ہے، بی بی جی کے نام سے کچھ رقم ہر مہینے کسی ضرورت مند کو دے دیتا ہوں اور کہتا ہوں کہ جاؤ کچھ اپنا کام شروع کر لو اور بی بی جی کے لیے دعا کر دیا کرو۔

دوسرا سبولی فرام جاپان کمپنی کے اس مالک کی میرے لیے شفقت جو مجھ ناچیز کے لیے اس نے اس وقت کی تھی جب میں اٹھارہ سال کا تھا۔ اب کوئی نوجوان بچہ میرے آفس آ کر کہے کہ وہ میڈیسن سپلائیز کا کام کرنا چاہتا ہے تو میں اس سے کمپنی کے حصے کا منافع کبھی نہیں لیتا تاکہ وہ اپنی روزی آسانی سے کمانے لگے۔

آج بھی اپنی جنتی بی بی جی کی دور اندیشی پر رشک کرتا ہوں کہ کیسے وہ کام کرنے اور علم حاصل کرنے کی اہمیت کا درس دیتی رہیں اور ہمیں ایک بنا بجلی کے گاؤں سے اٹھا کر ائیر کنڈیشنڈ دفتروں میں بٹھا گئیں۔ روز دعا کرتا ہوں کہ کاش میری قوم کی سب بیٹیاں میری بی بی جی جیسی مائیں بن جائیں۔

مائیں نی میں کینوں آکھاں
درد وچھوڑے دا حال نی

علی بھائی نے نواب شاہ والا گھر بنوانا شروع کیا تو بی بی جی کہنے لگیں، پتر میناں گھر کا برآمدہ بڑا سا بنوا دو تا کہ عید شب برات پر میں اپنے سبھی بچوں، نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں کے ساتھ ایک جگہ بیٹھ سکوں۔ ان سے باتیں کرسکوں۔ ہم نے ایسا ہی کر دیا۔ پورے ہال جیسا برآمدہ بنوا دیا۔ پھر کیا تھا، سب کو اکٹھا دیکھ کر بی بی جی کی خوشی دیدنی ہوتی تھی۔ میں نے میاں جی کا حقہ پینا بڑی مشکل سے چھڑوایا تھا مگر نواسے اور پوتے ان کو ہم سب سے چوری چوری سگریٹ لا دیتے تھے اور ان کے لاڈلے بنے پھرتے تھے۔

بی بی جی اور میاں جی کی خواہش کے مطابق سب پر یہ لازم تھا کہ عید نواب شاہ کیا کریں۔ اسّی سال کی عمر میں بھی میاں جی کو قربانی کے جانور کے گلے پر چھری خود چلانی ہوتی تھی۔ شکر تھا کہ اب گوشت بنانا چھوڑ گئے تھے ورنہ تو عیدالضحیٰ کا سارا دن اسی کام میں گزارتے تھے۔ میری ہمیشہ کوشش رہی کہ عید نواب شاہ ہی میں کروں مگر سینئر رینک میں فوجی نوکری کے تقاضے آڑے آنے لگے لیکن جب بھی بچوں کے ساتھ نواب شاہ پہنچتا، بی بی جی سے میرے ساتھ ساتھ ساری فوج کے جوانوں کو بھی دعائیں ملتی تھیں۔ گھر میں ہر طرف فوجی پتر آنے پر ماں کی آواز گونجنے لگتی تھی۔

پھر ایک دن بی بی جی سدھار گئیں، دفنا دیا۔ قبرستان میں علی بھائی گلے لگ کر خوب روتے رہے اور ان کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ یار نواب شاہ آنا نہ چھوڑنا۔ ماں کی دعاؤں کے بغیر زندگی شروع ہوگئی ہے تو مل جل کر گزاریں گے۔ اکیلے اکیلے اپنے اپنے گھروں میں مشکل گزرے گی۔ میاں جی کو تو جیسے چپ ہی لگ گئی تھی۔ اب تو نواسے پوتے چوری چوری سگریٹ لا کر دیتے تو پکڑ کر ایک طرف رکھ دیتے تھے کہ دل نئیں کردا پینے کو۔

بی بی جی کی پہلی برسی تھی۔ دن تو ۳۶۵ ہی گزرے تھے مگر لگتا تھا ۳۶۵ صدیاں ہوگئیں

ماں کو دیکھے۔ رات کو نواب شاہ پہنچے تو ساری کائنات ہی بدلی ہوئی تھی۔

کہیں سے کوئی آواز نہ آئی۔

ست بسم اللہ نی کڑیو میرا فوجی پتر آیا جے۔ عشا کی نماز پر کہیں سے کسی کونے سے فوجیوں کی سلامتی کی دعائیں سنائی نہ دیں۔

رات کو سونے سے پہلے کسی نے ٹھنڈی میٹھی کھیر کھانے کی ضد بھی نہ کی۔

صبح سویرے کسی نے سر پر ہاتھ پھیر کر نیم بلوئی لسی کا گلاس بھی نہ دیا۔ ناشتے پر دہی ملائی اور ڈھیروں بلوں والے مکھن کے پراٹھے کہیں نظر نہ آئے۔

کلیجا منہ کو آرہا تھا کہ ہائے نی ماں ہر لمحے ہر گھڑی تیری کمی محسوس ہوتی ہے۔ تیرے ہاتھوں بنی کھیر، اس نیم بلوئی لسی اور ان پراٹھوں کے ناشتے نہ ملنے کی تو خیر تھی پر دل تھا کہ ماں کسی کھڑکی سے جھانکے۔ کسی کمرے سے آواز دے یا کسی دروازے سے باہر آئے اور سر پر ہاتھ رکھ کر اس فوجی کو دعا تو دے دے کہ جیتا رہ پتر تینوں تتی ہوا نہ لگے۔

کیسے بتاؤں کہ ماں اب تو تتی ہوائیں تیری دعاؤں کے بغیر جلا کے راکھ کر دیتی ہیں۔ اندر سے بھی باہر سے بھی۔ بس بھلا ہوا ن نظر کے چشموں کا جو چھلکتی آنکھوں کا پردہ رکھتے ہیں۔

اپنی بے بسی کے ستمبر ۲۰۰۴ء کے وہ سترہ دن کیسے بھولوں۔ پورا خاندان سی ایم ایچ ملیر کے آئی ٹی سی وارڈ کی طرف دیکھ رہا تھا کہ کوئی نرس بھاگتی ہوئی آئے گی کہ بی بی جی نے آنکھیں کھول دیں۔ میں خود ایڈمن آفیسر، ہاسپٹل کے تمام اختیارات اپنے پاس۔ کمانڈنٹ اور ڈپٹی کمانڈنٹ کی ماں کے لیے مہربانیاں۔ سی ایم ایچ کے ڈاکٹروں کی پوری ٹیم کی کوششیں۔ باوردی نرسوں کی محنتیں اور محبتیں، وینٹی لیٹر کے سہارے اور تیرے دو نسلوں کے بے بس بچوں کی سسکیاں تیری آنکھیں نہ کھلوا سکیں۔

ہائے ماں میں نالائق تیری دعاؤں سے کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور اب تیری خدمت کرنے کو فرصت ملی ہے تو تُو چپ چاپ ہمیں لاوارث چھوڑ کر جنت کی وادیوں میں جا کے بیٹھ گئی۔

اپنے رب سے اب تیری سکھائی اور سنی ہوئی دعائیں تیرے لیے مانگتا رہتا ہوں کہ ربا میری بی بی جی کو بھی تتی ہوا نہ لگے۔

اب تو خوشی ہو، غم ہو یا تیری قبر پر کھڑے ہو کر دعائیں مانگنی ہوں، بے بسی عروج پر ہوتی ہے۔ دل سے بے اختیار اک ہوک سی نکلتی رہتی ہے:

مائیں نی میں کینوں آ کھاں
درد وچھوڑے دا حال نی

ایک تھپڑ

میری تربیت میں بہت چھوٹی عمر کے کئی واقعات ایسے ہیں جن کا اثر آج بھی اتنا گہرا ہے کہ اردگرد بے تحاشا سیاسی افراتفری اور گالم گلوچ کے ماحول میں بھی چپ سادھے بیٹھا رہتا ہوں۔ بہت سوچ بچار اور تحقیق کے بعد بھی کسی موضوع پر کچھ لکھ دوں یا کسی گفتگو میں حصہ دار بن جاؤں تب بھی ڈر لگا رہتا ہے کہ کوئی گالی نہ سننی پڑ جائے، کوئی غدار نہ کہہ دے۔ داغ دار نہ کہہ دے۔ شخصی محبتوں نے ہمیں عقلی بینائی سے مکمل عاری کر دیا ہے۔ ہر مجنوں کو لیلیٰ گوری چٹی نظر آنے لگی ہے۔ آپ لیلیٰ کو صرف سانولی کہہ دیں، آپ واجب القتل ٹھہریں گے۔ محبتوں اور ذاتی پسندیدگی نے عام انسان کو سود و زیاں سے اتنا بے فکر کر دیا ہے کہ وہ اپنوں کے گناہوں پر بات کرنے کو تیار نہیں، لیکن دوسروں کی چھوٹی سی اختلافی بات پر بھی گالم گلوچ، غدار اور چور چور کا شور مچانے لگتا ہے۔ اس گھٹن کے ماحول میں جینا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ جن لوگوں کو دیکھ کر اور سن کر ہمیں روشن مستقبل کا تعین کرنا تھا وہی جھوٹ اور بے ایمانی سے ہمیں بھٹکانے پر لگے ہوئے ہیں۔ حرام کی کمائی پر اتراتے ہیں اور طاقت کے بل بوتے پر اسے حلال ثابت کرتے ہیں۔

میں اردو پرائمری مین اسکول نواب شاہ میں پانچویں کلاس تک پڑھا۔ ڈھولے والی گوٹھ سے ہم سب ٹولیوں میں پیدل اسکول آتے جاتے تھے۔ ایک ہی گاؤں میں رہتے ہوئے بچپن میں آپس میں گہری دوستیاں بھی تھیں۔ تکرار بھی ہوتی تھی۔ لڑائیاں بھی ہوتیں، مگر

نفرتیں اور دشمنیاں نہیں تھیں۔ ایک دفعہ ہم پانچ سات لڑکوں کی آپس میں لڑائی ہوگئی اور کسی کے سر میں تختی لگنے سے خون بھی نکل آیا۔ ایک لڑکے کو گالی دیتے ہوئے بھی سنا گیا۔ یہ بات ہمارے گاؤں پہنچنے سے پہلے ہی ہمارے گھروں تک پہنچ چکی تھی۔

ہم دونوں ٹولے نہر سے اتر کر اپنے گاؤں کی کچی سڑک پر الگ الگ چل رہے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ گاؤں سے باہر ہی ہم سب کی مائیں ایک درخت کے نیچے بیٹھی نظر آئیں۔ بی بی جی مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ سب سے پہلا حکم یہ تھا کہ جس لڑکے نے گالی دی ہے، وہ الگ ہو جائے۔ جس نے تختی ماری ہے، وہ بھی الگ ہو جائے۔ دونوں لڑکوں کو ان کی ماؤں نے کہا کہ یہ تربیت کی ہے ہم نے تمھاری کہ تم بڑے ہو کر گالی دو گے اور کسی کو زخمی کرو گے۔

پھر ساری ماؤں نے مشترکہ فیصلہ کیا کہ جب تک تم سب کی لڑائی ہے، گاؤں میں آنے کی اجازت نہیں ہے اور ان دونوں لڑکوں کو ان کی ماؤں کے دو دو تھپڑ بھی لگے۔ بی بی جی کو نہ جانے کیا سوجھی کہ انھوں نے اٹھ کر مجھے بھی بغیر کسی قصور کے تھپڑ دے مارا اور کہنے لگیں کہ تم اس لڑائی کو کیوں نہ روک سکے، اس طرح تو گاؤں میں دوریاں جنم لیں گی۔ سب مائیں یہ کہہ کر چلی گئیں کہ جب تک تم سب کی لڑائی ہے گھر مت آنا۔ ہم سب گھنٹوں درختوں کے نیچے پیاسے بیٹھے رہے۔ آہستہ آہستہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنا شروع کیا اور پھر اندھیرا ہونے سے پہلے خود ہی اٹھ کر ایک دوسرے کے گلے لگے تا کہ اپنے اپنے گھر جا کر بتا سکیں کہ ''لڑائی لڑائی معاف کرو اللہ کا گھر (اپنا اپنا دل) صاف کرو'' ہو گیا ہے۔

اس کے بعد جب بھی اسکول یا گراؤنڈ میں کہیں کسی کی لڑائی ہو جاتی تو میں اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر اِدھر اُدھر شور مچاتا پھرتا کہ بھائی نہ تختی مارنا، نہ گالی دینا اور لڑتے ہوئے لڑکے فوراً ہنسنے لگتے کہ اوئے تجھے اپنی بی بی جی کے تھپڑ سے اتنا ڈر لگتا ہے۔

جلسے جلوسوں، سوشل میڈیا، کالجوں، اسکولوں، بازاروں، شاپنگ سینٹرز اور سڑکوں پر اب چھوٹے بڑے بچوں اور مردوں عورتوں کو ایک دوسرے کو چور چور غدار غدار کہتے سنتا ہوں یا جھگڑا کرتے دیکھتا ہوں تو دل چاہتا ہے بی بی جی جیسی کوئی ماں آ کر ان کے منہ پر ایک زناٹے

دار تھپڑ مار جائے تا کہ نہ تو یہ ایک دوسرے کو گالی دیں، نہ جھگڑا کریں اور ملک وقوم کی شام ہونے سے پہلے ہی آپس میں نظریں ملا کر صلح کر لیں اور اپنے اپنے گھر خوشی خوشی پہنچ جائیں۔

بی بی جی کی دوراندیشی دیکھیں کہ ان کے ایک تھپڑ نے مجھے ساری زندگی بچپن سے اب تک کوئی گالی دینے یا کسی سے جھگڑا کرنے سے بچائے رکھا۔ کبھی غصے میں بھی کچھ کہنے لگوں تو بی بی جی کا گھور کے دیکھنا اور وہ پہلا اور آخری تھپڑ یاد آ جاتا ہے۔

کچے مکان سے عسکری کالونی تک

۲۰۱۸ء میں ہمارا مکان مکمل ہو گیا۔ کیا بتاؤں ایک ایک چیز، ایک ایک کھڑکی، در و دیوار، ایک ایک لائٹ بچوں کی اور بیوی کی پسند سے لایا۔ اپنی دانست میں ہر چیز کی خوب صورتی کا خیال رکھا اور گھر میں شفٹ ہو گئے۔

پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو تیس سال اپنی بیوی کو کرائے کے مکان میں رکھا اور ہر دو سے تین سال کے بعد مکان بدلنا پڑتا تھا کہ یا تو پوسٹنگ کے جھمیلے یا پھر مالکانِ مکان کو نئے کرایہ دار رکھنے سے زیادہ فائدہ ہوتا تھا۔ میں فوج میں تھا اور بیگم مجبوراً ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ سندھ میں نوکری کرتی رہی کیوں کہ اگر ہم دونوں نوکری نہیں کرتے تو ہمارے دو گھر نہیں چل سکتے تھے۔ ایک اپنا اور دوسرا بیوہ بھابھی مع پانچ بچوں کا۔ اللہ تعالیٰ نے دو تنخواہوں میں ایسی برکتیں شامل کر دی تھیں کہ کبھی مشکل پیش نہ آئی۔ گھر بنانے کی فکر کبھی نہیں تھی کہ فوج کا ایسا نظام ہے کہ گھر تو بن ہی جاتا ہے اور آج اللہ تعالیٰ نے ضرورتوں سے بڑے گھر کا مالک بنا دیا ہے۔

بی بی جی کو بہت گلا رہتا تھا کہ لوگوں کے گھروں میں سونے کے کمرے، ڈرائنگ روم، باتھ روم اور کچن وغیرہ یعنی ہر چیز کا اہتمام ہوتا ہے مگر نماز پڑھنی ہو تو ہاتھ میں جائے نماز لیے اِدھر اُدھر جگہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ وہ اکثر کہتیں کہ پتر تو جب بھی گھر بنائے ہمارے لیے نماز کی جگہ بھی ضرور بنانا۔ میں نے گھر میں اپنے بیڈ روم کے ساتھ والے کمرے کو بی بی جی اور میاں جی کے کمرے کا نام دے دیا ہے اور یہ کمرہ صرف عبادت کے لیے مختص ہے۔ آپ یقین کیجیے کہ

اس کمرے کی وجہ سے کاہلی میں بھی نماز پڑھنے کا خیال رہتا ہے۔ اب یہ کمرہ ہماری نواسی کی بھی پسندیدہ جگہ ہے کیوں کہ وہ نانی کو نماز پڑھتے دیکھتی ہے تو اردگرد ایک چھوٹا سا جائے نماز لیے پھرتی رہتی ہے یا اسے بچھا کر اسی طرح سجدہ اور رکوع کو کھیل کی طرح ادا کرتی رہتی ہے۔

اصل بات تو یہ ہے کہ ماں باپ نہیں ہیں تو یہ خوب صورت گھر سونا سونا لگتا ہے۔ مجھے یاد ہے، ڈھولے والی گوٹھ میں ہمارا دو کمروں کا کچا مکان ہوتا تھا۔ بہت بڑا صحن تھا جس میں شام کو پانی کا چھڑکاؤ ہوتا اور سونے کے لیے چارپائیاں بچھتی تھیں۔ صحن کے ایک کونے میں ایک ہی باتھ روم تھا۔ سردیاں ہوتیں تو ہم سارے بہن بھائی ایک ہی کمرے میں سوتے۔ پھر جہاں جگہ بچتی بی بی جی لیٹی ہوتی تھیں۔ میاں جی بڑے بھائیوں کے ساتھ ہوتے۔

کچی اینٹوں سے بنے اس مکان کی دیواریں مٹی اور بھوسے کے گارے سے لیپی جاتی تھیں اور بی بی جی کے ہاتھوں کی انگلیوں میں نقش و نگار کا جادو کسی آرٹسٹ کے فن سے بھی زیادہ تھا۔ میرے اس عسکری کے گھر کی دیواریں اتنی خوب صورت کبھی بھی نہیں ہوسکتیں جتنی وہ کچی دیواریں خوب صورت لگتی تھیں۔ آج گھر کی دیواروں پر وال پیپر لگنے کے بعد بھی ماں کی انگلیوں کے نشان والی دیواریں نظروں میں گھومتی رہتی ہیں۔ میں اپنی بیوی کو لے کر دو دفعہ اپنے گاؤں گیا تاکہ وہ کچا مکان جس میں میرا بچپن گزرا تھا دکھاؤں مگر وہاں سب کچھ بدل چکا ہے۔ ہمارا وہ گھر مل جاتا تو میں اس میں والدین کے نام سے کوئی کارِخیر کا کام شروع کر دیتا۔

اب ان دونوں کی یادوں میں صرف وہ نہر اور شیشم کے لمبے گھنے درخت باقی ہیں۔ جہاں بی بی جی کو گرمی لگتی تو ہم نہر کے کنارے پانی کے چھڑکاؤ کے بعد انھی شیشم کے درختوں کے نیچے دوپہر کو چارپائیاں ڈالتے تھے۔ بڑا خاندان ہونے کی وجہ سے ماں کو آرام کا وقت کم ملتا تھا مگر جب بھی وہ چارپائی پر لیٹتیں ہم ہاتھ والے پنکھے سے ہوا جھلتے تاکہ وہ سو جائیں۔ ہمیں خوب دعائیں ملتیں اور ہم بچوں میں مقابلہ ہوتا کہ ماں کس سے زیادہ خوش ہوتی ہے۔

اب اس بڑے سے گھر میں والدین کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔ حسرت ہے کہ وہ آج ہوتے، ہاتھ کے پنکھوں کی جگہ اے سی میں بیٹھے ہوتے اور ماں کو دکھا سکتا کہ بی بی جی دیکھ تیرے لیے نماز پڑھنے کا کتنا بڑا کمرہ رکھ چھوڑا ہے اور ٹھنڈا بھی اتنا ہے کہ اب پنکھا جھلنے

کی ضرورت ہی نہیں۔

اب تو یہ سب یاد آتا ہے تو نواب شاہ جا کر بی بی جی اور میاں جی کی قبر کے ساتھ والے درخت کی ٹہنی توڑ کر پنکھے کی طرح جھلتا ہوں کہ شاید وہ خوش ہو کر پھر ایسی کوئی دعا دے دیں جس نے مجھ ناچیز کو اتنا چوکھا رنگ رکھا ہے۔

میری شریکِ حیات

دسمبر ۱۹۸۳ء میں ہاؤس جاب ختم ہوئی تو فوج میں کمیشن مل گیا اور ایبٹ آباد سے ابتدائی فوجی ٹریننگ کے بعد نومبر ۱۹۸۴ء میں چترال اسکاؤٹس میں پوسٹنگ ہونے پر دروش قلعے میں جا کر ڈیرے ڈالے۔ کمانڈنٹ چترال اسکاؤٹس کرنل مراد خان نیر نے لوگوں کی خدمت کی ایسی لت لگا دی کہ پہاڑوں کے بیچوں بیچ گاؤں گاؤں جا کر بیماروں کا علاج کرتے تین سال پلک جھپکتے گزر گئے۔ دوسری پوسٹنگ ایس ایس جی کے ساتھ سندھ بلکہ اپنے شہر نواب شاہ میں ہوئی مگر یہ پوسٹنگ انٹرنل سکیورٹی کے زمرے میں ہوئی اور ڈاکوؤں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے یہ دو سال بھی یوں ہی گزر گئے۔ ۱۹۸۹ء کے اواخر میں دوبارہ چترال چلا گیا مگر اس دفعہ میاں جی سے وارننگ مل گئی کہ نوکری بہت کر لی۔ اب ایک سال کے اندر اندر تمھاری شادی ہونی چاہیے۔ خود کہیں چاہتے ہو تو بتا دو ورنہ ہم بتا دیں گے کہ تمھاری شادی کہاں کر رہے ہیں۔

دھمکی کارگر تھی اور میں نے چپکے سے بی بی جی کو بتایا کہ نواب شاہ میں خاندان سے باہر کی ایک ڈاکٹر لڑکی ہے۔ اگر میاں جی ذات پات کے پھڈے نہ ڈالیں تو میں راضی ہوں، اس لڑکی سے میری شادی کروا دیں۔ بی بی جی کو کیا چاہیے تھا، خوش ہو کر کہنے لگیں کہ اگر لڑکی تمھیں پسند ہے اور اسے بھی یہ رشتہ قبول ہے تو چلو اس کی ماں سے میری بات کرواؤ۔ میں نے آہستہ سے کہا بی بی جی، اس کی ماں تو جب وہ تین سال کی تھی، فوت ہو گئی تھی۔ بی بی جی بہت آبدیدہ ہوئیں اور کہا، اس کے والد سے تو تمھارے میاں جی ہی بات کریں گے۔ میں نے پھر کہا اس کے والد صاحب کو فوت ہوئے بھی آٹھ سال ہو چکے ہیں اور وہ اپنے بڑے بھائی کے

ساتھ کراچی میں رہتی ہے۔ بی بی جی نے ممتا کے پورے جوش سے میرا ماتھا چوما اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگیں، پتر دل چھوٹا نہ کر، تیرے میاں جی کو منانا میرا کام ہے اور ہم اس کے ماں باپ بن کر اسے اپنی بیٹیوں کی طرح رکھیں گے، بس اللہ کے کرم سے یہ رشتہ ہو جائے۔

میاں جی نے سنا تو پہلا سوال تھا کہ کیا آرائیوں کی بیٹیاں مُک گئی ہیں جو کسی دوسری برادری میں لڑکی ڈھونڈی ہے۔ میں چپ ہی رہا اور چھٹی ختم ہونے پر واپس چترال چلا گیا۔ پھر نہ جانے گھر میں کیا مذاکرات ہوتے رہے کہ بہن بھائیوں اور بی بی جی نے میاں جی کو اپنی ذات برادری سے باہر میری شادی پر راضی کر لیا۔

اللہ کا کرم ہوا کہ سب کچھ چٹ پٹ ہی طے ہو گیا اور ۳۱ ر جنوری ۱۹۹۰ء کو گریجویشن کے سات سال بعد میری شادی ہو گئی۔ شادی کے پہلے دن ناشتے پر بی بی جی کی کہی باتیں آج بھی یاد ہیں۔ پتر تیری ووہٹی کا ماں باپ نہیں ہے۔ کسی لڑکی کا میکہ تو ماں باپ سے ہی ہوتا ہے۔ تو کان کھول کے سن لے۔ آج سے میں تیری بی بی کم اور تیری ووہٹی کی ماں زیادہ ہوں۔ اگر اسے کبھی تکلیف پہنچائی تو سمجھ لے تو میرا دل دکھائے گا اور اگر تو چاہتا ہے کہ آنے والے کل میں تیری بیٹی بھی خوشیوں میں زندگی گزارے تو میری اس بیٹی کو ہمیشہ سکھی اور خوش رکھنا۔ بی بی جی جب تک زندہ رہیں، میری کم اور میری بیوی کی ماں زیادہ بنی رہیں۔ ہمارے گھر میں کہیں ساس بہو کا رشتہ نظر ہی نہ آیا۔ میں فوج میں تھا اور بیوی بچے پیچھے بی بی جی کے ساتھ گھر میں۔ اس کا فائدہ بہت ہوا کہ آہستہ آہستہ بی بی جی کی توکل، تحملِ شکر گزاری اور دور اندیشی جیسی خوبیاں میری بیوی کی شخصیت میں منتقل ہوتی رہیں اور طلعت نے بھی میاں جی اور بی بی جی کی بیٹی بن کر ہر حق ادا کیا۔ اس نے بیوی، بیٹی، بہو، بھابھی اور پھر ماں کے رشتوں کو اتنی خوب صورتی سے نبھایا کہ میرا پورا کنبہ اس کا گرویدہ ہو گیا اور اب بھی ہے۔

آج میں خود کو دنیا کا خوش نصیب انسان سمجھتا ہوں کہ وہ میری شریکِ حیات ہے۔ وہ میرے ساتھ عام سے مکانوں کی رہائشی رہی۔ میرے ساتھ بنچ پر بیٹھ کر ایک پلیٹ میں بریانی کھاتی رہی۔ میرے ساتھ بسوں اور رکشوں میں سفر کرتی رہی اور کبھی اُف تک نہ کیا۔ میری تنخواہ میں اپنی تنخواہ ملا کر میرے بھائی کے یتیم بچوں کی کفالت کرتی رہی۔ حالات کیسے بھی

ہوئے، وہ ہمیشہ خوش رہی۔ وہ میرے قصور اور زیادتیاں بی بی جی کی طرح مجھ سے محبت کے صدقے معاف کرتی رہی اور اب بھی کرتی ہے۔ لوگ مجھے سخی، ہم درد رشتے ناتے نبھانے والے اور کنبہ پال شخص کے حوالے سے جانتے ہیں حالاں کہ یہ سب کچھ میں نے اپنی بیوی کی قربانیوں سے سیکھا ہے۔ اس نے اپنی شادی شدہ زندگی کے پچھلے تینتیس سال ہر طرف محبتیں بانٹنے میں گزار دیے اور کبھی اپنی ذات اور انا کو بیچ میں نہ آنے دیا۔

میں اپنا گھر، ماں باپ کی دیکھ بھال، چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمہ داریاں، خاندان کا پالن، بچوں کی پرورش اور گھر داری بیوی کو سونپ کر فوجی نوکری کے پیچھے بھاگتا رہا کہ اگلا رینک مل جائے تو بیوی کا بار بانٹوں گا۔ مگر کمال ہے اس عورت کا کہ نہ کبھی شکوہ شکایت، نہ تھکن کا احساس، نہ کوئی مطالبہ اور نہ گھر داری کے ساتھ ساتھ سرکاری نوکری سے چھٹیاں۔

سچ تو یہ ہے کہ مجھے ایمان داری سے نوکری کر کے اس رینک تک پہنچانے میں جہاں بی بی جی کی دعائیں شاملِ حال رہیں، وہاں زیادہ ہاتھ طلعت کی بے پناہ قربانیوں اور محبتوں کا ہے۔ میں نے صرف نوکری کی اور اس نے سرکاری نوکری کے ساتھ ساتھ مجھے، میرے خاندان اور میرے بچوں کو اچھی زندگی بھی دی۔

اگر یہ میری بیوی نہ ہوتی تو میں کبھی کنبہ پالن نہ کہلاتا۔ کبھی ماں باپ کی خدمت نہ کر پاتا۔ میرے بچے اس طرح قابل اور فرماں بردار نہ ہوتے۔ میرا حلقۂ احباب اور دسترخوان یوں وسیع نہ ہوتا اور سب سے بڑی بات کہ شاید میں بریگیڈیئر، اتحاد یونی ورسٹی کا چانسلر اور اپنی آرائیں برادری کا سربراہ بھی نہ بن پاتا۔ میں ہر وقت دل ہی دل میں اپنی بیگم کا شکریہ ادا کر کے کہتا رہتا ہوں کہ وہ میری بیوی سے زیادہ میری محسنہ ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری بیٹی اور میری بہو بھی میری بیوی جیسی بیویاں، اسی جیسی بہو، بہن، ماں اور اسی جیسی دوست بن پائیں۔

مجھے پتا ہے میری بیوی میری سب کوتاہیوں، جانے ان جانے کی غلطیوں اور یک طرفہ زیادتیوں کو ہر رات درگزر اور معاف کر کے سوتی ہے مگر پھر بھی شرمندہ ہوں۔

زندگی میں سبھی نشیب و فراز، مصیبتوں، تنگ دستیوں، سبق آموز غلط فیصلوں، میری

جدوجہد اور ناکامیوں میں ساتھ کھڑے رہنے کے لیے بھی اس کا شکر گزار ہوں اور شکر گزار ہوں اس کا کہ اس نے انسانوں سے محبت کرنے کے گُر سکھائے اور دوسروں کے لیے قربانیاں دینے کی راہ دکھائی۔

اس سے زیادہ کیا اقرار کروں کہ اگر اللہ ہمیں ایک زندگی اور عطا کرے تو میں پروردگار سے پھر اپنی اسی شریکِ حیات ہی کو مانگوں گا کہ جینا مرنا اس کے بنا سیکھا ہی نہیں۔

مانتا ہوں، اس کے ساتھ زندگی کی خوش گوار یادیں اور خوشیاں ہر طرف بکھری پڑی ہیں مگر اب عمر کی ساتویں دہائی میں آ کر ڈرنے لگا ہوں کہ اگر کبھی ہم میں سے ایک نہ رہا اور دوسرے کو اکیلے جینا پڑ گیا تو کتنے دن جی پائیں گے۔

ماواں ٹھنڈیاں چھاواں

میرے میاں جی سخت طبیعت کے مالک تھے۔ میں لیفٹیننٹ کرنل تھا اور ایک فیلڈ میڈیکل یونٹ کمانڈ کر رہا تھا مگر وہ تب بھی مجھے ناسمجھ ہی گردانتے تھے اور جب دل چاہتا کھری کھری سنا دیتے۔ میں چھٹی آتا تو کہتے، میاں افسری یونٹ میں رکھ کر آیا کرو۔ لوگوں کو ملتے ہو تو انھیں کبھی احساس نہیں ہونا چاہیے کہ تم اب کوئی بڑے آدمی بن گئے ہو ورنہ وہ تم سے دور ہوتے جائیں گے۔ اچھا افسر کہلانا ہے تو تم سے مل کر کسی کو اپنے کم تر ہونے کا احساس نہیں ہونا چاہیے۔

دوسری طرف بی بی جی تھیں۔ شیشم کے درختوں جیسی گھنی چھاؤں۔ کنویں کے پانیوں جیسی ٹھنڈی ٹھار۔ غصے میں بھی ہوتیں تو بس سر پر یا پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہتیں، جا دور بیٹھ مجھ سے۔ گھر کے یا خاندان کے بارے میں بہت سے فیصلے مجھ سے کرواتیں۔ صحیح ثابت ہوتے تو شاباش مجھے دے دیتیں اور غلط ہو جاتے تو مصیبت اپنے گلے میں ڈال لیتیں۔ پھر اکیلے میں بٹھا کر سمجھاتیں کہ پتر تو اب بڑا اور سیانا ہو گیا ہے۔ سوچ سمجھ کر فیصلے کیا کر۔ اس طرح بی بی جی مجھے آہستہ آہستہ خود اعتمادی کی سیڑھیاں چڑھاتی رہیں۔۔

بچپن میں میاں جی سے میری خوب لڑائیاں رہتیں مگر دل ہی دل میں۔ کبھی سامنے

اونچا بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ۱۹۷۶ء میں جب میڈیکل کالج میں داخلہ ہوا تو میاں جی نے حکم سنایا کہ صرف تین سو روپے ملا کریں گے اور تمھیں اسی میں گزارا کرنا ہے۔ میں بی بی جی کے سامنے خوب چیختا کہ اس میں کیسے گزارا ہوگا۔ وہ اشارے سے مجھے چپ رہنے کا کہتیں۔ پانچ سال یہ معمول رہا کہ جب میں جام شورو جانے سے پہلے بی بی جی کو گلے ملتا تو وہ چپکے سے میری سائیڈ والی جیب میں کچھ پیسے ڈال دیتیں اور پھر میں سارا مہینہ خوب مزے کرتا۔ بی بی جی کی یہ عادت مجھ میں ایسی سرائیت کر گئی کہ جب میں خود کمانے لگا تو کبھی کسی کو کوئی رقم ہاتھ میں نہ دی۔ بی بی جی نے بن بولے دوسروں کا ایسا پردہ رکھنا سکھا دیا تھا کہ میں نے تو یہ اصول ہر جگہ لاگو کر دیا پھر وہ بیوی ہو، اولاد ہو، کوئی رشتہ دار ہو یا کوئی ضرورت مند— سائیڈ والی جیب ہمیشہ یاد رہتی ہے۔ بی بی جی کی دعا کیا لگی، میں ڈاکٹر بن گیا۔ آفیسر بن گیا۔ چھٹیوں پر گھر جاتا تو جیب میں اپنی ضرورتوں سے زیادہ پیسے ہوتے تھے۔ سب بی بی جی کے تکیے کے نیچے رکھ دیتا یا چپ چاپ ان کی منجی سے لٹکتی پرانی پوٹلی کھول کر اس میں ڈال دیتا۔ میاں جی سے گلے ملتا تو ان کی سائیڈ والی جیب میں میرا ہاتھ ضرور جاتا۔ بی بی جی کے ساتھ کسی رشتہ دار کے گھر جاتا تو ان کی مٹھی میں کچھ تھما دیتا اور وہ بنا دیکھے ہی آگے بڑھا دیتیں۔ میں یہ سب کرتا تو بی بی جی بہت پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتیں۔ یقین کریں اپنے سر پر اب بھی وہ ہاتھ پھرتا محسوس ہوتا ہے اور میں اس احساس کے خوب مزے لیتا رہتا ہوں۔ کبھی کبھی وہ پاس بٹھا کر کہتیں پتر تو نے دینا سیکھ لیا ہے ناں تو اب تجھے زوال نہیں آئے گا۔ جینے کا یہی صحیح راستہ ہے پتر۔

فوج میں تھے تو گن گن کر خرچ کرتے تھے اور گن گن کر کسی کی مدد کرتے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کاروبار کیا تو بی بی جی کی نصیحت پلے باندھ لی کہ دیتے جاؤ گے تو آتا جائے گا۔ پھر کیا تھا۔ مجھ جیسا پکا فوجی ایک اچھا بزنس مین بن کر کمانے لگا۔ شکر ہے اب دینا ہو تو اللہ نے گن کر دینے کی مصیبت سے نجات دلا دی ہے۔ روز صبح اٹھ کر دعا مانگتا ہوں کہ اے پروردگار بی بی جی کی بات سچ ہی رہنے دینا کہ دینے والے کو زوال نہیں۔

تپتی دھوپ میں بھی کھڑا ہو جاؤں تو ماں کو یاد کر کے ٹھنڈی چھاؤں کا احساس ہوتا ہے۔ کسی کی مدد کرنی ہو تو لگتا ہے بی بی جی کی مٹھی سے دے رہا ہوں۔ میں خود بھی اب زندگی

کی ساتویں دہائی پوری کرنے کو ہوں۔ نانا بن چکا ہوں مگر کوئی اب بھی مجھ سے پوچھے کہ ماواں ٹھنڈیاں چھاواں والی کہاوت کا مطلب کیا ہے تو بی بی جی کی گود میں چھپنے کو دل چاہتا ہے کہ یہ سچی کہاوت ہم الفاظ میں کسی کو کیسے سمجھا سکتے ہیں۔

شکایتیں نہیں، تربیت کیجیے

ہم دونوں میاں بیوی ڈاکٹر ہیں۔ میں فوج میں رہا اور بیگم سندھ گورنمنٹ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ میں۔ میری بیوی میرے والدین کے ساتھ نواب شاہ میں رہی اور نوکری بھی کرتی تھی۔اس کا فائدہ یہ ہوا کہ بی بی جی نے مزے سے طلال بیٹے کو پال پوس کر دوسال کا کر دیا۔ میری پوسٹنگ جب کراچی ہوئی تو ہم میاں بیوی کراچی شفٹ ہوگئے۔ وہ کیا زمانہ تھا کہ خاندان میں یا دوستوں میں کوئی بیمار ہو جاتا تو ہمارے لیے ان کی خوب محبتیں جاگتیں اور وہ فوراً کراچی ہمارے گھر کا رُخ کرتے۔ پھر کیا، ہم ان کی مہمان داری بھی کرتے۔ ان کا چیک اپ بھی کرتے، دوائیاں دیتے اور وہ اگلی دفعہ بیمار ہونے تک غائب ہو جاتے۔

میاں جی اور بی بی جی خوب مزے کے والدین تھے۔ان کا نواب شاہ کے بغیر دل لگتا ہی نہیں تھا۔ ہم ہزار کہتے کہ نواب شاہ میں گرمی ہوتی ہے کراچی رہ لیں مگر ان کو تو ہر کسی کی فکر ستاتی تھی اور سمجھتے تھے کہ چالیس پچاس سال عمر والے ہمارے بڑے بہن بھائی جن کی اپنی اولادیں بھی جوان تھیں، ان کے بغیر اکیلے ہیں۔ بس کبھی بیمار ہو جاتے تو ہم میاں بیوی کے علاوہ کسی پر اعتبار نہ ہونے کی وجہ سے کراچی آ جاتے اور میں یا بیگم صاحبہ دفتر سے چھٹیاں لے لیتے کہ گھر میں ان کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اب جیسے ہی ان کی صحت اچھی ہوتی تو تقاضا شروع ہو جاتا کہ پتر دل نئیں لگدا، پیچھے بہت کام رُکے ہوئے ہیں، نواب شاہ چھوڑ آؤ اور اس طرح ہمارا ابھی اپنے آبائی شہر کا چکر لگ جاتا تھا۔

میاں جی کی کمر کے مہروں کا آپریشن اس وقت ہوا جب میں میڈیکل کا طالب علم تھا اور اللہ کے کرم اور میرے محترم استاد کے اچھے علاج سے وہ معذوری سے بچ گئے مگر اب بھی

کبھی کبھی کمر کی تکلیف سے پریشان ہو کر کراچی آ جاتے۔ میں ۲۰۰۱ء میں لیفٹیننٹ کرنل تھا اور ہم ہارون رائل سٹی، گلستانِ جوہر کراچی کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ اس فلیٹ کا ٹیرس بہت کشادہ تھا جسے میں نے نواب شاہ سے شیشم کی لکڑی لا کر بہت خوب صورت بنایا ہوا تھا۔ کھلی ہوا میں شام کی چائے ہم یہیں بیٹھ کر پیتے۔

میاں جی اور بی بی جی آتیں تو یہ ان کی بھی پسندیدہ جگہ ہوتی تھی۔ روز یہیں بیٹھے میاں جی کے سر، پیر اور پنڈلیوں کی مالش میں کرتا اور بی بی جی کے بالوں میں کنگی طلعت کرتی۔ بچے چھوٹے تھے اور یہ سب دیکھتے رہتے تھے۔ ایک دن میرا بیٹا طلال سنجیدگی سے مجھ سے پوچھنے لگا، بابا آپ روز آفس سے آنے کے بعد دادا جی کے سر میں تیل لگاتے ہیں۔ کیا جب آپ بھی اس طرح بوڑھے ہو جائیں گے تو میں آپ کے سر کی مالش کیا کروں گا؟ میں حیران تھا کہ دس سال کا بچہ میرے اس عمل کو کس قدر غور سے دیکھتا رہتا ہے۔ مجھ سے پہلے اسے دادا جی نے جواب دیا کہ پتر زندگی گنے کے بیلنے کی طرح نہ ختم ہونے والا چکر ہے۔ جہاں سے شروع کرتے ہیں چلتے چلتے پھر وہیں پہنچ جاتے ہیں بلکہ جو کچھ تم وہاں سے کر کے گزرے ہو وہی سالوں بعد تمھارے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ میاں جی میرے بیٹے طلال کو جپھی میں لے کر کہنے لگے، پتر والدین جو کچھ اپنی اولاد سے چاہتے ہیں، وہ سب ان کو خود کر کے سکھانا پڑتا ہے۔ اگر ان کو عمل سے نہ سکھایا ہو تو بچے جتنی بھی پڑھائیاں مکمل کر لیں، وہ عمل کرتے نظر نہیں آتے۔ یہ تربیت خود والدین کی اپنی ذمہ داری ہے۔ بعد میں اپنے بچوں سے شکایتیں اس تربیت کی کمی کا ازالہ نہیں کر سکتیں۔ والدین اور بزرگوں کے ادب آداب، رزقِ حلال اور حسنِ اخلاق اگر بچوں نے گھر میں نہ دیکھا ہو تو کتابوں سے کہاں سیکھ پاتے ہیں۔

اب جب میرا اپنا بیٹا گھر آ کر مجھ سے بہت محبت اور ادب سے پیش آتا ہے تو مجھے میاں جی کا گنے والا بیلنا یاد آ جاتا ہے اور لگتا ہے کہ میں زندگی کا پورا چکر کاٹ کر میاں جی والی کرسی پر اسی شیشم کی لکڑی والے ٹیرس میں آ بیٹھا ہوں۔ بس شدید خواہش ہے کہ میرا پوتا ہو تو مرنے سے پہلے اسے بھی نصیحت کر جاؤں کہ پتر اپنے پڑدادا کے گنے والے بیلنے کو رکنے نہ دینا کیوں کہ ایسا ہو گیا تو ہماری خاندانی روایات بھی کہیں نہ کہیں رک جائیں گی جس کا خطرہ اب

شدید تر ہے کیوں کہ میاں جی اور بی بی جی جیسے والدین تو ہم بھی نہیں بن پائے۔

میاں جی کی یاد میں

۱۹۷۹ء میں تھرڈ ائیر ایم بی بی ایس شروع ہوا تو ڈیوٹی وارڈ میں لگی اور بیماریوں کے بارے میں علم ہونا بھی شروع ہوگیا۔ جو بیماری بھی پڑھنے لگتا تو شک ہوتا کہ یہ مجھے تو نہیں ہے۔ایک دن کمر کے درد کے اسباب کے بارے میں پڑھ رہے تھے تو ایک دم میاں جی کی کمر کے درد کی شکایت یاد آ گئی۔ وہ مجھ سے کئی دفعہ یہ بھی کہہ چکے تھے کہ ان کے پاؤں بھی سن سے ہو جاتے ہیں۔ میں فکر مند ہو گیا کہ میاں جی کو کوئی ایسی خطراک بیماری نہ ہو۔فوراً گھر بھاگا اور ان کو اپنے ساتھ جام شورو لانے کو راضی کر لیا۔

پتا چلا کہ اب تو وہ بہت تکلیف کی شکایت کرتے تھے اور بعض اوقات تو ان سے چلا بھی نہیں جاتا مگر نواب شاہ میں کوئی ڈاکٹر تشخیص نہ کر پا رہا تھا۔ میں ان کو جام شورو لایا تو چار دن میں ہی پتا چل گیا کہ میاں جی کی ریڑھ کی ہڈی کے مہروں میں ٹی بی ہے اور مہروں کے درمیان کم ہوتے فاصلے نے حرام مغز کو دباؤ میں لے کر ٹانگوں کو کم زور کرنا شروع کر دیا ہے اور یہ عمل ہر روز تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ میرے جام شورو کے استاد ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ سول ہاسپٹل کراچی میں ڈاکٹر علی محمد انصاری اس کا آپریشن کریں تو یقیناً بہتر علاج کی توقع ہے اور وہ مکمل صحت یاب ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر علی محمد انصاری ہمارے کالج کے پرنسپل بھی رہ چکے تھے اور یہ تعلق بہت ڈھارس کا باعث تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب وسائل تھے ہی نہیں۔ زندگی نپے تلے انداز میں گزر رہی تھی۔ اب دل گھبرا رہا تھا کہ کراچی جیسے بڑے شہر میں جا کر علاج کیسے کروائیں گے۔ اللہ بھلا کرے ان بچپن کے دوستوں کا جو ہاسٹل میں میرے روم میٹ تھے۔ سب نے ہمت بڑھائی کہ ہم ساتھ چلیں گے اور اپنے پرانے پرنسپل سے ملیں گے تو ان شاء اللہ آسانیاں ہوں گی۔ میرے نواب شاہ کے ساتھی احسان الحق منصور، شہامت فاروق، کالج کے دوست اقبال

پیرزادہ اور سندھ میڈیکل کالج کراچی سے راؤ عبدالحامد تو میرے ساتھ ایسے جڑ گئے جیسے میاں جی کے آپریشن تک ان سب کو دنیا میں اور کوئی کام ہے ہی نہیں۔

ہمارے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ ہم کوئی ایمبولینس کروا لیتے۔ میاں جی کو ہاسپٹل کی ایمبولینس میں جام شورو پھاٹک پر لائے اور وہاں سے بس کی سیٹ پر لٹا کر کراچی کا رُخ کیا۔ بڑے دونوں بھائی انتہائی افسردگی میں نواب شاہ واپس لوٹ گئے کہ جب آپریشن ہوگا تو ہم کراچی پہنچ جائیں گے۔

پروفیسر انصاری ان چند شفیق اساتذہ اور مہربان ڈاکٹرز میں سے ایک تھے جن کو جب بھی یاد کریں، ان کے لیے دعاؤں کے لیے ہاتھ خود بخود اٹھتے چلے جاتے ہیں۔ ہم ان سے ڈاؤ میڈیکل کالج سے منسلک سول ہاسپٹل کے آرتھوپیڈک وارڈ میں ملے اور بتایا کہ سر ہم سب آپ کے شاگرد ہیں اور بڑی پریشانی اور امیدوں سے آپ کے پاس آئے ہیں۔ کہنے لگے، تو پھر فکر کیوں کرتے ہو۔ آپریشن بھی ہو جائے گا اور خرچوں کی فکر بھی چھوڑ دیں۔

میاں جی وارڈ میں داخل ہوئے تو تیز بخار نے آ گھیرا۔ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے تو مجھے خوب ڈانٹ پڑتی۔ ایک آدھ دفعہ تو انھوں نے پروفیسر انصاری سے بھی کہا کہ میرا کمرے میں آنا بند کر دیں۔ میاں جی بہت تکلیف میں ہوتے تو میرے دوستوں کو بھی خوب ڈانٹتے کہ مجھے ٹھنڈے پانی کی پٹیوں سے کیوں تکلیف پہنچاتے ہو۔ میں آج بھی ان دوستوں کو یاد کروں تو آنکھیں بھر آتی ہیں۔ مجال تھی کہ کبھی ان کے چہروں پر کوئی منفی تأثر دیکھا ہو بلکہ ہنس ہنس کر بتاتے کہ آج میری بھی شامت آئی۔ پروفیسر انصاری نے استاد کا رشتہ یوں نبھایا کہ ہم آج تک شاگردی کا بوجھ اٹھائے پھرتے ہیں۔ آپریشن ہوگیا۔ دو ماہ بعد میاں جی چلنے پھرنے کے قابل ہوگئے۔ ہم سب دوستوں نے اپنے جیب خرچ سے پیسے اکٹھے کیے اور میاں جی کو ایمبولینس میں بٹھا کر نواب شاہ واپس پہنچ گئے۔

میاں جی بیمار بھی تھے تو ہمارے سر پر ان کی چھاؤں ایسے تھی کہ زندگی میں کبھی دھوپ کا احساس بھی نہ ہوا۔ ان کی دوراندیشی ایسی تھی کہ خود کبھی مدرسہ بھی نہ دیکھا ہوگا مگر ہم سب کو تعلیم و تربیت دے کر یہاں پہنچا دیا۔ طبیعت کے غصیلے تھے مگر نوالہ ایسا لذیذ دیتے رہے کہ آج

تک کوئی پیزا اور کوئی میکڈونلڈ دل کو نہیں بھاتا اور آنکھیں ایسے دکھاتے تھے کہ جوانی میں بھی کبھی اوپر نظر کر کے بات کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ ساتھ تھے تو لگتا تھا ساری دنیا ہماری ہے۔ جنت کو سدھارے تو ساری دنیا جھٹ ہاتھوں سے سرک گئی۔

پھر انھی کی محنتوں اور انھی کے صدقے اللہ نے ہمارے دن پھیرے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے مرتبے پر پہنچا دیا کہ دوسروں کے لیے آسانیاں مہیا کرنے کے قابل بنا دیا مگر میاں جی کا جام شورو پھاٹک سے کراچی تک کا بس کی سیٹ پر لیٹ کر سفر کرنا کبھی نہ بھول پایا۔ فوج میں بھی اپنے ہاسپٹل میں کسی سولجر یا آفیسر کے بوڑھے باپ کو بیمار دیکھتا تو ایسا لگتا کہ میاں جی سامنے کھڑے غور سے دیکھ اور سن رہے ہیں کہ مجھے اپنا ماضی یاد ہے کہ نہیں۔ کوئی دوست کسی سولجر کے والد کے علاج کے لیے فون کرتا تو اسی لمحے میرے بچپن کے دوست اقبال پیرزادہ، احسان الحق اور شہامت فاروق سامنے آ کھڑے ہوتے کہ ہمارا قرض ہے تم پر۔ اتارو اب۔ بہت کچھ کرتا ہوں مگر دوستوں کا قرض نہیں اتار پایا اب تک۔

پچھلے دنوں میں نے ایک ایمبولینس خرید کر اپنے شہر نواب شاہ بھجوا دی کہ کم از کم نواب شاہ سے کسی کے میاں جی کو دوبارہ اتنی تکلیف اور بیماری میں کراچی تک کا سفر بس کی سیٹ پر لیٹ کر نہ کرنا پڑے۔ میاں جی کو جب بھی یاد کرتا ہوں، چپکے سے ان سے وعدہ کر لیتا ہوں کہ میاں جی آپ کے صدقے نواب شاہ کے مریضوں کے لیے مزید سفری سہولتیں مہیا کروں گا اور اللہ تعالیٰ اسی طرح نوازتا رہا تو کیوں نہیں کروں گا۔

بٹوارا

ایک دن سوشل میڈیا پر ایک خبر بہت گردش کر رہی تھی کہ پاکستان کے ایک بہت بڑے عالمِ دین کے بچوں نے عدالت میں کیس کر دیا کہ ان کے باپ کی پانچ ارب سے زیادہ کی جائیداد کا بٹوارا قانون کے مطابق کورٹ کر دے کیوں کہ ان کو خطرہ ہے کہ ان کو انصاف سے حصے نہیں ملیں گے۔ ہم دوستوں میں یہی بات زیرِ بحث آئی تو پتا چلا کہ دسیوں ارب پتی والدین کے

بچے بڑی بڑی جائیدادیں ملنے کے باوجود آپس میں لڑ رہے ہیں اور روز عدالتوں میں تاریخیں بھگتتے ہیں۔ یہ سب سن کر میں نے تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ ہم سب بہن بھائیوں کی تو کل جائیداد ہی میاں جی اور بی بی جی تھے۔اس کے علاوہ میاں جی کے پاس کیا تھا ہمیں پتا ہی نہیں تھا۔

ہم سب کو پڑھا لکھا دیا۔ بہنوں کی شادیاں بھی ہوگئیں۔ بڑے بھائی نے کاروبار شروع کر دیا۔ تین بھائیوں نے سعودی عرب میں نوکری کر لی۔ میں ڈاکٹر بن کر فوج میں چلا گیا۔ گھر میں خوش حالی آ گئی۔ سب سے چھوٹا بھائی زیرِ تعلیم تھا۔ جب سب سے چھوٹی بہن کی شادی پر ہم نواب شاہ میں جمع ہوئے تو میاں جی نے کہا کہ لو بھئی جو کچھ میرے پاس ہے میرے جیتے جی بانٹ لو تا کہ کسی کو کوئی گلا نہ رہے۔ سارے بہن بھائی یک زبان بولے کہ میاں جی کیسی باتیں کرتے ہیں، اللہ آپ کا سایہ ہم پر قائم رکھے، ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ آپ نے ہمیں لکھا پڑھا کر اس قابل کر دیا ہے کہ ہم اب اپنے بل بوتے پر زندگی گزار سکتے ہیں بلکہ آپ کی خدمت بھی ہم پر فرض ہے اور کریں گے۔

بی بی جی چپ بیٹھی تھیں اور میاں جی ٹھانے بیٹھے تھے کہ فیصلہ آج ہی ہوگا۔ کہنے لگے، میں نے اپنی بیٹیوں کا جو حصہ شرعی طور پر بنتا ہے، وہ انھیں فرداً فرداً دے دیا ہے اور بیٹوں کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ بس اب آبائی گھر اور کاروبار پانچ بیٹوں اور ایک بیوہ بہو میں تقسیم کر کے میں اس فرض سے بھی آزاد ہونا چاہتا ہوں۔

ہر بیٹے نے کہا کہ میاں جی، ہم سب اب خود کماتے ہیں۔ اب تو ہماری باری ہے کہ ہم آپ کے لیے کچھ کریں۔ یہ سب اپنے پاس رکھیں، ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔ حتیٰ کہ بیوہ بہو نے بھی کہہ دیا کہ جب میرے بچوں کے نان نفقے اور تعلیم کی ذمہ داری میاں جی اور چاچا تاؤں نے ہی لے رکھی ہے تو پھر مجھے واقعی کچھ نہیں چاہیے۔ میاں جی سر پکڑے بیٹھے تھے کہ اب کیا کریں۔ ایک دم مجھ سے مخاطب ہوئے کہ تو کرنل بن گیا ہے کوئی فوجی والا فیصلہ کر کے میری مدد کر۔ میں نے میاں جی سے گزارش کی کہ سب سے بڑے بھائی کی اولاد جوان ہو رہی ہے اور ان پر بچوں کی شادیوں کی ذمہ داری پڑنے والی ہے اور ہمارا سب سے چھوٹا بھائی زیرِ تعلیم ہے۔ بس ان دونوں میں بانٹ دیں۔ انھوں نے میری پیٹھ پر زور سے تھپکی دی اور بی بی جی

سے کہنے لگے، کرماں والیے، کون کہتا ہے فوجیوں کا دماغ نہیں ہوتا۔ بس فیصلہ ہو گیا۔

جب تک میاں جی اور بی بی جی حیات رہے اسی گھر میں دونوں بھائیوں کے ساتھ تھے۔ اللہ نے ہم سب کو ایسے کرم لگائے کہ ہر نعمت سے نواز دیا۔ بڑے بھائی نے کچھ سالوں بعد سب سے چھوٹے بھائی کی شادی پر اس کا حصہ الگ کر کے اسے دے دیا۔ باقیوں کو تو چھوڑیں ہماری بیوہ بھابھی کی تینوں بیٹیاں ڈاکٹر اور ایک بیٹا انجینئر بن گیا۔ ان سب سے بڑا بیٹا بزنس کرنے لگا۔ اب تیس سال بعد ہم میاں جی اور بی بی جی کی جائیداد کا حساب کرتے ہیں تو اس میں ان کے تیس چالیس پڑھے لکھے فرماں بردار نواسے نواسیاں پوتے پوتیاں اپنے اپنے گھروں میں خوش حالی اور عزت سے زندگی گزار رہے ہیں۔ مزہ تب آتا ہے جب ہم سب نواب شاہ میں اکٹھے ہو کر اپنے بچوں کو میاں جی کی جائیداد کے بٹوارے کی باتیں سناتے ہیں اور وہ ایسے سن رہے ہوتے ہیں جیسے کوئی محبت کی داستان پر فلم بنانی ہو۔

بہت مشکل ہوتا ہے اپنے آنسوؤں پر قابو رکھنا جب ہمارے بچے دیواروں پر لگی دادا دادی کی تصویروں والے فریم اتار کر اپنی گود میں رکھ کر ان کی باتیں سنتے ہیں اور عقیدت سے فریم کو ہی بوسے دینے لگتے ہیں۔ کاش عدالتوں میں بٹوارے کے مقدمے لڑتے لوگوں کے بچوں کو کوئی جا کر ان کے دادا دادیوں اور والدین کی تصویروں والے فریم تھما سکے کہ ان سے تو پوچھ لو کہ عدالتوں میں تمھاری لڑائیوں سے ان کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔

جائیداد

پچھلے سال کورونا کی وبا پھیلنے سے پہلے لاہور کی ایک این جی او تیس پینتیس بچوں کو کراچی کی سیر کروانے لائی۔ بچے اور بچیاں میٹرک سے لے کر ماسٹر ڈگری کے طالب علم تھے اور شاہراہ فیصل پر ریجنٹ پلازا ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انسدادِ منشیات کے لیے کام کرنے والی ایک مقامی این جی او کے تحت چلنے والے ایک منشیات سے نجات کے ہاسپٹل نے روزانہ تین چار نام ور شخصیات کو بلوانا شروع کیا تاکہ وہ بچوں کو اپنی زندگی کی کامیابیوں کی

داستان سنائیں۔ نہ جانے کس بنیاد پر ایک دن مجھ ناچیز کو بھی دعوت مل گئی۔ میں نے ہزار کہا کہ میری ایسی کیا کامیابیوں کی داستان ہے جسے سن کر بچے خوش ہوں۔ میں تو خاک سا ریٹائرڈ فوجی ہوں اور اس کے علاوہ میرے پلے ہے کیا۔

تقریریں شروع ہوئیں تو مجھ سے پہلے پاکستان کے ایک بہت بڑے کپڑوں کے برانڈ کے مالک نے تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح اس نے اپنی کاروبار کی ماہر غیر ملکی بیوی کی مدد سے ایک چھوٹی سی کپڑے کی دکان سے اپنا برانڈ متعارف کروایا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پاکستان کے ہر شہر میں اس کی شاخیں کھلتی گئیں۔ برانڈ دن بہ دن مشہور ہوتا گیا اور پھر برانڈ سے بے تحاشا پیسا کمانا شروع کر دیا۔ ہر بڑے شہر میں جائیدادیں، گھر اور اپنے برانڈ کے شو روم خریدتا چلا گیا۔ میری طرف دیکھ کر کہنے لگا، بریگیڈیئر صاحب اصل خوشی مجھے چار سال پہلے اس وقت ہوئی جب میں نے کراچی میں نیشنل اسٹیڈیم روڈ پر جنرل کالونی میں آپ کے سابقہ چیف آف آرمی اسٹاف کا گھر بھی خرید لیا۔ خوب تالیاں بجیں۔ اسے خوب داد ملی۔ کمال کی طویل کامیابیوں کی متاثر کن داستان تھی۔

میں اب مزید پریشان بیٹھا تھا کہ میں تو فوج سے ملنے والے دونوں پلاٹ بیچ کر کھا چکا ہوں تو پھر میرے پاس سنانے کو کیا ہے۔ مائیک میرے ہاتھ میں آیا تو میں نے بچوں کو مخاطب کر کے کہا کہ میری داستانِ حیات شاید کسی کو پسند نہ آئے نہ آپ کو تالیاں بجانی پڑیں اور شاید یہ داد کے قابل بھی نہ ہو مگر چلو سناتا ہوں۔

میرا تعلق نواب شاہ کے ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہے۔ ہمارے بزرگ انڈیا سے لٹے پٹے ہجرت کر کے یہاں آ بسے تھے اور مختلف مزدوری کے کام اور کھیتی باڑی کر کے پیٹ پالتے تھے۔ یہ بزرگ اس امید پر خوش رہتے تھے کہ اب پاکستان میں ان کی اولاد پڑھ لکھ جائے گی اور پھر اللہ دن بھی پھیر دے گا۔ ہمارے گاؤں میں پرائمری اسکول بھی نہ تھا۔ ہم سب بہن بھائی پیدل ہی شہر پڑھنے جاتے تھے۔ میں نے بھی پانچویں کلاس اردو پرائمری مین اسکول نواب شاہ شہر سے پاس کی۔ اُس وقت کلاس میں کچھ بچے زمین پر بچھائی دریوں پر بیٹھتے تھے اور کچھ لکڑی کے بنچ پر۔ پانچویں کلاس تک اے بی سی کا بھی پتا نہ تھا، بس الف سے انار اور بے سے بکری

پڑھتے تھے۔ چھٹی کلاس کے لیے ڈی سی ہائی اسکول نواب شاہ میں داخلہ مل گیا۔ میاں جی نے ہائی اسکول میں داخلے سے خوش ہو کر شہر میں کرایے کے مکان میں کچھ مجھ جیسے ہی دوسرے لڑکوں کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔ ہم روزانہ خود ہی مل جل کر بے ذائقہ سا سالن بناتے اور محلے میں ایک تندور والی ماسی کو گاؤں سے لایا ہوا آٹا دے کر روٹی لگوا لیتے۔

ان دنوں ڈی سی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ایچ ایم خواجہ صاحب ہوتے تھے جو بعد میں سندھ کے نامی گرامی ماہرِ تعلیم کے طور پر بھی جانے جاتے تھے۔ شام کو ہمارے اسکول میں کھیل کا میدان بھی سجتا تھا۔ ہم تو اپنے گاؤں میں کبڈی یا گلی ڈنڈا کھیلنے تک محدود تھے مگر شہروں میں طالب علموں میں کرکٹ کے کھیل کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ میرے داخلے کا دوسرا یا تیسرا دن تھا۔ میں بھی اپنے ہم جماعت لڑکوں کے ساتھ اسکول کے کھیلوں کے میدان میں پہنچ گیا۔ ہمارے دو بہت ہی شرارتی ہم جماعت نثار آرائیں اور عالمگیر فرحت اللہ جو نواب شاہ شہر کے انگلش میڈیم اپوا اسکول سے آئے تھے اور انگریزی بھی جانتے تھے، مجھ سے کہنے لگے، دیکھو بھئی اگر کرکٹ کھیلنی ہے تو پہلے کرکٹ کے انگریزی میں اسپیلنگ بتاؤ۔ مجھے چوں کہ انگریزی کا ایک لفظ نہیں آتا تھا تو میں چپ چاپ عزت بچا کر گراؤنڈ سے باہر آ بیٹھا لیکن بہت دلبرداشتہ بھی ہوا کہ انھوں نے میرا اس طرح مذاق اڑایا ہے۔

میں نے اس دن سے کرکٹ کھیلنے کا خیال دل سے نکال دیا اور پڑھائی پر زیادہ دھیان دینا شروع کر دیا۔ میں ساتویں کلاس میں پہنچا تو ساری کلاس کو پیچھے چھوڑ چکا تھا۔ اب پڑھائی میں صرف دو تین لڑکوں سے ہی میرا مقابلہ ہونے لگا۔ میں کرکٹ کی گیند کی بجائے کتابوں کے پیچھے بھاگنے لگا۔ پھر کیا تھا، اپنے کالج میں نام کمایا اور میں ڈاکٹر بھی بن گیا۔ فوج میں شمولیت اختیار کی تو کیپٹن کا رینک بھی مل گیا۔ کورس کرتا گیا، ترقی ہوتی گئی۔ کارکردگی کی بنیاد پر یونائیٹڈ نیشن مشن میں سعودیہ گیا۔ صومالیہ گیا اور پھر بوسنیا بھی پہنچ گیا۔ دنیا کے پینتیس ملکوں کی آرمی کے جھرمٹ میں نوکری کی۔ بوسنیا سے یو این کے ہیلی کاپٹر میں دوسرے ملک کروشیا میٹنگز کرنے جاتا۔ ایک دن بوسنیا میں کام کرنے والی دنیا کی دسیوں این جی اوز کے سامنے تزلا کینٹ میں اپنی کمانڈ میں پاک بٹالین ۲ ہاسپٹل کی کارکردگی کے بارے میں بتا رہا تھا تو

گورنمنٹ بوائز اور پرائمری مین اسکول ہاسپٹل روڈ، نواب شاہ۔

ڈی سی ہائی اسکول نواب شاہ کا بیرونی دروازہ۔

ڈی سی ہائی اسکول نواب شاہ میں میرا میٹرک کا کلاس روم۔
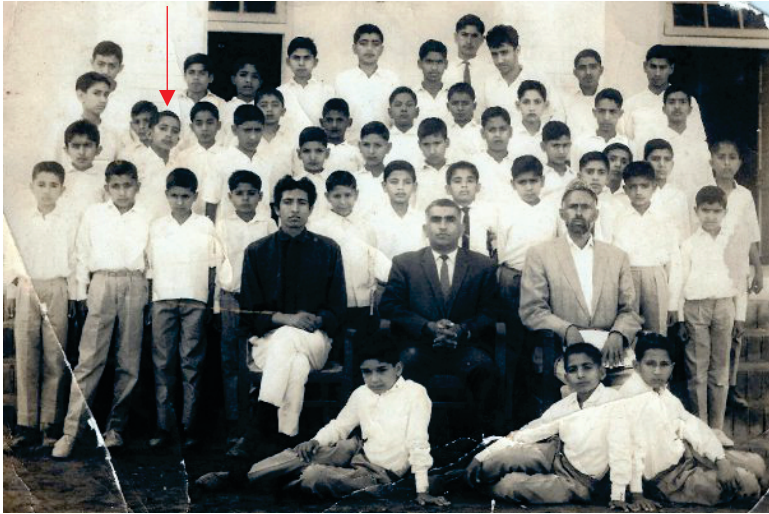
ساتویں کلاس میں ہیڈ ماسٹر محمد بچل، اپنے کلاس ٹیچر شیر علی شاہ
اور پی ٹی ٹیچر الطاف صاحب کے ساتھ گروپ فوٹو۔
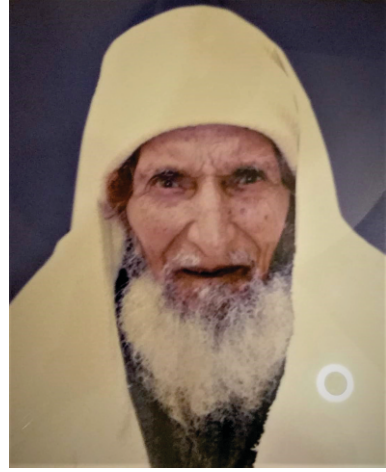
میاں جی

بی بی جی

بی بی جی کے ساتھ ڈھولے والی گوٹھ میں یادگار تصویر۔

علی طلال نوری اور معصومہ نوری رائل ہالووے یونی ورسٹی لندن
میں مبارک باد وصول کرتے ہوئے۔

معصومہ نوری رائل ہالووے یونی ورسٹی لندن
سے بیچلر ڈگری لیتے ہوئے۔

علی طلال نوری سٹی یونی ورسٹی لندن
سے ماسٹر ڈگری لیتے ہوئے۔

میرے نارویجین سینئر کرنل نے کہا کہ آپ پاکستانی ڈاکٹرز انگلش بہت اچھی بولتے ہیں۔ مجھے فوراً ہی بچپن کے الف سے انار اور ب سے بکری کی یاد آ گئی اور میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

فوج میں ترقی ہوتی رہی مگر نہ میں اپنے گاؤں کی کچی گلیاں بھولا نہ کرنل اور بریگیڈ یئر کے رینک میں ہوتے ہوئے میاں جی کی ڈانٹ سے نجات ملی۔ وہ اکثر کہتے کہ آفیسر تم اپنی یونٹ میں ہو۔ اپنے لوگوں میں آیا کرو تو اپنا بن کر آیا کرو۔

میں ریٹائر ہوا تو اپنے دو پلاٹ اور آرمی سے ملنے والا ملیر کینٹ والا گھر بیچ دیا۔ کرایے کے گھر میں شفٹ ہو کر بیٹی کو رائیل ہالووے یونی ورسٹی لندن سے Journalism & English Creative Writing میں ڈبل بیچلر کرنے اور بیٹے کو International Politics & Foriegn Policy Development میں ماسٹر کرنے سٹی یونی ورسٹی لندن بھیج دیا۔ دونوں واپس آئے تو ان کی شادیاں کر کے فارغ ہو گیا۔ تیس پینتیس سال کی محنت کی کمائی سے ان بچوں کی صورت میں صرف یہ دو جائیدادیں بنائیں۔ بیٹی اب ایک بین الاقوامی رسالے کے لیے لکھتی ہے اور بیٹا پی ایچ ڈی کے لیے اپنی بیگم سمیت پھر لو برو یونی ورسٹی لندن کی خاک چھان رہا ہے کیوں کہ میں اسے پاکستان میں اپنی اتحاد یونی ورسٹی کا سب سے کم عمر وائس چانسلر بنانے کا خواب دیکھتا رہتا ہوں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد میڈیسن سپلائی کا جو کاروبار شروع کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی برکتیں ڈالیں کہ میں نے صرف تین سال بعد ہی اپنے فروخت کیے گئے گھر جیسا مکان دوبارہ خرید لیا۔

گھر اپنا ہوا تو ہر وقت یہی خیال ستاتا رہتا تھا کہ مزید جائیداد بنانی چاہیے۔ میں نے پس ماندہ شہروں سے ہر سال تین سے چار غریب ذہین بچوں کی یونی ورسٹی فیس کی ذمہ داری اٹھانی شروع کر دی تا کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر سکیں۔ اب مجھے کاروبار کرتے گیارہ سال ہو گئے ہیں اور پاکستان کے سات چھوٹے شہروں میں بہترین روزگار لگے سترہ نوجوان میری جائیداد میں شامل ہیں۔ ان شہروں سے گزروں تو ان کے گھروں میں مزے دار کھانا کھائے بغیر کہیں آگے نہیں جا سکتا۔

اس طرح کی جائیدادیں بنانے کی ایسی لت پڑ گئی ہے کہ میں اکثر سندھ کے کسی پس ماندہ شہر کے ہائی اسکول کا چکر بھی لگا لیتا ہوں کہ کسی غریب کا ذہین بچہ فیس نہ ہونے کی وجہ سے

اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر واپس گاؤں نہ چلا جائے۔ میری سب سے بڑی جائیداد تو اب میرا ذاتی تعلیمی ادارہ اتحاد یونی ورسٹی ہوگا۔ جس کا چارٹر میں سندھ اسمبلی سے لے چکا ہوں اور اللہ نے چاہا تو جیتے جی اس میں اپنے جیسے پس منظر کے بچوں کو پڑھتا بھی دیکھوں گا۔

چوں کہ میری تقریر کے دوران محفل میں مکمل خاموشی تھی تو میں نے ازراہِ مزاح یہ بھی کہا کہ تھر میں لوگوں کے لیے کھودے گئے ستر سے زیادہ پانی کے کنویں میری جائیداد میں شامل ہیں اور اس تعداد میں ہر ماہ اضافہ ہو رہا ہے۔ سامعین اس بات پر بھی نہ ہنسے نہ تالیاں بجائیں۔ محفل میں مکمل سناٹا ہی چھایا رہا۔ اب اور کیا کہتا، صرف شکریہ کہہ کر اپنی داستان ختم کر دی اور ڈائس سے اپنی نشست کی طرف چل پڑا۔

میری زندگی کے وہ لمحے ہمیشہ یادگار رہیں گے جب میرے بیٹھنے سے پہلے ہی بہت سے بچے اپنی نشستوں سے اٹھ کر میری طرف دوڑے اور مجھے زور زور سے جھپیاں ڈال رہے تھے۔ میں حیرانی میں ان سے یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ بھئی میری اس داستان میں ایسی کیا بات ہے جو مجھ پر یہ والہانہ محبتیں نچھاور کی جارہی ہیں۔

خواہشیں اور مہنگائی

ایک دوست کے ہاں دعوت پر مدعو تھے۔ ان کے گھر کے وسیع ائیر کنڈیشنڈ لاؤنج میں تیس پینتیس لوگوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ دسیوں قسم کے کھانے اور لوازمات لگ رہے تھے۔ محسوس ہو رہا تھا جیسے آج زندگی میں کھانے کا یہ آخری موقع ہوگا۔ سب اکٹھے ہوئے تو سیاست کے ساتھ مہنگائی اور غربت جیسے موضوع زیرِ بحث تھے۔ ہر شخص غربت اور مہنگائی کا رونا رو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ خوشی نامی چیز کسی شخص کو چھو کر بھی نہیں گزری۔ سب ہی زندگی سے بیزار اور ناراض نظر آئے۔

میزبان نے کھانا لینے کی دعوت دی۔ کھانے کے وقت ہر کوئی دوسرے کو بتا رہا تھا کہ یہ لو چکن پکوڑے ہیں، یہ کھاؤ فش ہے، یہ والا نیا آئٹم لگ رہا ہے۔ سب مزے سے کھا رہے

تھے مگر اللہ کا شکر کرتا کوئی سنائی نہیں دیا۔ اس کے برعکس غربت اور مہنگائی کا واویلا ہر طرف غالب دکھائی دیا۔

کھانے کا مرحلہ کچھ تھما تو مدرز ڈے کا شور بھی سنائی دیا۔ شاید ایک دن پہلے ہپی مدرز ڈے بھی منایا گیا تھا۔ اپنے اپنے بچوں کی طرف سے قیمتی تحائف کا ذکر بھی لامحالہ ہو رہا تھا۔ مدرز ڈے کا ذکر نکلے اور مجھے اپنی بی بی جی یاد نہ آئے، ناممکن سی بات ہے۔

جنرل ایوب خان کے مارشل لا کا دور تھا۔ ہم سب بہن بھائی چھوٹے تھے اور بی بی جی سب کو اکیلے سنبھالتی تھیں۔ پوری زندگی ان کو ہر وقت مسکراتے ہی دیکھا۔ غربت ہوگی شاید مگر آج والا رونا پیٹنا ان سے یا میاں جی سے کبھی نہ سنا۔ رمضان میں کیا خوب زور شور سے بی بی جی افطاری کی تیاریاں کرتی تھیں۔

دیسی گڑ یا شکر کی میٹھی لسی پہلے ہی ٹھنڈی ہونے کے لیے مٹی والے گھڑے میں تیار ہو جاتی تھی اور ڈھیر سارے پیاز اور بینگن کے بیسنی گرما گرم پکوڑے ساتھ ساتھ بنتے تھے۔ سب خوب خوشی خوشی کھاتے اور ماں کے ہاتھ کے ذائقے کی تعریف کرتے۔ بی بی جی خوب خوش ہوتیں کہ سب کو پکوڑے پسند آ رہے ہیں۔ اب یاد نہیں سالن کیا بنا ہوتا تھا مگر ہم سب مزے سے پیٹ بھر کے کھاتے تھے۔ غربت اور مہنگائی کے تذکرے تو کیا بلکہ آخر میں سب مل کر اللہ کا شکر ادا کرتے کہ پیٹ بھر کر کھانے کو ملا۔

کسی خاص دن کو ہپی مدرز ڈے کہنا ہے، پتا ہی نہ تھا۔ ہمارا تو ہر دن بی بی جی کے ساتھ ہپی ڈے ہی ہوتا تھا۔ عام دنوں میں روز صبح بی بی جی کے ہاتھ کے بنے دیسی گھی کے پراٹھے شکر ڈال کر کھاتے تو لگتا اس سے بڑی نعمت کوئی ہو ہی نہیں سکتی دنیا میں۔ پھر ان کے ہاتھ چوم کر اسکول کی طرف بھاگتے۔ وہ آواز دیتیں۔ ہم بستہ تھامے رکتے۔ وہ بستے میں ہمارا لنچ رکھتیں اور آٹا لگے ہاتھوں سے ہمارا منہ پکڑ کر ماتھے پر زور سے چومتیں۔ دعا دے کر واپس اپنے کام میں جت جاتیں اور ہم منہ پر لگا خشک آٹا صاف کرتے کرتے دوستوں کے ساتھ اسکول کو چل پڑتے۔

سردیوں اور گرمیوں میں چار میل پیدل چل کر اسکول جاتے تو کبھی گرمی سردی کا رونا بھی نہ رویا۔ کبھی کسی سے یہ بھی نہ کہا کہ بس میں جانے کا کرایہ نہیں ملتا، اس لیے پیدل جاتے

ہیں۔حد تو یہ تھی کہ یہ خیال آتا ہی نہیں تھا کہ کرایہ نہیں ہے۔

دوپہر کو بستے سے پراٹھا نکال کر مزے دار اچار کے ساتھ کھاتے بلکہ روزانہ کسی نہ کسی دوست کو بھی خوشی خوشی کھلاتے۔ پتا نہیں غربت اور مہنگائی کا ذکر اتنا سننے کو کیوں نہیں ملتا تھا۔ میاں جی کو بھی اتنی محنت مشقت کرتے اور اس قدر بڑے کنبے کو پالتے ہمیشہ خوش ہی دیکھا بلکہ اللہ کا شکر بجالاتے ہی سنا۔

ہماری تو عید پر بھی خوشیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔سب بھائیوں کے لیے ایک ہی جیسے شلوار قمیص بنتے اور وہ بھی اسکول والے رنگ کے۔ جوتے بھی وہ خریدے جاتے جو بعد میں اسکول بھی پہن کر جاسکیں۔عید سے پہلے ہی راتوں کو اٹھ اٹھ کر نئے سلے کپڑے پہن کر دیکھتے اور خوش ہوتے تھے۔ جو اپنے پاس تھا، اس پر ہر کوئی خوش تھا اور اللہ کا شکر بھی ادا کرتا نظر آتا تھا۔

تب خواہشیں بھی چھوٹی ہوتی تھیں جو لوگوں کی تنگ دستی میں بھی پوری ہو جاتی تھیں۔ اب تو بہت کچھ میسر ہے مگر خواہشیں ایسی ہیں کہ جینے نہیں دیتیں۔ گھروں سے خوشیاں کہیں ہجرت کر گئیں ہیں۔ جو اپنے پاس ہے اس پر شکر کرنے کی بجائے جو نہیں ہے اس پر اپنے رب سے ناراض رہتے ہیں۔ جو اردگرد لوگوں کے پاس دیکھتے ہیں، اس کی حسد نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ اگر خواہش کے مطابق خریداری میں کمی رہ جائے تو غربت کا واویلا کرتے رہتے ہیں۔آئی فون سیٹ اور کے ایف سی اتنے مہنگے ہوگئے ہیں کہ اپنے ڈرائیور اور کام والی ماسی کو بھی اپنے پروردگار سے شکوے کرتے سنتا ہوں۔ اکثر بچوں کو والدین سے بدتمیزیاں کرتے دیکھتا ہوں کہ کیسے اس گھر میں پیدا ہوگئے جہاں اپنی پسند کی شاپنگ بھی نہیں کر سکتے۔۔

حد تو یہ ہے کہ انھی والدین کو مہنگے کلب اور فائیو اسٹار ہوٹلوں میں کھانا کھاتے غربت اور مہنگائی کے شکوے کرتے اور روتے پیٹتے سنتا ہوں تو اپنے بی بی جی اور میاں جی شدت سے یاد آتے ہیں اور ان کو دل ہی دل میں آوازیں دیتا ہوں کہ واپس آجائیں ناں ایک بار پھر ہماری دنیا میں۔اپنی طرح ہمیں بھی اپنے رب کی ڈھیروں نعمتوں کا شکر ادا کرنا سکھا جائیں یا کم از کم کسی طرح ان گنت خواہشوں کی قید سے نکل کر خوش رہنا تو سکھا جائیں۔ ہم تو ان خواہشوں کی قید میں مسکرانا تک بھول گئے ہیں۔

جہیز

جہیز زہر لگتا ہے لینا بھی دینا بھی۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ بیٹیوں کو خالی ہاتھ کون رخصت کرتا ہے۔ جہیز دینا چاہیے کہ بیٹیاں نئی زندگی ہنسی خوشی شروع کر سکیں۔ ایسا جہیز جو نہ چوری ہو نہ خرچ کر کے کم ہونے پائے۔ بی بی جی کہا کرتی تھیں کہ بیٹیوں کو تعلیم کے جھمکے اور تربیت کا ہار پہنا کر رخصت کریں تو وہ زیادہ اچھی زندگی گزار سکتی ہیں۔

ریٹائرمنٹ ہوتے ہی میں نے فوج سے ملنے والے پلاٹ بیچ کر بی بی جی کی نصیحت پر عمل کرنے کو بیٹی کے لیے اعلیٰ تعلیم کے جھمکے خریدنے کا بندوبست کیا۔ مجھے یقین تھا کہ بیوی اسے تربیت کے ہار تو پہنا رہی ہے اور یوں بیٹی رائل ہالووے یونی ورسٹی لندن پڑھنے چلی گئی۔ واپس لوٹی تو قسمت نے ایک ایسے خاندان سے ملوا دیا جن کے پیٹ اور نیتوں کو اللہ کریم نے اپنی رحمتوں اور نعمتوں کی دولت سے لبالب بھر رکھا تھا۔

آج بیٹی کی شادی کی چوتھی سال گرہ ہے۔ ہمیں اس کو دیے گئے جہیز پر مان ہے۔ اس نے اس جہیز کے بل بوتے پر ہی سسرال کے گھر کو خوب صورتی سے سجا رکھا ہے۔ مجھے اکثر اس کو دی گئی اپنی دعائیں اور نصیحتیں یاد آتی ہیں۔ میں نے اس کی رخصتی کے بعد پہلی صبح اٹھ کر اسے لکھ بھیجا تھا:

بیٹا سسرال کے گھر کی پہلی صبح مبارک ہو۔ پروردگار تجھے سسرال کے گھر کے لیے رحمتوں کا وسیلہ بنا دے اور حمزہ کے دل میں تیرے لیے محبتوں اور چاہتوں کے انبار لگا دے۔ تجھے دیے گئے جہیز کے بل بوتے پر میری اللہ سے امید ہے کہ وہ تجھے اتنی فہم وفراست اور سمجھ تو دے گا ہی کہ تم اپنے میاں کے لیے دنیا کی بہترین شریکِ حیات اور سب سے اچھی دوست بن کر رہو اور وہ تمھیں پا کر خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھے اور پھر یہ بھی دعا ہے کہ جتنی محبت تجھے اپنے ماں باپ کے گھر میں ملی، اس سے زیادہ محبت اور عزت تجھے تیرے سسرال میں نصیب ہو۔

میری دھی رانی بس ایک بات اپنے پلے باندھ لینا۔ انا اور ضد اپنے رشتوں کے درمیاں کبھی نہ آنے دینا۔ درگزر تیرا زیور رہے۔ اس گھر کو بھی تم پر ہمیشہ اسی طرح فخر رہے جیسے تم پر ہم ماں باپ کو ہے۔

تم میری عزت ہو۔ میری محبت ہو۔ میری انا ہو۔ میرے سر کا تاج ہو۔ تم میرا غرور ہو۔ اب اس نئے گھر کی عزت محبت اور غرور بن کر دکھاؤ گی تو میں سمجھوں گا میری بیٹی نے میرے دیے ہوئے جہیز کے تمام حق چکا دیے۔

اس دن لکھا تھا کہ آج تیرے بابا کی زندگی کی پہلی صبح ایسی ہے کہ تجھے سوچوں تو مسکراتا ہوں اور تیرے خالی کمرے میں جھانکوں تو اپنے آنسو روکنے کی ناکام کوشش کرتا ہوں۔ اور آج چار سال بعد سمجھ ہی نہیں آتا کہ تجھے سکھی دیکھ کر میں اللہ کے سامنے سجدے میں روتا کیوں ہوں۔

رسمیں، تعزیت اور تیمارداری

آج اپنی آرائیں برادری کے ایک جواں سال شہید محترم اظہر اقبال کی تعزیت کے لیے جمع ہونے والے لوگوں کے رویے دیکھ کر مجھے اپنی بی بی جی کی پرانی نصیحت یاد آ گئی تو اٹھ کر تعزیت کی مروّجہ رسم توڑنے کی جرأت کر ڈالی۔

اپنے خاندان کی غربت کے دنوں میں بھی اپنے میاں جی اور بی بی جی کو جب بھی کہیں کسی شادی والے گھر، کسی بیمار کی تیمارداری یا کسی کی موت پر تعزیت کے لیے جاتے دیکھا تو ان کے ہاتھ میں کپڑے کی پوٹلی ضرور دیکھی اور اس خوشی یا غم کی تقریب کے آخر میں وہ پوٹلی اسی گھر کے کسی فرد کو تھما دی جاتی مگر سمجھ نہیں تھی کہ بی بی جی کا مقصد کیا ہوتا تھا۔ عمر کے جس حصے میں جا کر پوچھنے کی ہمت ہوئی کہ بی بی جی آپ اس پوٹلی میں میت والے گھر میں کیا دیتیں ہیں تو ماں نے بتایا کہ پتر خوشی والے گھر جا کر سب لوگ کچھ نہ کچھ تحفے یا نقد پیسے دیتے ہیں مگر اس تحفے کے اصل حق دار بیماری یا موت والے گھر ہوتے ہیں۔ تم جب بھی کسی بیمار کی تیمارداری کے

لیے یا کسی کی موت پر تعزیت کے لیے جایا کرنا تو اس گھر کے مالی حالات پر غور کرتے ہوئے چپکے سے ان کی کوئی ضرورت پوری کر دیا کرنا کیوں کہ اس سے اچھی تیمارداری ہو ہی نہیں سکتی۔

آپ آج بھی اپنے اردگرد دیکھیے تو ہم سب اپنے کروڑ پتی دوستوں اور رشتہ داروں کی شادیوں میں جا کر لفافے دے رہے ہوتے ہیں مگر اپنے ہی کسی عزیز غریب گھرانے میں تیمارداری یا موت پر تعزیت کے لیے خالی ہاتھ جاتے ہیں بلکہ اس غریب و غمگین گھر میں رسمی تعزیت کے بعد بریانی کھا رہے ہوتے ہیں، بے شک وہ بریانی کہیں سے ادھار پکڑ کر ہی مہیا کی گئی ہو۔

میں اپنی بی بی جی کی یہ نصیحت اپنی برادری کو ضرور سنانا چاہتا ہوں کہ کسی کی شادی یا سال گرہ پر جاتے ہوئے آپ کے پاس بے شک کوئی تحفہ یا لفافہ نہ ہو مگر بیمار کی تیمارداری اور اللہ کو پیارے ہونے والے کی تعزیت کے لیے جائیں تو اپنی حیثیت کے مطابق ایک لفافہ اپنی جیب میں ضرور رکھ کر جایا کریں۔ کیا پتا آپ کے اس لفافے سے اس گھرانے کی کوئی ضرورت پوری ہو جائے اور بقول بی بی جی کے یہی تو اصل تیمارداری اور تعزیت ہے کہ مشکل وقت میں دوسروں کی دل جوئی کے ساتھ ساتھ حسبِ توفیق مالی مدد بھی کی جائے۔

آج اپنی برادری تک یہ پیغام پہنچانے کے لیے میں نے بھری محفل میں سرِعام یہ رسم نبھائی تا کہ کم از کم میری برادری کی نئی نسل کو تحریک ملے کہ زمانے کے مروّجہ رسم و رواج کے علاوہ بھی ہماری کچھ معاشرتی ذمہ داریاں ہیں جو آپ نے ہی نبھانی ہیں۔

بچوں کا بہتر مستقبل

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پڑھنا شروع کیا تو پانچویں جماعت تک ہم گاؤں میں رہتے تھے۔ یہ ۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ میرے بڑے بھائی بھابھی ہر وقت بی بی جی اور میاں جی کو مناتے رہتے تھے کہ ڈھولے والی گوٹھ سے نواب شاہ شہر چلے جانے کی اجازت دے دیں تا کہ بچوں کی بہتر تعلیم کا بندوبست ہو جائے اور ان کا مستقبل بن جائے حالاں کہ شہر تک کا فاصلہ صرف چار کلو میٹر تھا۔ والدین نے بادلِ نخواستہ اجازت دے دی اور بھائی بھابھی کے

ساتھ میں بھی اچھے مستقبل کے خواب لیے شہر آ گیا۔

یہ فاصلہ اتنا کم تھا کہ جب اپنا دل چاہتا یا بی بی جی کا پیغام ملتا، بھاگ کر گاؤں چلے جاتے کہ جو مزے بی بی جی کے ساتھ رہنے میں تھے وہ شہر میں کہاں تھے اور ان کی خوشی بھی اسی میں ہوتی تھی کہ سب ساتھ رہیں۔ وقت گزرتا گیا اور پھر میں نواب شاہ شہر چھوڑ کر ایم بی بی ایس کرنے جام شورو پہنچ گیا۔ دل نہیں چاہتا ہوگا مگر بی بی جی اور میاں جی نے میرے مستقبل کے لیے یہ وچھوڑا بھی سہہ لیا۔ نواب شاہ سے تو دو چار دن بعد ہی گاؤں چلا جاتا تھا مگر اب جام شورو سے تو مہینے میں ایک دفعہ ہی گاؤں جاتا تھا۔ جب بھی گھر جاتا، بی بی جی خوب پیار کرتیں۔ آنکھوں میں آنسو لیے کہتیں کہ بیٹا دل نہیں چاہتا کہ تو اتنا دور رہے مگر میں اچھے مستقبل کی دُھن میں واپس آ جاتا۔

وقت تیزی سے گزرا۔ میں ڈاکٹر بن گیا اور مزید اچھے مستقبل کی خاطر ۱۹۸۳ء میں فوج میں چلا گیا۔ اب بی بی جی میاں جی سے ملنے تین چار مہینوں بعد جانے لگا۔ وہ بیمار ہو جاتے تو بیٹے کے ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی پرائے ڈاکٹروں سے دوائی لینے جاتے تھے میں تو ان کے کسی کام کا نہیں رہا تھا کیوں کہ کوسوں دور پوسٹنگ ہوتی تھی۔ اب تو میاں جی نے بھی شہر میں گھر بنا لیا تھا اور گاؤں سے شہر آ گئے تھے کیوں کہ وہ بچوں کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔

۱۹۹۰ء میری شادی ہوئی تو گھر میں ایک لیڈی ڈاکٹر کا اضافہ ہو گیا مگر پھر بھی کوئی فرق نہ پڑا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ ایک سال بعد ہی مجھے عراق کویت جنگ میں جانا پڑ گیا۔ سترہ دن کے بیٹے اور بیوی کو نواب شاہ والدین کے پاس چھوڑ دیا۔ بی بی جی کی تو جیسے عید ہو گئی ہو کیوں کہ گھر میں مزید رونق جو ہو گئی تھی۔

عراق جنگ سے واپس آیا تو پوسٹنگ سیاچن ہو گئی۔ سیاچن سے واپس آتے آتے بیٹا اڑھائی سال کا ہو چکا تھا اور اس کو اسکول میں داخل کروانا تھا۔ اب ہم نے بی بی جی کو راضی کرنا شروع کیا کہ ہم کراچی شفٹ ہو جاتے ہیں کہ وہاں بچوں کی بہتر تعلیم ہوگی اور ان کا بہتر مستقبل بن جائے گا۔ بی بی جی نے مجھے بہت سمجھایا کہ دیکھو پتر میں نے گوٹھ میں رہ کر تجھے ڈاکٹر بھی بنا لیا اور تو فوجی افسر بھی بن گیا ہے۔ اب تو ہم شہر میں بھی رہتے ہیں تو بچوں کی تعلیم کی کیا فکر،

لیکن ہم دونوں میاں بیوی کو اپنے بیٹے کے مستقبل کی فکر نواب شاہ سے کراچی لے آئی مگر خیال یہ رکھا کہ ہر مہینے نواب شاہ ملنے ضرور جاتے یا پھر بی جی اور میاں جی کو اپنے پاس لے آتے۔

بچوں کو کراچی میں اے لیول کروا کر مزید تعلیم کے لیے لندن بھیج دیا کہ بس ان کا مستقبل اچھا بن جائے۔ تعلیم مکمل ہوئی۔ کراچی میں خوب صورت گھر بنایا۔ بیٹی اور بیٹے کی شادیاں کر دیں اور سوچا کہ چلو اب ریٹائرمنٹ کی زندگی مزے سے گزاریں گے اور پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کے ساتھ کھیلا کریں گے۔

شکر ہے کہ بیٹی نے لندن کی مشکل زندگی دیکھ کر مزے سے کراچی کی زندگی کو اپنا لیا اور فی الحال اپنے بچوں کے فیوچر کی فکر نہیں کرتی۔ مگر شادی کے ایک سال بعد ہی بیٹے اور بہو نے کینیڈا ایمیگریشن لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے جب اتنا نوازا ہے تو کیوں یہاں آرام کی زندگی نہیں گزارتے۔ سب کچھ تو ہے پھر کیا ضرورت ہے پرائے دیس جانے کی، لیکن دہائیوں سے گونجتا ہر گھر میں بولا جانے والا وہی اپنا سا جواب ملا کہ بابا ہم اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے یہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہاں ہر چیز کراچی اور پاکستان سے بہتر ہے۔ میں نے بھی اسی طرح آرام سے ان کو اجازت دے دی جس طرح بی بی جی اور میاں جی نے ہمیں ہمارے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے نواب شاہ سے کراچی شفٹ ہونے کی اجازت دی تھی۔ مگر سوچتا ہوں اب تو کئی سالوں بعد ہی آنا جانا ہوگا۔

سنا ہے خلا میں دنیا بسائی جا رہی ہے۔ شاید میں اس وقت تک زندہ نہ رہوں اور تیس سال بعد موجود نہ ہوں، جب میرا پوتا اپنے باپ سے اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے کینیڈا سے خلا میں شفٹ ہونے کی اجازت مانگ رہا ہوگا۔ آخر اسے بھی تو اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کی فکر لاحق ہونا قدرتی سی بات ہوگی۔

اور یہ تو اب گھر گھر کی کہانی ہے کہ نکل چلو کسی مزید بہتر جگہ اپنے بچوں کا بہتر مستقبل بنانے کو۔ بے شک پیچھے ہر گھر میں کوئی اکیلے بی بی جی اور میاں جی اپنے نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں کے ساتھ کھیلنے کے ادھورے خواب لیے دنیا سے ہی کوچ کیوں نہ کر جائیں۔

بچوں کا حوصلہ بڑھائیے

ایک دن نوشہرو فیروز کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی دو بچیاں میرے آفس مجھ سے ملنے آئیں۔ انھوں نے کراچی میں اپنے فوجی ریٹائرڈ صوبے دار ماموں کے گھر میں رہ کر پڑھنا شروع کیا اور ڈاکٹر بننے کی خواہش میں سائنس کے مضامین رکھے۔ انٹرمیڈیٹ اے گریڈ سے پاس بھی کرلیا مگر این ٹی ایس انٹری ٹیسٹ میں طریقۂ کار نہ سمجھنے کی وجہ سے کچھ فی صد نمبروں سے پیچھے رہ گئیں اور میڈیکل کالج میں داخلے کی امید ٹوٹ گئی۔ ان کا فوجی ماموں مجھے جانتا تھا اور بچیوں کو مجھ سے ملوانے میرے آفس لے آیا کہ شاید میں ان کی کوئی مدد کر سکوں یا رہنمائی ہی کردوں کہ اب انھیں کیا کرنا چاہیے۔

بچیوں سے بات شروع ہوئی تو لگتا تھا وہ مشورہ کرنے نہیں بلکہ میرے پاس بیٹھ کر دکھڑے رونے آئی ہیں تاکہ معاشرے سے، اس گلے سڑے سسکتے تعلیمی نظام سے اور پروردگار کے بنائے اپنے نصیبوں سے جو گلے شکوے ہیں، وہ آنسوؤں سے دھل دھلا جائیں۔ میں نے بھی انھیں رونے سے بالکل نہ روکا کہ چلیں ان کا دل ہلکا ہوجائے تو بات کرتے ہیں۔

کہنے لگیں انکل ہمیں آرمی میڈیکل کالج سے پڑھ کر فوجی ڈاکٹر بننا ہے، ہماری مدد بھی کریں اور رہنمائی بھی۔ صرف فوجی ڈاکٹر ہی بننے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگیں، ابو نہیں ہیں، بہت پہلے وفات پاگئے۔ امی محنت مزدوری کرتی ہیں اور آگے پڑھا نہیں سکتیں۔ اب مزید پڑھنے کے لیے ماموں پر بوجھ نہیں بننا چاہتیں۔ سنا ہے، آرمی میڈیکل کالج میں میڈیکل کیڈٹ کو مفت تعلیم کے ساتھ وظیفہ بھی ملتا ہے اور ایم بی بی ایس کرنے کے بعد فوج میں کمیشن پکا ہوتا ہے۔ کیا ہماری قسمت ایسی نہیں ہوسکتی؟ میں نے کہا، بیٹا سب ممکن ہے۔ قسمت کو الزام دینے سے کہیں بہتر ہے کہ اپنی قابلیت اور اللہ کی رحمت پر بھروسا رکھو۔ تم آرمی میڈیکل کالج کا ٹیسٹ دو مگر خوب تیاری کرکے۔ این ٹی ایس انٹری ٹیسٹ اگلے سال دوبارہ دو اور کبھی امید کا دامن نہ چھوڑو۔ میں نے ان کو ڈاکٹری کے علاوہ کچھ اور مضامین بھی بتائے کہ یہ بھی لے سکتی

ہو۔ کہنے لگیں، انکل کوئی ایسے مضامین بتا دیں جن کو پڑھنے کے لیے فیس نہ دینی پڑے۔ میں ان کا منہ دیکھتا رہ گیا کہ اب کیا مشورہ دوں۔

دونوں بچیاں اپنی غربت سے اتنی گھبرائی ہوئی تھیں، نا امیدی اتنی غالب تھی کہ دونوں کے باجماعت آنسو دوبارہ گرنے لگے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ چلو چائے پیتے ہیں۔ چائے آئی تو میں نے کہا، بیٹا بچپن میں ایک دفعہ اسی طرح نا امید ہو کر میں بھی بہت رویا تھا تو مجھے ائیر فورس کے ایک آفیسر نے کامیابی اور امید کا راستہ دکھایا تھا۔ شاید میری بات سن کر تمھیں بھی اسی طرح امید کی کوئی کرن آسمان کی طرف لے اڑے۔

تمھاری طرح میں بھی ایک چھوٹے سے گاؤں سے ہوں۔ تمھاری طرح میں بھی پڑھنے میں بہت اچھا تھا۔ تمھاری طرح میرے پاس بھی تعلیمی اخراجات کی کمی تھی۔ تمھاری طرح میں بھی کوئی راستہ سوچا کرتا تھا کہ بنا فیس کے پڑھ لکھ کر کچھ بن جاؤں۔ میں نے ۱۹۷۳ء میں میٹرک بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ ان دنوں پی اے ایف کالج سرگودھا کی بڑی دھوم ہوتی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ اگر وہاں داخلہ ہو جائے تو انٹرمیڈیٹ کے بعد ائیر فورس میں کمیشن تو مل ہی جاتا ہے اور آپ بیس سال کی عمر میں پائلٹ آفیسر بھی بن سکتے ہیں۔

میں اپنے دو دوستوں وحید اعوان اور عالمگیر فرحت اللہ کے ساتھ اس کالج کا ٹیسٹ دینے کراچی پہنچا۔ رات رہنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ ہم نے بندر روڈ کے ساتھ ایک پارک میں رات گزاری اور صبح پی اے ایف کے ایک کالج پہنچے جو آج کل فیصل بیس کہلاتا ہے۔ ہال میں بیٹھے تو اعلان ہوا کہ صرف انگلش میڈیم میں میٹرک کرنے والے بچے یہ ٹیسٹ دے سکتے ہیں، باقی ہال سے باہر چلے جائیں۔ یہ سن کر تو ہم پر جیسے بم گرا۔ میرے دونوں ساتھی چپ چاپ اٹھ کر باہر چلے گئے مگر میں بیٹھا رہا۔ انگلش، فزکس اور میتھ میٹکس کے پیپر تھے۔ میں انگلش اردو ملا کر پیپر کرتا رہا اور پیپر دے کر باہر آ گیا۔ پندرہ دن بعد رزلٹ لگا تو کراچی سینٹر سے صرف اکیس بچے پاس ہوئے۔ میں لسٹ دیکھ کر گم سم کھڑا تھا۔ بار بار لسٹ دیکھتا۔ ساتھ کھڑے لوگوں سے اپنا نام پڑھواتا اور پھر ولدیت بھی پوچھتا، واقعی میرا نام پہلے نمبر پر تھا۔ واپسی تک خوشی اور حیرت کے بہتے آنسو کئی دفعہ صاف کیے۔ آنکھیں بند کرتا تو لگتا میں انڈیا کی طرف

فائٹر جہاز اڑا رہا ہوں۔ دل ہی دل میں اللہ اکبر کے نعرے لگا تا رہا۔ چکرہ بازار نواب شاہ سے لڈو خریدے اور اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ بی بی جی نے پانچ سو دفعہ میرا منہ چوما ہوگا۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ میں پائلٹ بن گیا ہوں۔

بچیاں میری باتیں ایسے سن رہی تھیں جیسے میں ان کو پریوں کی کہانی سنا رہا ہوں۔ تین دن کے بعد میں میڈیکل فٹنس ٹیسٹ کے لیے دوبارہ کراچی آیا۔ ائیرفورس بھرتی دفتر صدر میں ہوتا تھا۔ وردی میں ملبوس ائیرفورس کے ڈاکٹر نے میرا طبی معائنہ شروع کیا۔ وزن، قد، چھاتی، اور نظر چیک کی اور پھر آخر میں میرے سامنے ایک رنگین کتاب رکھی کہ ہندسے پڑھتے جاؤ۔ میں نے دو چار صفحے پڑھ لیے تو اگلے صفحے پر مجھے صرف رنگ نظر آ رہے تھے کوئی ہندسہ نہیں۔ ڈاکٹر نے کچھ اور صفحے الٹے اور کہنے لگے کہ بچے آپ ریڈ گرین کلر بلائنڈ ہو، اس لیے ائیرفورس کے لیے ان فٹ ہو۔ میرا جواب سنے بغیر ڈاکٹر نے میرے فارم پر ان فٹ لکھا اور فارم مجھے تھما دیا۔

یوں لگا جیسے میری دنیا ہی لٹ گئی ہو۔ میں نے کہا، سر ٹیسٹ میں سب سے زیادہ نمبر میرے ہیں۔ مجھے کیوں ان فٹ کر رہے ہیں؟ میں نے ضد کی تو انھوں نے ڈانٹ کر باہر نکال دیا۔ میں بلک بلک کر رو دیا۔ وہاں سے ایک اور آفیسر گزرا۔ اس نے مجھے روتا دیکھا تو ہاتھ پکڑ کر اپنے آفس میں لے گیا۔ پانی پلایا، پوری بات سنی اور اٹھ کر مجھے پیار سے کہنے لگے لگا کہ بیٹا تم کبھی جہاز نہیں اڑا سکتے کیوں کہ قدرتی طور پر تمھاری آنکھوں میں سگنلز کے رنگوں کی پہچان میں دھوکا کھانے کا امکان ہے۔ میں نے روتے ہوئے کہا کہ سر میں ٹیسٹ میں پہلے نمبر پر ہوں اور آپ لوگ مجھے ان فٹ کر رہے ہیں۔ کہنے لگا، بیٹا اتنا قابل بچہ ایک ناکامی پر روتا اچھا نہیں لگتا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور بھرتی دفتر کے باہر والے گیٹ پر لے آیا اور کہا، تم ہمارے ان تین کمروں کے دفتر سے ان فٹ ہوئے ہو۔ باہر دیکھو کتنی بڑی دنیا تمھارا انتظار کر رہی ہے۔ اپنی محنت قابلیت اور اللہ کی ذات پر بھروسا رکھو۔ تم ہر جگہ سے تو ان فٹ نہیں ہوئے۔ چلو آنسو صاف کرو اور بھاگ جاؤ۔ کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی کامیابی تمھارا انتظار کر رہی ہے۔

میں نے اس کی باتیں سن کر آنسو صاف کر لیے۔ واپس گاؤں آ گیا۔ ناکامی کو بھلا

دیا۔ سائنس سے انٹرمیڈیٹ کیا۔ ایم بی بی ایس کیا۔ آرمی کا ٹیسٹ دیا۔ کلر بلائنڈ ٹیسٹ آرمی میڈکل کور پر لاگو نہیں ہوتا تھا۔ سلیکٹ ہوگیا۔ کیپٹن کی وردی پہن لی اور پھر ایک دن بریگیڈیئر بن گیا۔ خوداعتمادی، محنت اور اللہ کی ذات پر بھروسا انسان کو بن پروں کے اڑنا سکھا دیتا ہے۔ کہانی سنا کر میں نے ان بچیوں کو ساتھ لیا۔ اپنے دفتر سے باہر لاکر اسی طرح اللہ کی دنیا دکھائی اور کہا کہ بیٹا تمھاری فیس کی ضرورت تو میں پوری کر دوں گا بس تم کبھی ہمت نہ ہارنا۔ بے شک کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی کامیابی تمھارا ابھی انتظار کر رہی ہے۔

میں نے اڑتالیس سال پہلے اس مہربان آفیسر کے الفاظ دُہرا کر ان بچیوں کو آنسو صاف کرنے کی تلقین کی اور محبت سے رخصت کر دیا کہ ایک کوشش پھر کر دیکھو۔

ایک جلسہ نواب شاہ میں

نواب شاہ میں انجمن آرائیاں کا سالانہ اجلاس تھا اور اسٹیج پر بلانے کے لیے مجھ ناچیز کا نام پکارا گیا— بریگیڈیئر بشیر آرائیں، چانسلر اتحاد یونی ورسٹی۔

میں نے اپنی نشست سے اسٹیج پر جانے تک نواب شاہ میں اپنے بچپن کے گزرے دنوں، مہینوں اور سالوں کو سیکنڈ میں دیکھ لیا۔

یخ سردیوں کا موسم ہوتا تھا۔ ڈھولے والی گوٹھ سانگھڑ روڈ سے چار کلومیٹر پیدل چل کر اردو پرائمری مین اسکول سکرنڈ روڈ کے ٹوٹے پھوٹے کلاس روم میں پھٹے پرانے ٹاٹ پر آ بیٹھنے تک کے سفر کا سوچ کر ہی جسم چور چور ہوگیا اور بڑی مشکل سے اسٹیج پر چڑھ پایا۔ اسٹیج پر تقریر کرنی تھی، اپنی زندگی کی کامیابیوں پر۔

کوئی بھی مشکل کام کرنا پڑے تو بی بی جی بہت یاد آتیں ہیں جن کی کچھ نصیحتوں اور زیادہ تر ڈانٹ نے مجھ جیسے عام سے بچے کو کچے پکے اسکول کے ٹاٹ سے پکڑ کر بریگیڈیئر بننے کی راہ دکھائی۔ بی بی جی تعلیم کے زیور سے محروم تھیں۔ خود تو کبھی اسکول نہ گئیں مگر ہم بہن بھائیوں کو صرف تعلیم حاصل کرنے کے درس دیتی رہیں اور اپنی تکلیفوں کا کبھی خیال نہ کیا۔

میاں جی کو کبھی احساس بھی نہ ہونے دیا کہ تنگ دستی میں بچوں کو پڑھانا کتنا کٹھن کام ہوتا ہے۔

بے سروسامانی کے دنوں میں جب یونی ورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے کے وسائل نہ تھے اور میں گھبراتا تھا کہ سب کیسے ہوگا، فیس کیسے پوری ہوگی تو بی بی جی زور سے ہنستیں اور کہتیں:

''پتر ہمت کر کے اک واری پڑھ جا فیر توں اپنی یونی ورسٹی بنا لئیں تے لوکاں دے بچیاں نوں فیس نئیں دینی پئے گی۔''

سوچتا ہوں نہ جانے بی بی جی یہ سب مجھ سے کہتی تھیں یا خداوندِ کریم سے دعا مانگتی تھیں کہ ان کا کہا اور سوچا سب سچ ہو رہا ہے۔

جس شہر کی گلیوں میں گلے میں بستہ ڈالے ہاتھ میں تختی لیے ٹھٹھرتا ہوا اسکول جاتا تھا اسی شہر کے معززین کے درمیان اتحاد یونی ورسٹی کے قیام کا اعلان کر رہا ہوں اور پانچ دہائیوں پہلے اپنی حسرتوں کو یاد کر کے اپنے ہی جیسے آج کے بچوں سے مخاطب ہوں کہ یہ یونی ورسٹی آپ کے لیے بنا رہا ہوں۔

بی بی جی تو نے جو یونی ورسٹی بنانے کا کہہ کر دوسرے بچوں سے فیس نہ لینے کے خواب دکھائے تھے، اب آ کر دیکھ تو سہی تیرا کہا سب حقیقت میں ڈھل رہا ہے۔ بتا تو جا اپنے پتر کو کہ اب کس کس بی بی کے بچوں سے فیس نہیں لینی۔

بی بی جی تجھ سے وعدہ ہے میرا کہ تیرے نام پر تیرے جیسی ماؤں کے بچے یونی ورسٹی میں پڑھیں گے بھی اور ان کو فیس بھی نہیں دینی پڑے گی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دسمبر کی یخ سردیوں میں صبح سویرے اسکول جاتے وقت بی بی جی کچھ پڑھ کر پھونکتیں اور کہتیں چل پتر ہُن ٹھنڈ نئیں لگے گی اور میں پورے اعتماد سے سردی نہ لگنے کے یقین کے ساتھ اسکول کی طرف بھاگتا تھا۔ نہ جانے سردی کیوں نہیں لگتی تھی۔ دوسرے بچوں کو موٹے سوئیٹرز میں سردی سے کانپتے دیکھ کر سوچتا کہ ان کی بی بی جی پڑھ کر کیوں نہیں پھونکیں مارتیں تا کہ ان کو بھی سردی نہ لگے۔

مگر بی بی جی کی یہ منطق اب بخوبی سمجھ آتی ہے تو ہونٹوں پر مسکراہٹ کے ساتھ آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور سوچتا ہوں کہ وہ کیسی پھونکیں مارتی تھیں۔ کتنی طاقت تھی بی بی جی کی

پھونکوں میں کہ یقین آ جاتا تھا کہ اب سردی لگ ہی نہیں سکتی۔

برادری کے جلسے کے بعد ساری رات بی بی جی کو یاد کرنے میں گزر گئی۔ دل چاہتا تھا کہ وہ کہیں سے آواز دے۔ کہیں سے ڈانٹ دے مگر کیا کروں وقت نکل گیا وہ۔ صبح ہوتے ہی ماں کی قبر پر کھڑے ہو کر دُہائی دے رہا ہوں کہ اٹھ بی بی جی کچھ پھونکیں اور مار جا۔ تیری پھونکوں کے بغیر اتحاد یونی ورسٹی کو کیسے چلا پاؤں گا۔

چاند رات ۲۰۲۲ء

بی بی جی کے ساتھ آخری چاند رات ۲۰۰۴ء میں منائی تھی۔ میں ان دنوں آرمڈ فورسز پوسٹ گریجویٹ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ راول پنڈی میں ہاسپٹل مینجمنٹ میں ماسٹر ڈگری کر رہا تھا اور بیگم بچے کراچی میں تھے۔ رمضان کے آخری عشرے میں بی بی جی کا فون آیا کہ سب نے عید نواب شاہ کرنی ہے۔ کہنے لگیں، پتر بچوں کو لے کر تم ایک دن پہلے ہی آ جانا۔ دل چاہتا ہے میرے نواسے نواسیاں، پوتے پوتیاں سب چاند رات کو اکٹھے ہو جائیں۔ اس دفعہ عید پر کھیر اور سویاں خود بنانے کو دل چاہ رہا ہے۔ بچیاں مل کر مہندی لگا رہی ہوتیں ہیں تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ پتا نہیں اگلی چاند رات دیکھنا نصیب ہو گی بھی کہ نہیں۔

بی بی جی کا حکم کیا، ہم تو ان کی خواہش پر بھی مر مٹتے تھے۔ اپنے شہر کے کیا ہی مزے تھے۔ پتا نہیں نواب شاہ پہنچتے ہی میں کتنے رشتوں میں بندھ جاتا تھا۔ پُتر، دیور، جیٹھ، چاچا، تایا، ماموں، پھوپھا نہ جانے کیا کیا آوازیں آنے لگتی تھیں۔ نواب شاہ پہنچے ہی تھے کہ بچیوں نے عیدی چاند رات کو ہی مانگنا شروع کر دی۔ ان کو تو لیاقت مارکیٹ کی رونقوں میں چوڑیاں خریدنے جانا تھا۔ بی بی جی نے چکرہ بازار کی مٹھائی کے بہت سارے ڈبے منگوا رکھے تھے اور ان رشتے داروں کے گھروں میں بھی بھیج رہی تھیں جو کسی وجہ سے ناراض تھے۔ کہنے لگیں، پُتر چاند رات کو سب سے ناراضی ختم کر لینی چاہیے تا کہ صبح عید کی نماز پڑھ کر سب کو گلے لگایا جا سکے۔

نواب شاہ شہر کے بازار کا میں بھی چکر لگا کر آیا تھا۔ عید صبح تھی مگر خوشیاں ہر طرف چاند رات کو ہی بکھری پڑی تھیں۔ ہم سب بھی رات دیر تک جاگے تھے۔ عید کے کپڑے استری ہو رہے تھے۔ بچیاں مہندی لگا رہی تھیں۔ بھابھیاں عید کے کھانوں کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں اور میں بی بی جی کے پاؤں دباتے ہوئے ان سے باتیں کر رہا تھا۔ پتا تب چلا جب وہ گہری نیند سو چکی تھیں۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ بی بی جی اس سارے ماحول سے اتنا خوش تھیں کہ سوتے میں بھی ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور پھر ان کے جانے کے بعد ہم ان مسکراہٹوں کو ترس گئے۔ اب چاند رات آئے تو ہم بی بی جی کی نصیحت پر عمل کرتے، روٹھوں کو مناتے ہیں اور کڑوے دوستوں اور رشتے داروں کو مٹھائیاں بھجواتے ہیں یا لے کر خود پہنچ جاتے ہیں۔

آج بھی ۲۰۲۲ء کی یادگار چاند رات ہے۔ ہمارے قومی لیڈران نے بھی قوم کو بی بی جی کی طرح حکم دیا ہے کہ بیگم بچوں کو ساتھ لے کر چاند رات کو پہنچو، مگر نہ مہندی لگانی ہے، نہ بچیوں کی چوڑیاں خریدنی ہیں، نہ مٹھائیوں کے ڈبے رشتہ داروں کے گھر بھیجنے ہیں، نہ روٹھوں کو منانا ہے۔ بہو بیٹیوں نے سویاں اور کھیر بھی نہیں بنانی۔ بس سب نے بازاروں اور چوراہوں پر نفرت بھرے مردہ باد اور زندہ باد کے نعرے لگانے ہیں۔ ایک دوسرے کو چور چور، غدار غدار کہنا ہے اور جواب میں دوسری طرف سے نعرے لگانے والوں کو زانی، یہودی ایجنٹ اور ذہنی مریض کہنا ہے۔ ایک دوسرے کو سازشی اور غداری کے طعنے اور فوج اور ججوں کو گالیاں بھی دینی ہیں۔

مسلمان ہونے کے ناتے آپ نے ہاتھوں میں وضو اور استنجے کے لیے لوٹے بھی رکھنے ہیں۔ کسی کے گھر کی دیوار پر یہ لکھنے کا بھی اختیار ہے کہ اس گھر میں بچوں کا رشتہ نہ کریں کیوں کہ یہ چور اور ملک کے غدار ہیں۔ کسی غریب کی جھونپڑی نظر آ جائے تو اس پر بھٹو زندہ ہے والا بینر ڈال سکتے ہیں۔ پولیس پر پتھراؤ اور بے ہودہ الفاظ میں، گندی زبان میں، تقریروں میں ایک دوسرے کو مرنے مارنے کی دھمکیاں دینا بھی چاند رات کے پیکیج میں شامل ہے۔ ایک دوسرے کے نام بھی بگاڑ کر پکارنا ہے اور ناسمجھ لوگوں کو خودسوزی پر آمادہ کرنے کی تگ و دو کرنی ہے۔

جب ساری قوم چاند رات کی اس ولولہ انگیز تقریب سے تھک جائے تو اپنے پسندیدہ

سیاسی لیڈر کے لیے دعاے خیر اور دوسروں کے لیڈر پر لعنت بھیج کر اپنے گھروں کو واپس جا کر لمبی تان کر سونا ہے۔ نمازِ عید اور خطبے کی ذمہ داری امامِ مسجد کی ہے۔ تھکاوٹ کی وجہ سے نمازِ عید پڑھنے اور لوگوں کو گلے ملنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ عید کے دن نہ کسی کے گھر جانا ہے نہ کسی کو بلانا ہے۔ دوپہر کو جیسے ہی آپ کی آنکھ کھلے، اپنے اپنے موبائل فون سے ایک دوسرے کے سیاسی لیڈروں کے بارے میں غلیظ گالیوں والے میسج بھیجنے شروع کرنے ہیں۔ گالیوں والا میسج پڑھ کر غصہ آجائے تو دوستوں اور رشتہ داروں کو بھی بلاک کرتے جائیں۔ یہ سب کر کے چاندرات اور عید کی خوشیاں دوبالا ہو جائیں گی۔

اپنے سیاسی لیڈروں کے یہ سارے مطالبے سن کر میرا بہت دل چاہتا ہے کہ اپنے شہر نواب شاہ جا کر حاجی نصیر قبرستان میں چاندرات مناؤں اور بی بی جی کی قبر پر دُہائی دوں کہ ماں جی ہمیں کس جہنم میں چھوڑ کر قبر میں جا سوئی ہیں۔ اگر اللہ آپ کی سنتا ہے تو ہماری سفارش کر دیں کہ یا تو ان متکبرانا پرست، چوراچکے سیاسی لیڈروں سے ہماری جان چھڑا دے یا اس عاقبت نااندیش قوم کو عقل وشعور دے تاکہ ہم خانہ جنگی کی آگ میں جھلس کر نہ مر جائیں جس کا امکان ہر روز بڑھ جاتا ہے۔

کاش بی بی جی کو بتا سکوں کہ چاندرات کو محبتیں بانٹنے کی جو نصیحتیں آپ کرتی تھیں، یہاں تو سب اُس کا الٹ ہو رہا ہے، مگر ہمارا تو دوسروں کے خلاف نفرت بھرے نعرے لگانے کو دل بالکل بھی نہیں مان رہا۔

اک کسک

انسان زندگی گزارنے کے طور طریقے کتابوں سے کم اور ذاتی تجربوں سے زیادہ سیکھتا ہے۔ بہت کم خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کے تجربوں کے نتیجے یا اپنے بڑوں کی نصیحتوں کو اپنا کر اپنی زندگی آسان کر لیتے ہیں ورنہ تو ہوش تب آتا ہے جب خود پر پڑتی ہے۔

عمر کی چھٹی ساتویں دہائی نے بہت سکھایا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھوں تو پتا چلتا ہے کہاں کیا

کرنا تھا۔ کہاں کیا نہیں کرنا تھا۔ اب بی بی جی اور میاں جی زیادہ یاد آنے لگے ہیں۔ خود سے سرزد ہوئی غلطیاں بہت ستاتی ہیں۔ ان کو کہاں کب کس طرح ناراض کیا ہوگا، یہ خیال بہت دکھی کرتا ہے۔ وہ مجھ ناچیز کی غلطیوں سے کس طرح درگزر کرتے ہوں گے، اب احساس ہوتا ہے اور اب میں انھی کے نقشِ قدم پر چلتے اپنے بچوں، رشتہ داروں اور دوستوں کے ساتھ معاملات طے کرتا رہتا ہوں۔

مجھے پتا ہی نہیں کہ بی بی جی اور میاں جی نے کس کس موقعے پر کھلے دل سے سیکڑوں دفعہ میری کوتاہیوں کو درگزر کر کے مجھے گلے لگایا ہوگا۔ اس وقت احساس نہ تھا مگر اب سوچ کر ہی دل ڈوبنے لگتا ہے۔ عقل آئی تو نہ بی بی جی رہیں نہ میاں جی۔ اب ان کی کمی بہت رلاتی ہے۔ ان سے کس طرح پیش آنا تھا، دھیمے لہجے میں بات کرنی تھی، کس طرح ان کی خدمت بجا لانی تھی اور کس طرح مفت کی جنت کمانی تھی، بہت دیر سے سیکھا۔ اس وقت جو کر پایا اس میں ہزار کمیاں تھیں۔ اب اکیلے بیٹھ کر سوچتا رہتا ہوں کہ یہ کرنا چاہیے تھا، یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔

مجھے یہاں تک پہنچانے میں جو تکلیفیں انھوں نے اٹھائی ہوں گی، تصور کرتا ہوں تو نہ جانے آنکھوں میں کہاں سے نیم گرم بھاپ آ کر سارے منظر دھندلے کر دیتی ہے۔

ان کی دعاؤں سے زندگی میں خداوندِ کریم کی کرم نوازیاں بڑھ رہی ہیں اور بی بی جی اور میاں جی کی یادیں اسی تیزی سے سینہ چیرتی ہوئی آنکھوں سے باہر بہتی رہتی ہیں۔ شاید کہیں نہ کہیں یہ خلش شدید ہے کہ زندگی کی یہ آسائشیں ان کے لیے مہیا کر سکتا۔ ان کی کچھ مزید خدمت کر پاتا۔ پر ایک اطمینان ہے کہ میرے رب نے ان کو اپنے بہت قریب کسی ٹھنڈی جگہ پر بٹھا رکھا ہوگا۔ یہ تو ایمان ہے میرا کہ وہ جنت کی وادیوں میں ان دنیاوی آسائشوں سے کہیں بہتر سہولتوں میں ہوں گے اور ان کی ان سنی ان دیکھی دعائیں مجھے اب بھی لگ رہی ہیں ورنہ میری ایسی اوقات کہاں۔

میں اب یہ کرتا ہوں کہ جب بھی اردگرد اپنے سنگی ساتھیوں کے ماں باپ سے ملتا ہوں تو ان سے ایسے عزت اور تکریم سے پیش آتا ہوں جیسے یہ میرے بی بی جی اور میاں جی ہوں۔ اشاروں کنایوں میں اپنے سنگیوں کو باور کرانے کی سعی بھی کرتا رہتا ہوں کہ بھائیو یہی وقت

ہے، خدمت کرلو ماں باپ کی ورنہ میری طرح کے ہو جاؤ گے کہ صرف ان کی یادیں ہوں گی اور اپنے پچھتاوے۔

پھر میں سر پرست اعلیٰ بن گیا

میں شکر گزار ہوں ربِ کریم کا کہ سندھ کی پوری آرائیں برادری مجھ پر مہربان ہے اور مجھے اپنا سر پرستِ اعلیٰ چن کر اتنی عزت بخشی ہے۔ میں خوش ہونے سے کہیں زیادہ فکر مند ہوں کہ برادری کے بڑوں نے جو ذمہ داری مجھے دی ہے، کیا مجھ میں اتنی قابلیت ہے کہ اسے میں خوش اسلوبی سے نبھا پاؤں۔ لمحہ لمحہ دعا کرتا ہوں کہ نبھا پاؤں۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کی اتنی لمبی اننگ کھیل کر جو تجربہ یا حیثیت پائی ہے اس سے اپنی برادری کی خدمت کروں۔ مجھے لوگ میری بہت سی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ جانتے ہیں۔ میری تمام خوبیاں میرے ماں باپ اور خاندان کے بڑوں کی مرہونِ منت ہیں جنھوں نے محنت مزدوری کر کے ایک چھوٹی سی گوٹھ (گاؤں) میں میری ایسی تربیت کی تھی کہ پہلے ڈاکٹر بنا اور پھر پاک فوج میں بریگیڈیئر کے عہدے تک ترقی پائی۔

اپنی بی بی جی اور میاں جی کی محنتوں کا سوچ کر میری یہ شدید خواہش ہے کہ ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے میں اپنی برادری کے لیے خصوصی طور پر اور خلقِ خدا کے لیے عمومی طور پر خاندانی روایات اور باہمی محبتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے لیے کام کروں۔ نئی نسل کی تعلیم تربیت کو دوبارہ انھی خطوط پر لاؤں جو مجھے بی بی جی اور میاں جی سے ورثے میں ملیں۔

حقیقت میں اپنے والدین کے مقابلے میں ہمارے پاس وسائل زیادہ ہیں اور تعلیم بھی زیادہ ہے۔ ہم اتنے دور اندیش اور عقل مند نہ سہی مگر دل تو چاہتا ہے کہ آرائیں برادری کے علاوہ بھی ہر برادری کی نئی نسل کی تربیت کے لیے کچھ ایسا انتظام کر سکوں کہ بزرگ ہونے کی حیثیت سے اپنے کیے پہ خوشی تو ہو۔

سچ پوچھیں تو میں اس پیڑھی سے ہوں جس نے والدین کے علاوہ چاچاؤں، ماموؤں،

خالاؤں، پھوپھیوں حتیٰ کہ بڑے بہن بھائیوں سے بھی ماریں کھائی ہیں۔ میاں جی کے دوستوں کی جھڑکیاں بھی اب تک یاد ہیں مگر اس چکی میں پسنے کے بعد نتیجہ آپ کے سامنے ہے کہ برادری نے مجھے اپنا سرپرستِ اعلیٰ چنا ہے۔

دوسری طرف اب تو ماں باپ بھی اپنے بچوں کو ڈانٹنے سے ڈرتے ہیں۔ ہمیں ڈانٹ پڑتی تھی تو ہم ڈر کے مارے کمرے سے باہر نہیں آتے تھے۔ آج بچوں کو ڈانٹ پڑے تو وہ ماں باپ کو گھر چھوڑ جانے کی دھمکی دیتے ہیں۔

اگر میں اپنے ماں باپ کا موازنہ خود سے کروں تو خود کو بہت قصوروار سمجھتا ہوں۔ اب ہم خاندانی رنجشوں، اختلافات، باہمی چپقلشوں، چھوٹے چھوٹے بے کار کے جھگڑوں کو بھی خوب اچھی طرح پالتے ہیں اور ہمارے بچے یہ سب دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ہم نے معاف کرنا، درگزر کرنا، رشتے نبھانا اور دوسروں کو منانا چھوڑ دیا ہے۔ ناسمجھوں اور بھٹکوں کو بھی گلے لگانا چھوڑ دیا ہے۔ ہمارے ماں باپ ہماری بڑی بڑی کوتاہیوں سے درگزر کرتے تھے۔ ہمیں ویسے ہی ماں باپ جیسا کردار ادا کرنا ہے تاکہ ہم نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ بن سکیں۔

مرنے سے پہلے سچ میں یہ سب کچھ دیکھنا چاہتا ہوں اور سرپرستِ اعلیٰ کی حیثیت سے مجھے برادری کے ہر فرد کی مدد کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

سرپرستِ اعلیٰ آرائیں برادری سندھ منتخب ہونے کے بعد استقبالیہ تقریب میں
میاں عبدالسلام آرائیں اور نصیر آرائیں کے ساتھ۔

طارق محمود آرائیں ڈائریکٹر تقویٰ انسٹی ٹیوٹ آف فزیوتھراپی پھولوں کا تحفہ دیتے ہوئے۔

سرپرستِ اعلیٰ آرائیں برادری منتخب ہونے کی تقریب میں
ڈاکٹر صدیق میمن (چیف سیکریٹری سندھ) اور ڈاکٹر نصیر شیخ کے ساتھ۔

انجمنِ آرائیاں سندھ کے نواب شاہ جلسے میں اپنی برادری کے معززین سے خطاب کرتے ہوئے۔

لانگ مارچ

مادی ملک (ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم)

۱۹۷۵ء میں آرمی ہاکی چیمپیئن شپ کے مقابلے شروع ہوئے تو ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کھاریاں کی ہاکی ٹیم کا کیپٹن عابد کاظمی ٹیم کے ساتھ سیالکوٹ پہنچا۔ میزبان یونٹ ۲۱ فرنٹیئر فورس رجمنٹ تھی۔ کمانڈنگ آفیسر سے ملنے گیا تو باہر تختی پر لکھا تھا لیفٹیننٹ کرنل مراد خان نیر۔ نہ جانے کیا سوچ کر کیپٹن عابد لمحہ بھر کو رکا اور آفس میں داخل ہوگیا۔ چاق و چوبند گٹھے جسم اور چمکتی آنکھوں والے کمانڈنگ آفیسر نے اٹھ کر محبت سے ہاتھ ملایا۔ بس رسمی بات چیت کے ساتھ یہ مختصر سی ملاقات ختم ہوگئی مگر کیپٹن عابد کاظمی کو عجیب کش مکش میں مبتلا کر گئی۔ وہ ۲۱ فرنٹیئر فورس رجمنٹ کے کمانڈنگ آفیسر کے خدوخال کی کڑیاں اپنے والد محترم غلام حیدر کاظمی سے سنی کہانیوں سے ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھالیا کے قریب مکھنانوالی گاؤں کے غلام حیدر کاظمی اور مراد عرف مادی ملک کی دوستی اور جوڑی بہت مشہور تھی۔ ہر وقت ساتھ رہنا، لوگوں سے لڑنا جھگڑنا، ایک دوسرے کے گھر کھانا پینا سب ساتھ ہوتا تھا۔ تازہ تازہ میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ بے فکری کی زندگی تھی کہ نہ جانے گھر میں کیا ایسی بات ہوئی جس نے مادی ملک کی ساری خوشیاں چھین لیں۔ ماں سے خوب لڑائی ہوئی۔ گھر چھوڑ کر جانے اور پھر واپس نہ آنے کی دھمکیاں دی گئیں مگر ماں نہ مانی۔ ماں نے سوچا، بچے ایسا کرتے ہیں، وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہوجائے گا مگر مادی ملک چپ چاپ گھر چھوڑ کر کبھی واپس نہ آنے کے لیے گم ہوگیا۔ آج مادی ملک کو گم ہوئے پچیس سال ہو چکے تھے اور مکھنانوالی گاؤں کے کسی فرد کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا۔ اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

جب سے کیپٹن عابد کاظمی نے فوج میں کمیشن لیا تھا، اس کے والد اکثر مطالبہ کرتے کہ میرے دوست مادی ملک کو ڈھونڈو۔ لوگ کہتے ہیں، وہ فوج میں ہے۔ جناب حیدر کاظمی ان دنوں ریٹائر ہو کر اپنے بیٹے کیپٹن عابد کاظمی کے ساتھ کھاریاں کینٹ میں مکان نمبر ۲۲۱/بی، شامی کالونی میں رہائش پذیر تھے۔ دوسرے دن گھر پہنچ کر کیپٹن عابد نے اپنے والدِ محترم کو پورے حلیے اور نقشوں کی تصویر کشی کر کے رائے لی کہ ہو نہ ہو یہ مادی ملک ہی ہے جو اب کرنل مراد خان نیر کے نام سے ۲۱ فرنٹیئر فورس رجمنٹ کمانڈ کر رہا تھا۔

باپ بیٹے میں طے پایا کہ کیوں نہ براہِ راست سوال کیا جائے کہ آپ کون ہیں؟ کہاں سے ہیں؟ دوسرے دن جب کیپٹن عابد کاظمی سیالکوٹ گیا تو دوبارہ سی او سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ اجازت ملی تو آفس میں جاتے ہی سلیوٹ کرنے کے بعد کہنے لگا، سر میں مکھنا نوالی گاؤں کے غلام حیدر کاظمی کا بیٹا ہوں۔ ان کے ایک دوست مراد عرف مادی ملک ہوا کرتے تھے، گھر چھوڑ کر نہ جانے کہاں گم ہو گئے۔ میرے والد ان کو پچھلے پچیس سال سے ڈھونڈ رہے ہیں اور کہتے ہیں، شاید وہ فوج میں ہے۔ سر وہ جو حلیہ بتاتے ہیں مجھے لگتا ہے وہ آپ تو نہیں۔

نو۔ وہ میں نہیں ہوں نہ مجھے مکھنا نوالی گاؤں کا کچھ پتا ہے۔ آپ جاؤ، اپنی ٹیم کی فکر کرو۔
کیپٹن عابد چپ چاپ آفس سے نکل آیا۔

کافی دیر کے بعد صوبے دار میجر یونٹ کے آفیسرز ٹی روم میں آیا اور کیپٹن عابد کاظمی سے کہا کہ آپ کو سی او صاحب یاد کر رہے ہیں۔ کیپٹن عابد کاظمی جب سی او کے آفس کے اندر داخل ہوا تو کرنل مراد خان نیر اپنی سیٹ چھوڑ کر دروازے کی طرف لپکے اور کیپٹن عابد کو گلے لگا لیا۔ کیپٹن عابد کے کانوں کو ایک بھرائی ہوئی آواز بار بار سنائی دے رہی تھی؛ ''اوے تو میرے یار حیدر کا بیٹا ہے؟''

کیپٹن عابد، بیٹا مجھے معاف کر دو۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا۔ میں حیدر کے بیٹے سے کیسے جھوٹ بول سکتا ہوں۔ میں ہی مادی ملک ہوں۔ میں ہی تمھارے باپ حیدر کاظمی کا دوست ہوں۔ میں ہی وہ بدقسمت انسان ہوں جس نے قسم کھائی ہوئی ہے کہ کبھی لوٹ کر مکھنا نوالی نہیں جاؤں گا۔ بس میں جا نہیں سکتا۔ میں مر گیا تو میری لاش بھی نہیں جائے گی۔ مجھے مکھنا نوالی کے در و دیوار، چرند پرند طعنے مارتے ہیں۔ میں ان طعنوں کا سامنا نہیں کر سکتا۔

لیفٹیننٹ کرنل مراد خان نیر کمانڈنگ آفیسر ۲۱/ایف ایف رجمنٹ سیالکوٹ ۱۹۷۵ء۔

کمانڈنگ آفیسر کی حیثیت سے جی او سی سیالکوٹ کے ساتھ۔

سپلائی کمپنی چترال اسکاؤٹس دروش میں لیفٹیننٹ کرنل مراد خان نیر کی آخری آرام گاہ۔

کرنل مراد اپنے جذبات اور آواز کو قابو میں رکھنے کے لیے بہت ضبط کر رہے تھے۔ کہنے لگے، عابد ہم وردی پہن کر خود کو اتنا مضبوط سمجھنے لگتے ہیں کہ جیسے پہاڑ بن گئے ہوں۔ رونا بھول جاتے ہیں یا رونے سے گریز کرتے ہیں۔ ماں باپ، بیوی بچوں کو اللہ کے حوالے کر دیتے ہیں کہ پتا نہیں کب اور کہاں ملک وقوم کی خاطر قربان ہو جائیں۔ کیا پتا کون سی گولی پر ہمارا نام لکھا ہو اور ہلالی پرچم میں لپیٹ دیا جائے مگر آج تم نے حیدر کا نام لے کر مجھے بہت کم زور کر دیا۔ مجھے رلا دیا۔ کیپٹن عابد ادب سے سر جھکائے کھڑا رہا کہ اسے بھی ایسے لگ رہا تھا جیسے غلام حیدر کاظمی ہی اپنے بیٹے کے سامنے اپنے دکھڑے سنا رہا ہو۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کمانڈنگ آفیسر کی آنکھوں میں آئے درد کے آنسو دیکھے۔ کمرے میں بہت دیر خاموشی رہی۔ کرنل مراد خان نیر دوبارہ اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔ کیپٹن عابد سے ہنس کر پوچھا، کیا پیو گے، لیموں پانی یا چائے؟ تھوڑی دیر میں چائے آ گئی۔ کرنل مراد پھر اس کے قریب آ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ سگریٹ ایسے پی رہے تھے جیسے دھویں کو اپنے پھیپھڑوں میں ہمیشہ کے لیے قید کر رہے ہوں۔ کہنے لگے، میری تم سے اور حیدر سے ایک درخواست ہے کہ میں جیسے ہوں ایسے ہی رہنے دینا۔ میرے بارے میں فوج میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ میں حیدر سے ملنا چاہتا ہوں فوراً مگر اس شرط کے ساتھ کہ آپ دونوں میرے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہیں گے۔ مجھے میری زندگی اسی طرح جینے دیں گے۔

کیپٹن عابد نے آج رات پھر کھاریاں جانے کی اجازت مانگی اور شام ڈھلے وہ کھاریاں پہنچ گیا۔ شامی کالونی کے بنگلے نمبر ۲۲۱/ بی کے لان میں ڈنر کے بعد کرنل مراد خان نیر کے بارے میں غلام حیدر کاظمی اپنے بیٹے سے بات کرتے کئی دفعہ رنجیدہ ہوئے اور فیصلہ کیا کہ اپنے یار مادی ملک سے ملنے وہ صبح سیالکوٹ چلیں گے۔

کرنل مراد خان نیر سیالکوٹ کینٹ میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کی آفیسرز میس میں ہی رہائش پذیر تھے۔ میس اینٹی روم پہنچ کر اپنے دوست مادی ملک کا انتظار کر رہے تھے کیوں کہ فیصلہ یہ ہوا تھا کہ سی او آفس نہیں جانا۔ نہ جانے دو بچھڑے دوست پچیس سال بعد ملیں تو کیا جذبات ہوں۔ کرنل مراد خان نیر کی جیپ میس میں آ کر رکی تو کیپٹن عابد کاظمی اپنے والد کو اینٹی روم میں اکیلا چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ عابد کاظمی کو حیرت اس وقت ہوئی جب کرنل مراد جیپ سے اتر کر اینٹی روم

میں جانے کی بجائے اپنے رہائشی کمرے کی طرف چلے گئے۔

صوبے دار میجر اینٹی روم سے حیدر کاظمی صاحب کو اپنے کمانڈنگ آفیسر اور ان کے بچپن کے دوست مادی ملک کے کمرے کی طرف لے گئے۔ دو گھنٹے کیپٹن عابد کاظمی میس کے برآمدے میں بے چینی سے اِدھر اُدھر گھومتا رہا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تو پہلے حیدر کاظمی باہر نکلے۔ کیپٹن عابد نے اپنے والد کے چہرے پر آج والی رونق پہلے کبھی نہ دیکھی تھی یا اس نے اپنے والد کے چہرے کو شاید اتنا غور سے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ کرنل مراد نے عابد کے سلیوٹ کا جواب دیا تو ان کی چمکتی آنکھوں میں شکریہ کا عنصر بہت واضح تھا۔ دونوں دوستوں میں یہ طے پا چکا تھا کہ ان کی اس ملاقات کا ذکر مکھنا نوالی گاؤں تک کبھی نہ پہنچے گا۔

اب تو ہر دو چار دن بعد ملاقاتیں ہوتیں۔ کرنل مراد بس فون کرتے کہ شاہ جی آ جائیں اور حیدر کاظمی سیالکوٹ پہنچ جاتے۔ حیدر کاظمی اپنے وعدے پر قائم تھا کہ کسی سے ذکر نہیں کرے گا۔ ایک آدھ دفعہ مکھنا نوالی میں مادی ملک کی ماں سے بھی ملاقات ہوئی مگر دوست سے کیے وعدے نہ ٹوٹے۔ کیپٹن عابد کاظمی کی شادی محلّہ پاور ہاؤس سیالکوٹ کے ایک معزز خاندان میں طے پائی۔ بارات کی تاریخ ۱۶/اکتوبر ۱۹۷۶ء رکھی گئی۔ بارات مکھنا نوالی گاؤں سے ہی بننی تھی جس میں دسیوں باراتی اسی گاؤں کے ہونے تھے۔ نہ جانے پھر بھی کیوں کیپٹن عابد کاظمی اور ان کے والد جناب حیدر کاظمی شادی کا دعوت نامہ لے کر کرنل مراد خان نیر کے کمرے میں پہنچ گئے کہ ان سے بارات میں شامل ہونے کی درخواست کر سکیں۔ شام کی چائے کا بندوبست ۱۰ بریگیڈ آفیسرز میس کے لان میں کرنل مراد کے کمرے کے بالکل سامنے کیا گیا۔ کرنل مراد باہر لان میں بہت افسردہ اور فکرمند بیٹھے تھے کہ مکھنا نوالی سے آنے والی بارات کا سامنا کیسے کریں گے یا شادی میں شرکت سے انکار کیسے کریں گے۔ ایک طرف دوستی اور دوسری طرف پچھلے پچیس سال سے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے فرار تھا۔ ولز فلٹر سگریٹ ان کا پسندیدہ برانڈ تھا، اور وہ سگریٹ کا کش اتنا زور لگا کر لیتے جیسے سانس بند ہو رہا ہو۔

دیکھ حیدر یار، مجھے مشکل میں نہ ڈال۔ مجھے اپنے قلعے میں رہنے دے۔ میرے اصل کو چھپا رہنے دے۔ میں مکھنا نوالی سے بھاگا ہوا ہوں، مجھے بھاگا ہی رہنے دے۔ کیپٹن عابد کاظمی

چپ چاپ دونوں دوستوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ طے پایا کہ مادی ملک کو کرنل مراد سے الگ رکھا جائے گا اور کسی بات پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ کرنل مراد نے وعدہ کیا کہ وہ برات میں ہوگا کسی نہ کسی طریقے سے۔

۲۱ فرنٹیر فورس رجمنٹ کے فوجی بینڈ کی ہر جگہ دھوم تھی۔ چھاؤنی میں کوئی بھی فوجی تقریب اس بینڈ کی دھنوں کے بغیر نامکمل سی رہتی تھی۔ ۱۶/ اکتوبر ۱۹۷۶ء بروز ہفتہ صبح گیارہ بجے ملکھنانوالی کے دولھا کیپٹن عابد کاظمی کی برات کے انتظار میں پاور ہاؤس محلّہ سیالکوٹ میں فوجی بینڈ کی دھنیں بجنے لگیں مگر کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ بینڈ دلھن کی طرف سے ہے یا دولھا کی طرف سے اور اس طرح مادی ملک اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔

برات پہنچی تو ایک بس سے مادی ملک کا چھوٹا بھائی محمد خان ملک بھی اترا۔ بینڈ کی دھنوں میں لوگ برات کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ہر طرف خوشیوں سے سرشار براتیے جھوم رہے تھے۔ یہاں جب دولھے کے باپ حیدر کاظمی کی آنکھیں بے چینی سے اپنے یار مادی ملک کو ڈھونڈ رہی تھیں تو اُدھر کرنل مراد خان نیر سیالکوٹ سے میلوں دور شامی کالونی کھاریاں کینٹ کے مکان نمبر ۲۲۱/ بی کے سامنے اپنی جیپ سے دولھا دلھن کے لیے تحائف اتروا رہا تھا۔

کھاریاں کی لاگ ایریا آفیسرز میس میں لنچ پر ان کے سواتی دوست میجر قادر عرف لالا قادر نے کرنل مراد خان سے بہت پوچھا کہ تم اتنے افسردہ کیوں ہو اور اچانک کھاریاں کیسے آنا ہوا مگر مادی ملک میس کے اندر بھی اپنا دھوپ کا سیاہ چشمہ پہنے مسلسل سگریٹ پینے میں مشغول تھا۔ کاش میجر قادر کو پتا ہوتا کہ مادی ملک کالا چشمہ پہنے پچیس سالوں کی یادوں کو نم آنکھوں میں چھپائے کس کرب سے گزر رہا تھا۔

کسی فوجی آفیسر کی زندگی آپ کو باہر سے جیسی بھی مسحور کُن نظر آئے مگر اس کے بیوی بچے اور والدین کا ہر دن غیر یقینی سے گزرتا ہے۔ کسی ایمرجنسی یا کسی پوسٹنگ آ جانے کی تلوار ہر وقت سر پر لٹکتی رہتی ہے۔ بیوی گھر سجاتی ہے۔ کمروں کے پردوں کے سائز کاٹ چھانٹ کر پورا کرتی ہے۔ لان کے پودے ہرے ہونے لگتے ہیں۔ ماں باپ کے کمرے کے کموڈ اور وضو کرنے کے نل لگتے ہیں اور افسر آفس سے فون کرتا ہے کہ بیگم سامان باندھ لو۔ واپس گاؤں چلنا ہے کیوں کہ اس کی پوسٹنگ

بارڈر ایریا یا نان فیملی اسٹیشن پر ہونے کا پروانہ آتا ہے اور تیس دن میں گھر خالی کرنا ہوتا ہے۔ جی ایچ کیو سے کوئی گلے شکوے نہیں ہوتے۔ کسی کے خلاف بات نہیں ہوتی اور آپ اپنے سال دو سال کی ساری یادیں وہیں کسی کونے میں پڑے پرانے ڈسٹ بن میں ڈال کر اپنی راہ لیتے ہیں۔

شادی کے تین مہینوں بعد کیپٹن عابد کاظمی کی پوسٹنگ بھی اچانک اے کے بریگیڈ آزاد کشمیر میں ہوگئی۔ حیدر کاظمی اپنے یار مادی ملک سے مل کر آئے تو اپنی بیوی اور بہو کو ساتھ لے کر مکھنانوالی واپس چلے گئے۔ حیدر کاظمی نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ یہ ان کی آخری ملاقات ثابت ہوگی۔ کیپٹن عابد کاظمی میجر بنے تو تین سال کے لیے سعودیہ چلے گئے۔ واپسی پر ۱۹۸۵ء میں اسٹاف کالج کوئٹہ گئے تو والدین ساتھ تھے اور اس طرح مکھنانوالی کے دو دوستوں کا ناتہ پھر ٹوٹا ہی رہا۔ میجر عابد کے اسٹاف کورس کے بعد لاہور میں بریگیڈ میجر، جی ایچ کیو میں ایم ایس اور ایم او برانچ۔ پھر ترکش اسٹاف کورس کے لیے استنبول جانے کی بلاترتیب پوسٹنگز نے حیدر کاظمی اور کرنل مراد خان نیر کو دوبارہ کبھی اکٹھے نہ ہونے دیا۔ حیدر کاظمی کی اپنی صحت ایسی نہ رہی تھی کہ وہ اکیلے اپنے یار کو ملنے نکل پڑتے بلکہ ان کو تو اب یہ بھی خبر نہ تھی کہ کرنل مراد دوبارہ کس دنیا میں گم ہوگیا تھا۔

فروری ۱۹۹۴ء میں حیدر کاظمی صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے۔ ۱۹۹۵ء میں لیفٹننٹ کرنل عابد کاظمی وار کورس کے ساتھیوں سمیت سی ون تھرٹی طیارے سے چترال پہنچے تو ائیر پورٹ سے سیدھے آفیسر میس چترال اسکاؤٹس میں لنچ پر جانا تھا۔ اینٹی روم میں داخل ہوئے تو سامنے کرنل مراد خان نیر کی تصویر پر نظر ٹھہر گئی جس کے نیچے اسٹیل پلیٹ پر کمانڈنٹ ۱۹۷۸ء-۱۹۸۹ء لکھا تھا۔ پلٹ کر میس حوالدار کی طرف لپکے اور پوچھا کہ کرنل مراد خان نیر اب کہاں ہیں؟ میس حوالدار پہلے تو کھڑا کرنل عابد کاظمی کو حیرت سے دیکھتا رہا اور پھر آہستہ سے بولا، سر بابائے چترال دروش میں کمانڈنٹ ہاؤس کے باہر سپلائی مسجد کے صحن میں دفن ہیں۔ سر نہ جانے انھوں نے ۳؍اگست ۱۹۸۹ء کو خود کو کیوں گولی مار لی، کیوں خودکشی کر لی؟

کرنل عابد کاظمی تو جیسے سکتے میں آ گئے۔ پلٹ کر پھر تصویر پر جا رکے۔ دل ہی دل میں ان کی بخشش کی دعائیں مانگیں اور کرنل مراد سے اپنے والد محترم کی محبتوں کو یاد کر کے اپنی بھیگتی آنکھیں صاف کرتے رہے۔ چوں کہ سی ون تھرٹی طیارے نے چار گھنٹے بعد واپس جانا تھا، اس

لیے دورش جا کر قبر پر فاتحہ پڑھنے کی خواہش دل میں ہی دم توڑ گئی۔

میس حوالدار نے بتایا کہ صوبے دار میجر سلطان الدین کرنل مراد خان نیر کی زندگی کے آخری ہفتہ میں ان کے ساتھ ساتھ رہے تھے۔ گو کہ اب وہ ریٹائر ہو چکے ہیں مگر کوئی بات پوچھنی ہو تو آج وہ چترال شہر میں موجود ہیں۔ لنچ کے بعد سب آفیسرز ڈپٹی کمشنر چترال کی بریفنگ میں بیٹھ گئے تو کرنل عابد کاظمی چترال اسکاؤٹس کے ریٹائرڈ صوبے دار میجر سلطان الدین کے ساتھ میس کے پیچھے گھنے درختوں کے سائے میں بیٹھے چپ چاپ اس کی باتیں سن رہے تھے۔

عجیب شخص تھا کرنل مراد کہ آج بھی چترال میں کسی سے اس کا ذکر کریں تو اس کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ ایس ایم سلطان الدین نے بھی غمگین لہجے میں کہنا شروع کیا کہ شندور میلہ جولائی ۱۹۸۹ء کی آخری تاریخوں میں پلان تھا اور وزیرِاعظم بے نظیر کی آمد کا دن ابھی طے ہونا تھا۔

۲۶/ جولائی کو کرنل مراد خان نیر شندور پہنچے تو تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ خیمے لگ چکے تھے اور دور دور تک چترال اور گلگت سے آنے والے لوگوں کے علاوہ غیر ملکی مہمانوں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ سلطان الدین اس وقت صوبے دار تھا اور کمیونیکیشن اور سگنل سینٹر کا انچارج۔ شام کو بالا حصار سے ایک سگنل آیا کہ چترال اسکاؤٹس کی میس اور شندور ہٹ سے جنرل ضیاءالحق کی تمام تصاویر ہٹا دی جائیں اور ۲۹/ جولائی کو وزیرِاعظم بے نظیر بھٹو کے استقبال کی تیاریاں کی جائیں۔ یہ سگنل پیغام کرنل مراد پر بم کی طرح گرا کیوں کہ ان کی جنرل ضیاءالحق سے ذاتی دوستی تھی اور وہ ان سے والہانہ محبت کا اظہار سرِعام کرتے تھے لیکن آج اچھے سولجر کی طرح حکم کی تعمیل کر رہے تھے۔ تمام تصاویر اتار کر صوبے دار سلطان الدین کے گھر چونج گاؤں بھجوا دی گئیں تاکہ محفوظ رہیں۔ ۲۸ جولائی کو بالا حصار سے دوسرا سگنل موصول ہوا جس میں جی ایچ کیو راولپنڈی کے حوالے سے اطلاع دی گئی کہ کرنل مراد خان نیر کو ۳/ اگست ۱۹۸۹ء سے ریٹائر کیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ غیر متوقع ہو رہا تھا مگر کرنل مراد خان نیر پر اس کا کوئی اثر نظر نہیں آیا۔ سگنل میسج دیتے ہوئے جب صوبے دار سلطان الدین نے افسردہ لہجے میں کچھ پوچھا تو کہنے لگے، میں ریٹائرمنٹ پر کہیں نہیں جا رہا۔ یہیں رہوں گا تم لوگوں کے ساتھ۔

۲۹/ جولائی ۱۹۸۹ء کو صبح دس بجے میجر جنرل غازی الدین رانا آئی جی ایف سی کا ہیلی

کا پٹر پہنچا تو تب بھی کرنل مراد نے ان سے اپنی اچانک ریٹائرمنٹ کے متعلق بات نہ کی۔ پھر کیا تھا، وزیرِاعظم کے آتے ہی گہما گہمی ہوگئی۔ تقریب حسبِ معمول پچھلے سالوں کی طرح اختتام کو پہنچی مگر اس دفعہ کرنل مراد سب سے الگ تھلگ رہے۔ چترال کی ٹیم نے میچ جیتا مگر کوئی ولولہ نظر نہ آیا۔ جوانوں اور کھلاڑیوں نے کوئی ڈانس نہ کیا۔ ایسا لگتا تھا سب کچھ کھنا گیا ہے۔ مہمانوں کے ہیلی کاپٹر اڑے تو کرنل مراد بھی اپنی جیپ لے کر دروش کے لیے نکل گئے۔ ایسا لگتا تھا وہ جلد سے جلد دوش پہنچنا چاہتے ہیں مگر راستے میں پونج، لسپور اور مستوج کے لوگوں سے ملتے رہے اور دوسرے دن دروش پہنچے۔ صوبے دار سلطان الدین سے بھی کہا کہ کیمپ کلوز کرواؤ اور فوراً دروش پہنچو۔ سلطان الدین پوری رات سفر کر کے دروش پہنچ گیا۔

۳۱/ جولائی کو بالا حصار سے صبح صبح سگنل آیا کہ ۳/ اگست کو ایف سی ہیڈ کوارٹر آفیسرز میس پشاور میں کرنل مراد خان نیر کا الوداعی عشائیہ ہے، اس لیے وہ پشاور تشریف لے آئیں۔ کرنل مراد سگنل پڑھ کر ہنسنے لگے اور کہا کہ میں کھانا کھاؤں گا تو الوداع کریں گے ناں۔ پورا دن آفس میں فائلیں نمٹاتے رہے۔ لوگوں کی پروموشنز پر دستخط کیے۔ اکاؤنٹس دیکھے اور یہ کہہ کر گھر چلے گئے کہ کل تمام کام مکمل کروا لیے جائیں۔

صوبے دار میجر سلطان الدین کو ایک ایک لمحہ یاد تھا۔ یکم اگست کو دوپہر کو ریٹائر ہونے والے جے سی اوز کا دروش ہاسپٹل کے لان میں کھانا کیا اور رات کو چترال ونگ میں عشائیہ پر ان سب کو خدا حافظ کہہ کر رات کو ہی دروش واپس آ گئے۔ ۲/ اگست کو اوسیک میں اسکول کے بچوں کا کرکٹ میچ کروایا۔ سب بچوں کو دروش قلعے میں لنچ کروا کر دوبارہ شام تک ان کے ساتھ گراؤنڈ میں کرکٹ کا میچ دیکھتے رہے۔ کسی میں ہمت ہی نہ تھی کہ کہتا کہ سر صبح آپ نے پشاور پہنچنا ہے اور ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا کہ آپ نے جیپ میں جانا ہے یا پی آئی اے فلائٹ میں۔

گراؤنڈ سے واپسی پر آفس میں بقایا پیپرز اور فائلوں پر دستخط کرتے رہے اور رات کو دس بجے کھانا کھانے کے بعد تمام میس اسٹاف سے مل کر گھر چلے گئے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ۳/ اگست کی صبح چترال اسکاؤٹس میں کیسی قیامت ٹوٹے گی۔

کمانڈنٹ میس سے گھر پہنچے تو حسبِ معمول ان کا جرمن شیفرڈ ڈاگ پیٹر بھاگتا ہوا ان

کے پاس آیا۔ وہ کافی دیر تک اسے پیار سے بہلاتے رہے اور بیٹ مین شاہ جی پاس کھڑا صبح کا پروگرام لینے کے لیے انتظار کرتا رہا۔ جب کرنل مراد بغیر کچھ کہے کمرے میں جانے لگے تو بیٹ مین بول ہی پڑا کہ سر صبح پشاور کس طرح جانا ہے؟ کرنل مراد نے مڑ کر اس کے کندھے پر تھپکی دی اور آہستہ سے کہا کہ صبح دیکھیں گے اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

۳/ اگست ۱۹۸۹ء کا دن چترالی لوگ عام طور پر اور چترال اسکاؤٹس کے آفیسرز اور جوان خاص طور پر آج تک نہیں بھولے۔ صبح کمانڈنٹ ہاؤس میں مکمل خاموشی تھی۔ بیڈ روم کے باہر پیٹر اور بیٹ مین حسبِ معمول کرنل صاحب کی آواز کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر آج آواز نہ آنی تھی نہ آئی۔ آٹھ بج گئے تو بیٹ مین کو تشویش ہوئی اور پیٹر نے بے چینی سے بھونکنا شروع کر دیا۔ غیر معمولی طور پر آج دروازہ اندر سے بند تھا۔ بیٹ مین نے ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی۔ بار بار دستک پر بھی کوئی جواب نہ آیا تو اسے کچھ گھبراہٹ ہوئی کیوں کہ پچھلے گیارہ سال گیارہ مہینے اور دس دن میں کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کمانڈنٹ کے بیڈ روم سے سات بجے ان کی آواز نہ آئے اور پیٹر اور بیٹ مین اکٹھے اندر داخل نہ ہوں۔ کچھ سمجھ نہ آیا تو اس نے ایکسچینج میں فون کر کے بتایا کہ کمانڈنٹ نے پشاور جانا ہے مگر ان کا دروازہ آج اندر سے بند ہے اور دستک پر بھی وہ نہیں کھول رہے۔ صوبے دار سلطان الدین بھاگتے ہوئے کوارٹر گارڈ پہنچے تو وہاں پہلے سے میجر فاروق اور میجر افضل کھڑے تھے۔ فوراً ہی دو جیپ آ کر رکیں۔ سلطان الدین سمجھ گیا کہ ٹیلی فون آپریٹر یہی بات سیکنڈ ان کمانڈ کو بھی بتا چکا تھا۔ سب لوگ کمانڈنٹ ہاؤس پہنچے۔ بیٹ مین سخت پریشان تھا کہ خدانخواستہ کہیں بیمار ہو کر بے ہوش نہ ہوں۔ فیصلہ ہوا کہ دروازہ توڑا جائے۔ صوبے دار نظام الدین اور بیٹ مین نے دروازے کو کلھاڑے کی چوٹ سے کھول دیا۔ کمرے میں بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر لیمپ روشن تھا اور کرنل مراد خان موٹی خاکی چادر لیے سو رہے تھے۔ یہ دس سیکنڈ کا وقت جیسے گھنٹوں پر محیط تھا۔ سب کسی ان جانے خوف میں مبتلا تھے۔ مزید لائٹیں جلا کر میجر افضل نے چادر ہٹائی تو آنکھوں دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

بیڈ کے ساتھ جائے نماز بچھی ہوئی تھی جیسے ابھی ابھی کوئی اس سے اٹھا ہو۔ سفید شلوار قمیص میں ملبوس تازہ شیو شدہ چہرہ لیے سیدھے چت لیٹے کرنل مراد خان نیر کے دائیں ہاتھ میں

پکڑا آٹو میٹک رشین پسٹل ان کی دائیں کنپٹی پر تھا جس سے چلنے والی گولی بائیں کنپٹی سے باہر نکل گئی تھی اور وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ اگر کوئی ان کے ہاتھ میں پکڑے پسٹل کو ڈھک دیتا تو ایسا لگتا کہ جیسے وہ گہری نیند سو رہے ہیں اور ابھی آواز دینے پر اٹھ بیٹھیں گے مگر سر کے نیچے بستر پر پھیلے خون نے سب لوگوں کو پتھر کا بت بنا دیا تھا۔ اب صرف دو آوازیں سنائی دے رہی تھیں، بیٹ مین شاہ جی کی چیخیں اور پیٹر کا کمرے میں بھاگنا اور بے چینی سے بھونکنا۔

وادیِ چترال میں یہ خبر جنگل کی آگ سے زیادہ تیز رفتاری سے پھیلی۔ چترال اسکاؤٹس کے جوان دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ دروش بازار میں لوگ دکانیں بند کر کے اپنے اپنے گھروں کے باہر جا بیٹھے۔ ایس پی اور ڈی سی چترال سے ڈی ایچ او ڈاکٹر سردار الملک کے ساتھ پہنچے۔ ایک گھنٹے میں ہی بالا حصار سے ہیلی کاپٹر آئی جی ایف سی میجر جنرل غازی الدین رانا کو لے کر دروش کی طرف اڑ چکا تھا۔ اب سلطان الدین بات کرتے کرتے ہچکیاں لے رہا تھا۔ کہنے لگا سر پتا نہیں وادیِ چترال کی سب ماؤں بہنوں اور بچوں نے اس شخص کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا یا نہیں مگر اس دن نہ کسی گھر میں کھانا پکا نہ کسی نے کھایا تھا۔ ہر شخص کو لگتا تھا، میرا باپ گیا کہ میرا بھائی گیا، میں لاوارث ہو گیا اور میرا سر پرست گیا۔ ایک شخص کی موت نے چترال کے ہر گلی کوچے اور ہر گھر پر سوگ کی بھاری چادر ڈال رکھی تھی جو ذکر کریں تو آج بھی محسوس ہوتی ہے۔

ایس ایم سلطان الدین نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے بتایا کہ بعد میں سنا کہ ان کے بریف کیس پر ایک چٹ پڑی تھی جس پر بریف کیس کو کھولنے کا نمبر تھا اور لکھا تھا کہ میری وصیت بریف کیس کے اندر ہے۔ آفیسر نے مل کر بریف کیس کھولا تو وصیت نظر آئی۔

آئی جی ایف سی کے نام لکھا تھا کہ:

۱۔ میں اپنی مرضی سے خودکشی کر رہا ہوں، اس لیے اس بارے کسی سے کوئی پوچھ گچھ نہ کی جائے۔

۲۔ مجھے دروش کی سپلائی برانچ کی مسجد کے احاطے میں (جو میں پہلے سے مختص کر چکا ہوں) دفن کرنے کی اجازت دی جائے۔

۳۔ میری ماں اور بھائیوں کو دفن کرنے کے بعد اطلاع دی جائے تا کہ میری لاش چترال سے باہر نہ لے جاسکیں۔

۴۔ میری کتابیں چترال اسکاؤٹس کی لائبریری کو، میرے بینک میں پڑے ڈیڑھ لاکھ کا لکھا چیک کیش کروا کر میری تدفین کے خرچے کے بعد دس ہزار میرے بیٹ مین اور بقایا میری ماں کو دے دیا جائے۔

۵۔ میرا کتا پیٹر بھی میرے بیٹ مین کو دیا جائے۔

اس وقت کے وزیرِاعلیٰ پنجاب جناب نواز شریف کو لکھا کہ میرے بھائی کو اگر قانونی کارروائی کے بعد بے قصور پایا جائے تو اس کو پولیس سروس پر بحال کر دیا جائے۔

اور آخر میں لکھا کہ میری چھتیس سالہ آرمی سروس کے دوران کوئی جائیداد نہیں بنی کیوں کہ جو پلاٹ مجھے آرمی نے الاٹ کیے تھے، میں ان کی قسطیں بھی نہیں دے سکا، اس لیے وہ بھی پاکستان آرمی کی ملکیت ہیں۔

کرنل عابد کاظمی نے بہت ہی دکھی لہجے میں کہا کہ سلطان الدین آپ کے وقت کا شکریہ۔ میرے والدمحترم کی باتیں مجھے آج سمجھ آ رہی ہیں۔ وہ مجھ سے اکثر کہتے تھے کہ مادی ملک کرنل مراد خان نیر آرمی کی وردی ضرور پہنتا ہے مگر اس کے اندر آفیسر سے زیادہ کسی درویش کی روح ہے۔ مگر میں سوچ رہا ہوں، درویش تھا تو خودکشی کیوں کی؟

بے نظیر بھٹو کے کھانے میں زہر

۱۹۸۸ء کے شندور پولو میچ کے بعد لنچ کا انتظام تھا۔ میں نے کھانے کا فٹنس سرٹیفکیٹ سائن کیا تو میس حوالدار سلطان ولی نے پرائم منسٹر بے نظیر بھٹو کو سلیوٹ کر کے لنچ تیار ہے کی خبر دی۔ شندور ہٹ میں کھانے کے کمرے میں صرف آٹھ کرسیاں لگ سکتی تھیں۔ پرائم منسٹر اور آصف علی زرداری کے علاوہ صرف چار مزید مہمان اندر آ سکتے تھے کیوں کہ میجر جنرل غازی الدین رانا اور کرنل مراد خان نیر نے میزبان ہونے کے ناتے ڈائننگ ٹیبل پر ہی ہونا تھا۔ مجھے میس سیکریٹری ہونے کے ناتے انتظامات دیکھنے کو کمرے میں موجود رہنا تھا۔ اس دن بی بی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ سادگی اور نسوانی حسن کا شاہکار تھیں۔

ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتے ہی بے نظیر بھٹو نے مجھے اشارے سے فوٹو گرافر کو کمرے سے باہر بھیجنے کو کہا۔ کھانا شروع ہونے لگا تو بی بی کا ساتھ آیا ہوا ٹفن بھی کھل گیا اور انھوں نے صرف اپنے ٹفن سے ہی کھایا۔ بعد میں چترال اسکاؤٹس میس کی چینی سے بنی سویٹ ڈش باسکٹ میں پیش ہوئی۔ بی بی نے ڈش کو حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے دیکھا۔ ڈش کی شکل وصورت کی تعریف کر کے کرنل مراد سے پوچھنے لگیں، کرنل صاحب یہ ڈش کون بناتا ہے۔ کرنل مراد نے جواباً کہا، ہمارے میس کا باورچی ہے جسے ہم پیار سے نانی کہتے ہیں۔ بی بی نے اس کو بلوانے کو کہہ دیا۔ سویٹ ڈش بی بی کے سامنے پڑی رہی۔ نہ کسی کو پیش ہوئی نہ کسی نے کھائی۔ کرنل مراد نے مجھے اشارے سے سمجھایا کہ باورچی کو وردی پہنا کر اندر لاؤں۔ میں فوراً باہر نکل گیا۔

پینسٹھ سالہ باورچی عرف نانی پچھلے پینتالیس سال سے چترال آفیسرز میس میں ڈیوٹی دے رہا تھا۔ وہ پانچ سال پہلے ریٹائر ہو چکا تھا مگر اسے کمانڈنٹ کرنل مراد خان جانے نہ دیتے تھے۔ تنخواہ بڑھا کر پھر رکھ لیا تھا۔ نانی انتہائی سر چڑھا تھا۔ وہ کسی کی بات نہیں سنتا تھا۔ کرنل مراد بھی کچھ کہتے تو اس کا جواب ہوتا، سر مجھے گھر بھیج دو۔ دوسری طرف جونیئر سے جونیئر افسر کا بھی آدھی رات تک انتظار کرتا اور اسے کھانا کھلائے بغیر کبھی نہ سوتا تھا۔ سب سے تکلیف دہ بات کہ کپڑے ہفتے بعد بھی بدلنے پر اسے موت پڑتی تھی۔ دیکھنے میں خوب گندہ لگتا تھا مگر ماہر باورچی تھا۔

میں نے جلدی سے نانی کے گندے کپڑے بدلوائے اور وردی والی کالی شلوار قمیص پہنوا کر بی بی کے پاس کمرے میں لے آیا۔ بی بی نے ڈش کی تعریف کر کے کہا کہ تم میرے گھر اسلام آباد چل کر یہ ڈش میرے باورچی کو بھی سکھا دو۔ اس کے بولنے سے پہلے ہی کرنل مراد نے مجھ سے کہا، نانی کو اس کی ضرورت کی چیزیں دو اور اسلام آباد والے ہیلی کاپٹر میں بٹھا دو۔ آصف زرداری صاحب نے لقمہ دیا کہ نہیں نہیں، سب کچھ مل جائے گا کچھ ساتھ نہ لے۔

نانی کو میں اور ایک سکیورٹی افسر جلدی جلدی ایک ہیلی کاپٹر کی طرف لے جا رہے تھے تو شندور میلے میں آئے ہزاروں لوگ یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد سب مہمانوں کے ہیلی کاپٹر اڑ گئے۔ میجر جنرل غازی الدین رانا بھی چلے گئے تو ہم آرام سے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ہیڈ کوارٹر کا صوبے دار میجر فاروق جان پریشانی میں ہانپتا کانپتا ہم تک آیا۔ کرنل مراد کے کان

شندور پولو میلے میں وزیرِاعظم بے نظیر بھٹو کے ساتھ کنڈکٹنگ آفیسر کی ڈیوٹی کے دوران۔

جناب آصف علی زرداری کے ساتھ شندور پولو میچ کی تقریب کے دوران۔
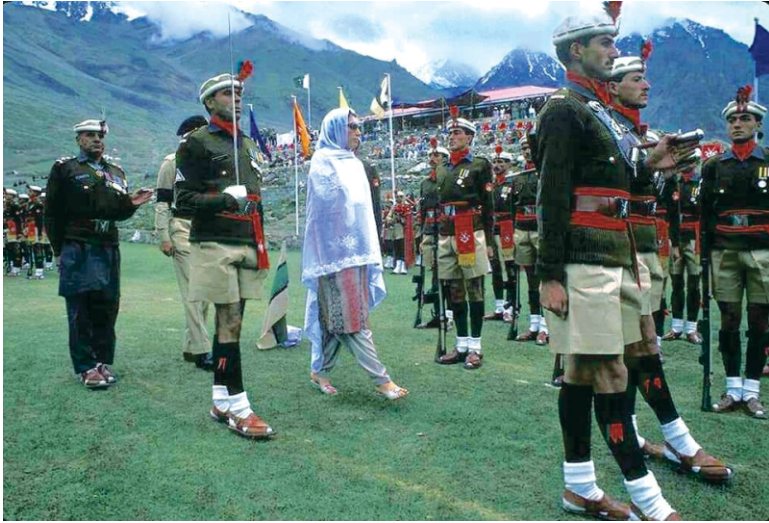
شندور پولو میلے میں وزیرِاعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو چترال اسکاؤٹس کے جوانوں سے سلامی لینے کے لیے تشریف لا رہی ہیں۔

شندور پولو میلے میں وزیرِاعظم بے نظیر بھٹو چترال اسکاؤٹس کے جوانوں سے سلامی لیتے ہوئے۔
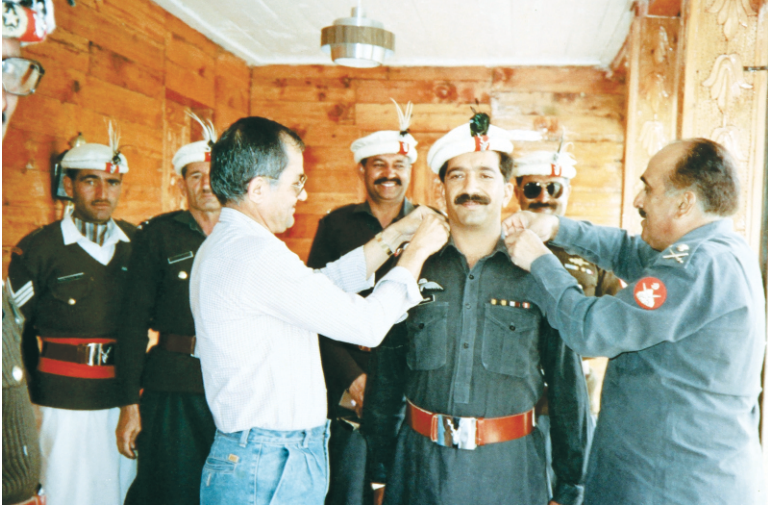
میجر جنرل غازی الدین رانا آئی جی ایف سی کیپٹن بشیر آرائیں کو
میجر کا رینک لگاتے ہوئے۔ میجر جاوید بھٹہ کی خوشی دیدنی ہے۔

میجر کا رینک پہننے کے بعد میجر بشیر آرائیں چترال اسکاؤٹس کے
جوانوں کے ساتھ چترالی ڈانس کرتے ہوئے۔

جے سی او میس چترال اسکاؤٹس دروش میں خوشی کے چند لمحات۔
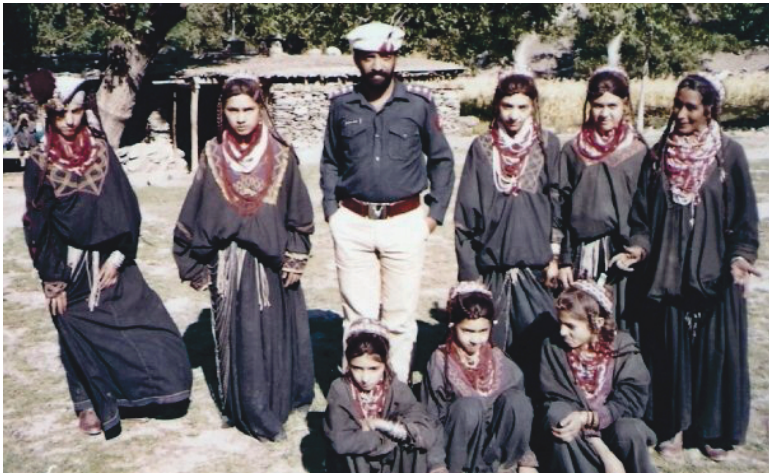
وادیِ بھمبھریت میں کیلاش بچیوں کے ساتھ فری میڈیکل کیمپ میں۔

میں کچھ کہا تو کرنل مرادزور سے ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے ساتھ لے کر ہٹ سے ذرا دور آ کر اس سے دوبارہ پوچھا کہ اب بتاؤ۔ وہ کہنے لگا، سرلوگ کہہ رہے ہیں وزیرِاعظم کے کھانے میں نانی سے زہر ملوایا گیا تھا اور اب اسے گرفتار کر کے اسلام آباد لے جایا گیا ہے۔ وہ بار بار کہتا، سر اب کیا ہوگا۔ کرنل مراد نے مجھ سے کہا کہ اصل بات تو صرف ڈائننگ روم میں موجود لوگوں کو پتا ہے۔ تم چپ رہو گے اور افواہ کی طاقت دیکھو گے۔

چترال کے لوگ بی بی کو پوجنے کی حد تک پسند کرتے تھے۔ خبر جنگل کی آگ کی طرح ساری وادی میں پھیل گئی۔ لوگ نانی کے لیے دعا کرتے مگر کسی میں جرأت نہ تھی کہ کوئی کرنل مراد خان نیر سے براہِ راست پوچھے کہ ہوا کیا ہے۔ مجھ سے لوگوں نے پوچھا مگر میں نے کہہ دیا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔

آٹھ دن بعد مجھے حکم صادر ہوا کہ صبح چترال ائیر پورٹ سے نانی کو چپ چاپ جیپ میں بٹھا کر لے آؤ۔ نانی جہاز سے باہر آیا تو ایسے لگ رہا تھا جیسے دُبئی سے شاپنگ کر کے لوٹا ہو۔ اتنی خوشی شاید اسے حج کی بھی نہ ہوتی جتنی محترمہ بےنظیر بھٹو کے گھر رہنے کی تھی۔ بی بی نے اسے اپنے لیے، اس کے گھر والوں کے لیے تحفے تحائف، نقد انعام اور شاباش سے لاد کر بھیجا تھا۔ شام کو دروش آفیسر میس کے لان میں اسٹوک (چترالی ڈانس) کا اہتمام ہوا۔ نانی وہی سویٹ ڈش لے کر نمودار ہوا تو پنڈال میں بیٹھے لوگ ہکا بکا رہ گئے اور نانی تھک جانے تک ناچتا رہا۔

پھر جب تک کرنل مراد خان نیر زندہ رہے، نانی سے بی بی کے گھر رہنے کے قصے دوبارہ سنانے کو کہتے اور نانی تھا کہ ایک ہی بات بیسیوں دفعہ اسی طرح خوشی سے سناتا۔ کبھی کبھی کرنل مراد مجھ سے کہتے، اللہ نہ کرے ہماری یونٹ میں بی بی کے لیے کسی کو ایسی سوچ بھی آئے لیکن اگر حادثاتی طور پر بھی افواہ سچ ہو جاتی تو ہمارا کیا بنتا۔

جھکنے والوں نے راحتیں پائیں

چترال سے گلگت کا سفر کرنا ہو تو بونی، مستوج اور لسپور سے گزرتے ہوئے آپ دس گھنٹے بعد وادیِ شندور پہنچتے ہیں جہاں جھیل کنارے دنیا کا بلندترین پولوگراؤنڈ ہے۔ مدتوں سے ہر سال

گلگت اور چترال کی پولو ٹیموں کے درمیان جنگ و جدل کی طرح سالانہ مقابلے ہوتے ہیں اور یہاں کا رواج تھا کہ فائنل میچ میں جو کھلاڑی جیت کا سبب بننے والا گول کر جاتا وادی کی سب سے خوب صورت لڑکی اس کو شادی کا پیغام بھیج دیتی اور وہ پولو میچ سے بھی بڑی تقریب بن جاتی۔ ۱۹۸۶ء کے بعد افغان مہاجرین نے پولو میچ کے ساتھ اس میں بزکشی جیسے مقابلوں کا اضافہ کر کے تہوار کو خوں خوار کھیل میں بدل دیا۔

جنرل ضیاء الحق کی خواہش پر چترال اسکاؤٹس کی ڈیوٹی لگی کہ شندور جھیل اور گراؤنڈ کی خوب صورتی کے لیے اس کے ساتھ ساتھ ہٹس تعمیر کیے جائیں اور پھر پولو مقابلوں کو ہر سال قومی تہوار کے طور پر منایا جائے۔ چترال اسکاؤٹس میں نوکری کرتے ہم جیسے غیر شادی شدہ افسروں کی ڈیوٹی لگنے لگی کہ جا کر شندور بیٹھو اور کام کی نگرانی کرو۔ پھر کیا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے شندور جھیل کنارے خوب صورت ہٹس اور آفیسر میس نے اس کی رونقیں دوبالا کر دیں۔

جنرل ضیاء الحق کے طیارے کے حادثے کے بعد زرداری صاحب مردِ اوّل بن گئے جو پولو کے شوق سے مالا مال تھے اور ۱۹۸۸ء میں شندور پولو تہوار میں اسلامی دنیا کی پہلی وزیرِ اعظم بے نظیر بھٹو کے ساتھ آ کر ہمارے مہمان بننے والے تھے۔ تہوار میں ڈاکٹری کے علاوہ میس اور مہمان داری کے معاملات بھی میرے ذمے لگ گئے۔

چترال کا شاہی خاندان تو اپنے مفادات کی قید سے کبھی آزاد نہ ہوا مگر باقی ہر چترالی مرد و زن بے نظیر بھٹو سے عشق کی حد تک وابستہ تھا اور اس کی ایک جھلک دیکھنے کی تیاریاں کمال عروج پر تھیں۔ چترال ویلی میں اس دوران پیدا ہونے والی بچیوں کے نام بھی بے نظیر بھٹو رکھے گئے۔ میں لوگوں سے کہتا، بے نظیر تک تو ٹھیک ہے آپ ساتھ بھٹو کیوں لگاتے ہیں تو کوئی جواب نہ بننے پر بس ہنس دیتے۔

چترال اسکاؤٹس نے شندور کو دلھن کی طرح سجا دیا تھا۔ گلگت اور چترال سے پولو کے شوقین لوگوں نے گھر بار چھوڑ کر وادیِ شندور میں ڈیرے ڈال لیے۔ پوری دنیا سے آئے پولو دیکھنے والوں کے رنگ برنگے ٹینٹ بھی دور دور تک پھیل چکے تھے۔

ہمارے کمانڈنٹ کرنل مراد خان نیر پیدائشی طور پر پکے سچے سپاہی تھے اور خاکی وردی ان

کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ پچھلے دس سال سے چترال اسکاؤٹس کمانڈ کر رہے تھے اور اس علاقے میں ہر چیز پر ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

وزیرِاعظم بے نظیر بھٹو ہیلی کاپٹرز کے ایک جم غفیر کے ساتھ پہنچیں۔ لیفٹیننٹ کمانڈر شوکت شاہ ان کے اے ڈی سی تھے جو بعد میں پولیس میں چلے گئے اور سینئر رینک پر ریٹائر ہوئے۔ اس سال چترال ٹیم نے میچ جیت لیا۔ لوگوں نے ناچ ناچ کر آسماں سر پر اٹھا رکھا تھا۔ مردِاوّل جناب آصف علی زرداری صاحب بھی جوش میں آئے اور پولو کھیلنے کی خواہش ظاہر کر دی۔ پولو ڈریس مہیا کیا گیا اور وہ میدان میں اتر گئے۔ کھلاڑیوں نے ہدایات کے مطابق بھاگ دوڑ میں انھیں دو تین گول کرنے کے موقع فراہم کیے۔ خوب تالیاں بجیں اور میچ ختم ہو گیا۔ صاحب گھوڑے سے بڑی شان وشوکت سے اترے۔ ان کا ایک پٹارین دوست جو اسپیشل سروسز گروپ میں میجر تھا اور آج کل ان کا ذاتی محافظ تعینات تھا، وردی میں بھاگتا ہوا میدان میں پہنچا اور جمِ غفیر کے سامنے ہی مردِاوّل کے پولو بوٹ اتارنے لگا۔ کرنل مراد خان نیر کے لیے تو دین و دنیا ہی وردی تھی، وہ چیخے کہ اس میجر سے کہو اپنی نہیں تو وردی کی عزت کا خیال تو رکھے۔ یہ بات بے نظیر بھٹو نے بھی بہت ناگواری سے سنی مگر اعتزاز احسن اٹھ کر کرنل مراد کو ایک طرف لے گئے۔

اس سے اگلا سین اور بھی مزے کا ہوا۔ نواب شاہ کی وجہ سے زرداری صاحب چوں کہ مجھے جانتے تھے، جب وہ میدان سے اوپر ہٹ تک آئے تو مجھے سندھی میں کہا کہ میں نے ہاتھ دھونے ہیں۔ میں نے میس حوالدار کو آواز دی کہ پانی، صابن اور تولیا لاؤ۔ ایک میجر جنرل نے جو زرداری صاحب کے ساتھ فوٹو بنوانے کو مرے جا رہے تھے، مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور حوالدار سے لوٹا پکڑ کر زرداری صاحب کے ہاتھ دھلوانے لگے۔ شکر ہے، کرنل مراد یہ سین نہ دیکھ سکے ورنہ نہ جانے وہ کیا طوفان کھڑا کر دیتے۔

پرائم منسٹر کے جانے کے بعد آئی جی ایف سی نے شاباش کے طور پر وقت سے ایک ماہ پہلے ہی مجھے میجر کا رینک لگا دیا اور میں نے گراؤنڈ میں یونٹ کے سب جوانوں کے ساتھ ڈانس کر کے خوب جشن منایا۔

وہ پٹارین دوست میجر صاحب کسی پولیس آفیسر کا حق مار کر پرائم منسٹر کے آفیسر آن اسپیشل

ڈیوٹی سکیورٹی تعینات ہو گئے اور میجر جنرل صاحب ریٹائرمنٹ لے کر ایک مزے دار ملک کے سفیر بن کر چلے گئے جہاں زرداری صاحب چھٹیاں منانے جانے لگے۔ ایسے ہی نہیں کہا جاتا کہ زرداری صاحب دوستوں کے دوست ہیں۔

ایک سال بعد میں کرنل مراد خان نیر کو جب ہتک آمیز طریقے سے ریٹائر کرنے کے آرڈر ایشو ہوئے تو انھوں نے خود کو گولی مار کر خودکشی کر لی مگر طاقت ور لوگوں کے سامنے وردی میں ہوتے ہوئے نہ جھکنے کی رسم قائم رکھی۔

لیس سر — آل او کے سر

کورونا وبا پھیلی تو میرے ٹی وی پر انٹرویو آنے لگے اور مجھے بہت سے فوجی افسروں کے فون آئے جو اس زمانے میں چترال اسکاؤٹس یا آرمی انجینئرز میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس طرح بہت سے رابطے پھر بحال ہو گئے۔ مجھے ایک ایسے افسر کا بھی فون آیا جس کا تکیہ کلام، ''لیس سر اور آل او کے سر'' ہوتا تھا اور ہمارے کمانڈنٹ کرنل مراد خان نیر ان سے اسی بات پر خفا رہتے تھے کہ تم اپنی کم زوریوں کی نشان دہی کیوں نہیں کرتے تاکہ انھیں دور کیا جا سکے۔ فوج میں جنرل ضیاء الحق کے دور میں سینئرز کو ''آل او کے'' کہہ کر خوش کرنے اور اس سے خود کو لائق فائق افسر ثابت کرنے کا بہت رواج تھا۔

یونٹ یا خاص طور پر بارڈر ایریا کا دورہ کرنے والے سینئر افسروں کے مخصوص سوال ہوتے تھے۔ جوانوں اور افسروں سے پوچھا جاتا، مورال اچھا ہے؟ کھانا اچھا ملتا ہے؟ چھٹی وقت پر ملتی ہے؟ ان سب سوالوں کا جواب جامع اور مستند ایک ہی ہوتا تھا۔ لیس سر — آل او کے سر۔

کلکٹک کیمپ پر بمباری ہوئی۔ بہت ساری اموات ہوئیں اب اصل مسئلہ زخمیوں کی دیکھ بھال تھا۔ چھوٹا سا سول ہاسپٹل اور او پی ڈی جیسا چترال اسکاؤٹس ہاسپٹل اس ناگہانی آفت کو سنبھال نہیں پا رہا تھا۔ اطلاع آئی کہ صدرِ پاکستان دروش آ رہے ہیں۔ ہمیں پتا تھا کہ جنرل ضیاء الحق سے ہمارے کمانڈنٹ کی مدتوں سے بے تکلفی ہے، اس لیے زیادہ پریشانی نہیں تھی۔

شہزادہ محی الدین اور جنرل فضل حق کے ساتھ چترال اسکاؤٹس ہاسپٹل میں۔

بمباری کے زخمیوں کی تیمارداری کے وقت جنرل فضل حق کو
چترال اسکاؤٹس ہاسپٹل میں بریفنگ دیتے ہوئے۔

لیفٹیننٹ کرنل مراد خان نیر، جنرل ضیاء الحق کو چترال اسکاؤٹس کی شیلڈ پیش کرتے ہوئے۔

چترال اسکاؤٹس کے سردار صاحبان کے ساتھ ایک یادگار فوٹو۔

کمانڈنٹ نے مجھے اپنے آفس بلوایا اور کہا کہ جنرل ضیاء الحق کو زخمیوں کے بارے میں سارا حال تم بتاؤ گے اور ہر سوال کا جواب نو سر ہوگا۔ خبردار اگر تمھارے منہ سے ایک بار بھی یس سر یا آل او کے سر نکلا۔ یہی موقع ہے کہ ہم ہاسپٹل کی استطاعت بڑھا لیں۔ میں دو سال نوکری والا کیپٹن اور سامنے چیف آف آرمی اسٹاف اور صدرِ پاکستان۔ ہر بات پر نو سر کہنے کو بہت ہمت کی ضرورت تھی۔ صوبہ سرحد کی انتظامیہ، کچھ کور کمانڈر اور اسلام آباد سے چاپلوسی کے ماہر اسٹاف افسروں سمیت صدرِ پاکستان دروش پہنچے اور کلکٹک کیمپ کے دورے کے بعد زخمیوں کو ملنے اسکاؤٹس ہاسپٹل آ گئے۔ کمانڈنٹ نے مجھے بلا کر رجمنٹل میڈیکل آفیسر کے طور پر میرا تعارف کروا کر مجھے گھور کر کہا کہ وارڈ میں زخمیوں کے پاس لے چلو۔

وارڈ پہنچنے سے پہلے ہی صدر صاحب نے پہلا سوال داغا، بشیر زخمیوں کا علاج اچھا ہو رہا ہے؟ میں نے کہا، نو سر۔ اس وقت کے انسپکٹر جنرل ایف سی نے مجھے غصے سے دیکھا اور باقی سب افسروں نے حیرانی سے۔ دوسرا سوال آیا کہ سب کو دوائی مل رہی ہے؟ میں نے کہا نو سر۔ جنرل ضیاء الحق نے مسکرا کر میرے کمانڈنٹ کی طرف دیکھا اور مجھ سے پھر پوچھا، ان کے کھانے کا بندوبست ہے، میں نے کہا نو سر۔ لوگ ایسے کھڑے تھے جیسے ان کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ صدر صاحب کہنے لگے، تمھارے پاس کچھ تو ہوگا ان کی دیکھ بھال کے لیے۔ جواب تھا، نو سر کچھ نہیں ہے۔ جنرل ضیاء الحق ہنس دیے اور ہم وارڈ سے باہر آ گئے۔ مجھے لوگ ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ سوچا، اب کورٹ مارشل ہونے میں کوئی کسر باقی تو نہیں رہی۔

باہر آ کر لان میں رک گئے۔ جنرل ضیاء الحق کمانڈنٹ سے کہنے لگے، کرنل مراد تم نے اپنے ڈاکٹر کو بہت اچھی ٹریننگ دی ہے۔ نو سر کہنے کی جرأت کا ٹھیک ٹھیک استعمال کرتا ہے۔ اشارے سے کسی اسٹاف افسر کو بلوایا اور کہا کہ پنڈی پہنچ کر تمھارا پہلا کام ہے کہ چترال اسکاؤٹس ہاسپٹل کو ضرورت کی ہر چیز مہیا کر دو، کوئی کمی نہ رہے، پھر جب جنرل صاحب واش روم کی طرف گئے تو مجھے پہلے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے والے سینئر افسر بھی محبت سے شاباش دینے لگے اور میری جرأت کو سراہتے رہے۔

ایک ماہ کے اندر تین نئے ڈاکٹر پوسٹ ہو گئے۔ ہاسپٹل کو پچاس بستر کی منظوری دے کر

اپ گریڈ کر دیا گیا۔ ایف سی فنڈز کے علاوہ منسٹری آف انٹیریئر سے الگ فنڈ ملنے لگے اور ہاسپٹل ایک منی سی ایم ایچ بن گیا۔ میری ذراسی نوسر کی تکرار سے دروش جیسے دور دراز علاقے میں ایک اچھا ہاسپٹل وجود میں آ گیا۔

پھر آہستہ آہستہ جنرل ضیاء الحق کے دور کا یہی یس سر اور آل او کے سر والا وائرس راول پنڈی اور اسلام آباد کے گلی کوچوں سے ہوتا ہوا وزیرِ اعظم ہاؤس میں گھس بیٹھا۔ اس کے بعد ملک میں سیلاب آئے، بھوک اور مفلسی ہو، مہنگائی کا طوفان آئے، بیماری سے لوگ مر جائیں، لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ ہو، لوگوں کی عزتیں اچھل رہی ہوں، کورونا پھیل رہا ہو یا سیکڑوں لوگوں کو ریلوے یا پی آئی اے مار دے — وزیرِ اعظم کو کہہ دیا جاتا ہے، آل او کے سر۔ کیوں کہ وہاں بیٹھ کر یہی سریلی دُھن اچھی لگنے لگتی ہے۔ اب نہ تو صاحبِ اختیار میں نوسر سننے کا حوصلہ ہے اور نہ قومی سطح پر کوئی کرنل مراد خان نیر بچا ہے جو کسی افسر کو یہ سکھا دے کہ کب کب نوسر کہنا ضروری ہے۔

جانے کہاں گئے وہ لوگ

دسمبر ۱۹۸۴ء میں ایبٹ آباد سے بنیادی ملٹری ٹریننگ مکمل ہونے کے بعد چترال کی پراسرار وادیوں میں پوسٹنگ ہوگئی۔ کیلاش قبیلے کی کہانیاں سنتے تھے، اب دیکھنے کا موقع مل رہا تھا مگر لوگ ڈرا رہے تھے کہ چترال اسکاؤٹس کا کمانڈنٹ صدرِ پاکستان جتنا پاورفل آدمی ہے اور اس کے ساتھ نوکری کرنا پل صراط پار کرنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔

یونٹ جوائن کی تو لوگوں نے بتایا کہ یہاں درختوں کے پتے بھی کمانڈنٹ کی مرضی سے ہلتے ہیں مگر کمانڈنٹ سے ملا تو انھیں انتہائی شفیق اور ملنسار انسان پایا۔ کہنے لگے کہ ڈاکٹر یہ ایسے لاوارث لوگوں کی وادی ہے جہاں ان کے دکھ سکھ سننے کو اوپر خدا اور نیچے ہمارا ڈاکٹر ہوتا ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم آفیسری کرنے سے زیادہ ہمدرد ڈاکٹر بننے کی کوشش کرنا اور میری رہنمائی کرتے رہنا کہ ہم مل کر ان کی صحت مند زندگی کے لیے کس طرح آسانیاں پیدا کر سکتے ہیں۔ میری پہلی ملاقات میں کمانڈنٹ مجھے سنی سنائی باتوں سے بالکل ہی مختلف نظر آئے۔ مگر عمومی طور

پر ان کے رعب و دبدبے کی کہانیاں اس تین سو کلومیٹر کے چترال وادی میں ہر انسان سے سنی جاسکتی تھیں۔ چترال کے چپے چپے میں دو سال گزرنے کے بعد مجھ پر ان کے دبدبے کے راز کھلنے شروع ہوئے کہ اس شخص کی ایمان داری اور انسانوں سے محبت نے ہر چیز کو اس کی ذات کے سحر میں جکڑ رکھا ہے اور لوگ ان کی عزت کرتے تھے مگر دور سے دیکھنے والے اسے رعب و دبدبے سے تشبیہ دیتے تھے۔

دروش قلعے میں میرا بیس بستروں کا چھوٹا سا ہاسپٹل تھا۔ میں نے خوب محبت کی اور کمانڈنٹ جوانوں کی صحت کے بارے میں میری رائے کو حتمی درجہ دینے لگے۔ کوئی آفیسر کبھی اعتراض بھی کرتا تو کہتے کہ جس شخص نے پانچ سال ڈاکٹری کی کتابیں پڑھی ہیں، ہم اس کی رائے کو کیسے جھٹلا سکتے ہیں اور یہی بات مجھے دن رات چین سے بیٹھنے نہ دیتی کہ مجھ پر کتنی بڑی ذمہ داری آن پڑی ہے۔

دروش سے جیپ میں چترال اور پھر مستوج تک آٹھ گھنٹے کا سفر طے کیا جاتا اور وہاں سے آگے پہاڑوں میں دس گھنٹے پیدل چل کر بروگل پوسٹ پر ہمارے جوان ڈیوٹی پر جاتے تھے اور ان کے ساتھ ایک آفیسر بھی ہوتا تھا۔ ایک دن کمانڈنٹ نے مجھے بلایا اور بے حد سنجیدگی سے مخاطب ہوئے کہ میں جس آفیسر کو بروگل پوسٹ پر بھیجتا ہوں وہ جوانوں سے لڑنے لگتا ہے، بدتمیزیاں کرتا ہے اور بالکل بدل جاتا ہے۔ اس کا کوئی میڈیکل پہلو ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں نے یہ پوسٹ دیکھی ہی نہیں تھی تو کیا رائے دیتا اور یہی بات کہہ بیٹھا۔ فوراً حکم صادر ہوا کہ سامان باندھو اور پوسٹ پر جاؤ اور اس آفیسر کو واپس بھیج دو۔ مرتا کیا نہ کرتا، دوسری صبح اس پوسٹ کو سدھار لیا۔

یہ ساڑھے انیس ہزار فٹ بلندی پر برف میں دو بنکرز پر مشتمل چھوٹی سی پوسٹ تھی۔ ایک بنکر میں آٹھ سے دس جوان رہتے اور دوسرے میں اکیلا آفیسر۔ کرنے کو کچھ نہ تھا۔ کھانے میں چار دفعہ بھی مانگیں تو دال ہی پکتی تھی اور برف سے پگھلا ہوا پانی سارا دن پیتے۔ چائے پینے سے دو دن بعد ہی نفرت ہوگئی۔ صرف ایک چیز اچھی تھی کہ وائرلیس سیٹ پر ہم روزانہ چترال بات کر سکتے تھے۔ میں روز صبح چترال میں آپریٹر سے پوچھتا کہ پی آئی اے کی فلائٹ آئی کہ نہیں؟ مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ یہ سوال میں روز کیوں پوچھتا تھا، حالاں کہ نہ میں نے کہیں جانا تھا نہ

مجھے کوئی ملنے آنے والا تھا۔

پوسٹ پر دسواں دن تھا۔ پیغام ملا کہ کمانڈنٹ بات کریں گے۔ میں وائرلیس سیٹ پر گیا تو کمانڈنٹ نے پوچھا، ڈاکٹر کیسے ہو؟ تمھیں تو کوئی پرابلم نہیں؟ میں زندگی سے تنگ بیٹھا تھا کہہ دیا، کہ سر ٹھیک ہوں مگر خودکشی کرنے کو دل چاہتا ہے کہ ایسی مشکل زندگی جی کر کیا کرنا ہے۔ سن کر کچھ لمحوں کو چپ ہو گئے اور پھر کہنے لگے، بیٹا صبح پوسٹ سے نیچے اترنا شروع کرو۔ جیپ مستوج سے لینے آ جائے گی۔

جب میں دروش پہنچا تو رات کو جوانوں کے ساتھ اسٹوک پارٹی رکھی گئی۔ اس میں جوان دف پر چترالی ڈانس کرتے تھے اور آخر میں اس آفیسر کو بھی ڈانس کرنا پڑتا تھا جس کے اعزاز میں اس کا اہتمام کیا جاتا۔ وہ چترالی ڈانس مجھے پل بھر میں بروگل پوسٹ کی برف سے کھینچ کر دروش کی زندگی میں واپس لے آیا اور مجھے کوئی مشکل یاد نہ رہی۔

دوسری صبح کمانڈنٹ نے اپنے آفس میں بٹھا کر مجھ سے میڈیکل ایڈوائس لکھوائی کہ بروگل پوسٹ پر کوئی آفیسر دس دن سے زیادہ نہیں رہ سکتا اور پھر یہ چترال اسکاؤٹس میں اس پوسٹ پر ڈیوٹی کی مدت میں شامل کر دیا گیا۔ جو شاید آج بھی رائج ہو۔ نہ جانے وہ لوگ کہاں سدھار گئے جو پیشوں کی قدر کرتے تھے اور ماہرانہ رائے پر لوگوں کی بھلائی کے لیے قانون بدل دیتے تھے۔

ہم سولجر ہیں بس

کرنل مراد خان نیر کے ساتھ ۱۹۸۴ء میں نوکری شروع کی تو میرا فوج کی ملازمت کا دورانیہ صرف ایک سال تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فوج کے زیادہ تر سینئر افسر عمومی طور پر سولجر ہی تھے۔ ان کی زندگی کا محور اپنی یونٹ، اپنی میس اور اپنے لوگ ہوتے تھے۔ افسر ہو یا سپاہی، ابھی تک کینٹ کی زندگی کے علاوہ باہر کی رعنائیوں سے بے خبر تھے۔ آپ کسی یونٹ کو جوائن کرتے تو ایسا محسوس ہوتا کہ بس ان کو آپ ہی کا انتظار تھا۔

میں دروش پہنچا تو مجھے بھی ایسا ہی لگا جیسے ایک باپ نے بچے کو گلے لگایا ہو۔ کرنل مراد کسی

جونیئر افسر کو ملتے تو اس طرح گلے لگاتے جیسے اپنے بیٹے کو پیار کر رہے ہوں۔ مجھے فوج میں چلنا پھرنا، کب ہاں کہنا، کب نہ کہنا کرنل مراد خان نیر نے سکھایا۔ میں اب بھی اپنی شخصیت کی ساری اچھائیوں اور برائیوں کا ذمہ دار ان کو سمجھتا ہوں۔ ان کی شخصیت کی چھاپ مجھ پر اتنی گہری تھی کہ فوجی ضرورتوں کے باوجود بھی میں اس سے نکلنے کی کبھی شعوری کوشش نہ کر سکا۔ مجھ پر سیکڑوں دفعہ الزام لگا کہ میں قانون کے دائرے سے باہر نکل کر کام کرتا ہوں مگر مجھے اس جرم پر کبھی کوئی سزا نہ ملی۔ سوچتا ہوں، اگر میں قانونی پیچیدگیوں کو بالائے طاق رکھ کر لوگوں کا بھلا کرتا رہا اور سزا سے بھی بچتا رہا تو غلط کیا تھا۔ اس وقت چترال اسکاؤٹس میں جن آفیسرز نے نوکری کی، وہ خوش قسمت تھے کہ انھوں نے ایک سچے اور پکے سولجر کی کمانڈ کے مزے لوٹے۔ سب اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ اور میں آفیسرز میس میں اکیلا رہتا تھا۔

سالوں تک دوپہر اور شام کا کھانا کمانڈنٹ کے ساتھ کھایا۔ ایمان دار افسر کیسا ہوتا ہے، باتوں سے نہیں آنکھوں سے دیکھا۔ سچا سپاہی کسے کہتے ہیں، سپاہی کٹتا ہے جھکتا نہیں کا مشاہدہ سیکڑوں دفعہ کیا۔ دروش آفیسرز میس میں کور کمانڈرز کے جمگھٹے، وزیروں سفیروں کی چاپلوسیاں، ٹاپ بیوروکریسی کی پھرتیاں، زبانوں کے سپاہی، ملک وقوم کی محبت کے مجنوں، دیسی گھی کی چُوری کھاتے رانجھے، اللہ سے زیادہ جنرل ضیاء الحق کی خوش نودی کے متمنی بے وضو نمازی، دنیا جہان کے سفیروں کے ٹولے، ڈالرز اور اسلحے کے ذخیرے دیکھے۔ مجاہدین کو دیا گیا جنگی اسلحہ دروش، میرکھنی اور ارندو کے بازاروں میں کوڑیوں کے بھاؤ بکتا دیکھا۔ کمانڈنٹ کہتے کہ ان سے کہو، میرے علاقے سے تو باہر جا کر بیچیں۔ نام نہاد نامی گرامی افغانی مجاہدین کو دروش ہاسپٹل کے لان میں گھنٹوں ڈالروں کا انتظار کرتے دیکھا۔

اور پردے کے پیچھے طاقت اور اختیارات کو مراد خان نیر کی ذات میں یک جا ہوتے دیکھا مگر تکبر کا نام ونشان نہ تھا۔ طاقت کے ناجائز استعمال کا شائبہ تک محسوس نہ ہوا۔ طاقت اور اختیارات کو خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے استعمال ہونے کے نمونے دیکھے۔ افغان وار کے ساتھ کرنل مراد خان نیر کے اختیارات بڑھتے گئے اور ہم ان سے مزید عاجزی سیکھتے گئے۔ ان کی لیفٹیننٹ کرنل سے آگے پرموشن نہیں ہوئی تھی جب کہ یونٹ تین سو کلومیٹر ایریا میں پھیلی ہوئی

تھی۔ پہلی دفعہ جب جنرل ضیاء الحق چند گھنٹوں کے لیے دروش آئے تو کرنل مراد خان سے کہنے لگے کہ ضرورت کے تحت ہی اب آپ کرنل کا رینک لگا لیں۔ میں بہت قریب کھڑا یہ سن رہا تھا اور خوش تھا کہ پلک جھپکتے پرموشن ہوگیا مگر حسبِ معمول ان کی سولجری آڑے آتے دیکھی۔ کمانڈنٹ کہنے لگے، سر اس طریقۂ کار سے کوئی نائیک، حوالدار تو بن سکتا ہے مگر آفیسر کا اگلا رینک نہیں لگتا۔ اگر آپ کو یہاں کرنل رکھنا ہے تو ہم کسی کو بھی خوشی سے قبول کر لیں گے۔ جنرل ضیاء الحق بس مسکرا کر رہ گئے۔

لوگوں کا خیال تھا کہ میں ان کا بہت لاڈلا افسر ہوں اور میرا یہ حال تھا کہ روز کسی نئی مصیبت سے بچنا پڑتا تھا۔ پنڈی اور اسلام آباد سے ہیلی کاپٹر میں روز کوئی نیا حکومتی پرزہ یا کوئی نیا اسٹیٹ گیسٹ آ کر چترال یا دروش آفیسرز میس میں ڈیرے ڈال دیتا۔ مہمان داری میرے ذمہ ہوتی اور کمانڈنٹ سے ہدایات ملتیں کہ تم ان تین دنوں کے لیے اندھے بہرے اور گونگے ہو۔ تمھارا ان سے تعلق صرف ہیلی کاپٹر اڑ جانے تک ہونا چاہیے۔ کسی لالچ میں اپنی وردی داغ دار نہ کرنا۔

مجھے تاریخیں یاد نہیں مگر ۱۹۸۵ء یا ۱۹۸۶ء میں کمانڈنٹ نے بتایا کہ جنرل فضل حق اور میاں نواز شریف تین چار دن گزارنے چترال آ رہے ہیں۔ مجھے کہا کہ آپ ان دنوں کے لیے میاں نواز شریف کے ساتھ ڈیوٹی کرو گے مگر یاد رکھو، کسی سیاست دان کے ساتھ ڈیوٹی کرنے کا تمھارا یہ پہلا تجربہ ہوگا۔ تمھارے قول و فعل سے سپاہی نظر آتا رہے۔

میں مہمانوں کے استقبال کے لیے پہلے ہی گرم چشمہ پہنچ چکا تھا۔ رات کو ڈنر کے بعد پیغام ملا کہ کمانڈنٹ بات کرنا چاہتے ہیں۔ میں ایکسچینج میں جا کر بیٹھ گیا۔ کافی دیر کے بعد لائن ملی تو کہنے لگے، میں بھی صبح پہنچ رہا ہوں اور میاں نواز شریف صاحب کو خود خوش آمدید کہوں گا کیوں کہ جنرل فضل حق ایسا چاہتے ہیں۔ مجھے سگنل والوں سے پھر ایک اور پیغام ملا کہ میاں صاحب دریائے ٹرچ میر میں ٹراؤٹ کا شکار کرنا چاہتے ہیں، اس لیے فشنگ کا سامان بھی چیک کر لوں۔

او میرے خدا۔ صبح دس بجے دو ہیلی کاپٹر اترے۔ ایک وزیرِ اعلیٰ پنجاب کا جس میں میاں صاحب خود سفر کر رہے تھے اور دوسرا گورنر سرحد کا جس میں سے ذاتی سکیورٹی، ذاتی باورچی، ذاتی نوکر چاکروں کی ایک فوج اتری۔ ایسا لگتا تھا کوئی بادشاہِ وقت دبئی سے شکار پر آیا ہو۔ فیصلہ ہوا

کہ ایک گھنٹے بعد فشنگ پر جائیں گے۔

یہاں موسم پورا سال ٹھنڈا رہتا تھا اور چھ مہینے برف پڑتی تھی مگر گرم چشمہ آفیسرز میس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ سنگل اسٹوری شیلے طرز کی بلڈنگ میں چاروں طرف کمرے ہیں اور درمیان میں سوئمنگ پول جس میں قدرتی گرم چشمے سے ابلتا ہوا پانی بھاگتا آتا ہے اور اچھلتا کودتا تالاب کو بھر کر کناروں کے اوپر سے ہوتا سیدھا دریا میں چلا جاتا ہے۔ باہر برف باری بھی ہو تو ہیٹر کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کمروں سے نکل کر اگر آپ سوئمنگ پول کے کنارے بیٹھ جائیں تو لگتا ہے آپ کسی سیون اسٹار ہوٹل کے چوگوزی میں اسٹیم باتھ کے مزے لے رہے ہیں۔ میاں نواز شریف کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب قدرت کی مہربانیاں ہیں۔ بلڈنگ سے نکلے، چلتے ہوئے پیچھے دوسوفٹ اوپر پہاڑی سے نکلتے ہوئے پانی تک گئے اور حیرت کے مارے دیر تک کھڑے رہے۔

ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ میاں صاحب کے اسٹاف کو قابو کرنا اور یہ باور کروانا تھا کہ یہ لاہور نہیں ہے۔ میس کے اندرونی اور بیرونی دروازوں پر ذاتی گارڈ موجود، کچن میں ذاتی باورچی موجود اور کمرے کے باہر ذاتی ملازم موجود۔ مجھے لگنے لگا جیسے میں ان کے گھر مہمان آیا ہوں اور اب ان کی اجازت کے بغیر مجھے بھی کھانے پینے کو کچھ نہیں ملے گا۔

میں نے باہر جا کر سارا حال کمانڈنٹ کو سنایا۔ جب ان کو غصہ آتا تھا تو وہ اپنے مکمل گنجے سر پر خوب کھجاتے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ کہنے لگے، رجمنٹل پولیس حوالدار کو بلواؤ۔ وہ آیا تو کہا، ذاتی باورچی اور سرونٹ کو چھوڑ کر سب کو جے سی او میس میں لے جاؤ اور سمجھو یہ سب کوارٹر گارڈ میں بند ہیں اور ان کے لیے آفیسرز میس میں داخلہ ممنوع ہے۔ ایسا ہی ہوا اور پھر ہم نے ان پہلوانوں کو تیسرے دن ہیلی کاپٹر اڑنے سے ذرا پہلے دیکھا۔ نواز شریف صاحب نے ایک آدھ دفعہ پوچھا بھی تو کرنل مراد نے خود ہی کہہ دیا کہ وہ بھی ہمارے خاص مہمان ہیں اور مزے میں ہیں۔

میاں صاحب فشنگ کرتے رہے اور ایک اے سی بابو ان کی ایک پاؤ کی پکڑی فش کو ایک ایک کلو کی بتاتے رہے۔ میرا کام صرف ان کے ساتھ ساتھ رہنا تھا یا کبھی کبھار جو پوچھتے، اس کا

جواب دیتا۔ میس حوالدار ایس او پیز کے مطابق ٹراؤٹ فش کا بندوبست کر کے ان کے باورچی کو دے چکا تھا۔ ہم واپس آئے تو لنچ کم ڈنر تیار تھا۔ کھانا ٹیبل پر سجا تو میاں صاحب نے پہلے کمانڈنٹ کو شروع کرنے کی دعوت دی۔ ہم اپنی ہی میس میں مہمان لگ رہے تھے۔ زندگی میں پہلی دفعہ کریم میں بنی تازہ ٹراؤٹ کھائی اور مالِ غنیمت سمجھ کر خوب کھائی۔

ہم آٹھ بجے سونے کے عادی تھے مگر آج مہمان داری کے آداب بھی نبھانے تھے۔ اس لیے بھاپ اگلتے سوئمنگ پول کے کنارے کرسیاں لگیں اور شاید کشمیری چائے آ گئی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میاں صاحب نے کمانڈنٹ سے کہا، مجھے پنجاب کے لیے ایک اچھے چیف سیکریٹری کی تلاش ہے۔ کرنل مراد نے کہا جی سر پنجاب میں تو بڑے اچھے اچھے اور تجربے کار افسر ہوتے ہیں۔ کہنے لگے، آپ کا خود کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اب ہم یہ سمجھ گئے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ کمانڈنٹ کہنے لگے، سر، جنرل ضیاء الحق کی وجہ سے نوکری نبھا رہا ہوں ورنہ اب نوکری کرنا تو کیپٹن بشیر جیسے جوانوں کا کام ہے۔ نواز شریف صاحب نے اب تو حد ہی کر دی۔ کہنے لگے، کپتانوں کے لیے جگہ نکالنا کون سا مشکل کام ہے۔ کیپٹن بشیر کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں، بس آپ ہاں کریں۔

کمانڈنٹ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ سر، ہم تو سولجر ہیں سولجر اور وہ بھی پکے سولجر۔ ہمارا سول اداروں میں کیا کام۔

مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے، ڈاکٹر اٹھو بھئی مہمانوں کو سونے دینا چاہیے۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے بڑبڑاتے رہے، وڈا چیف سیکریٹری لان آیا اے۔

خاکی ہنستے بھی ہیں

کرنل مراد خان نیر کو چترالی لوگ بابائے چترال کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ سوچا ان کی روزمرہ کی باتیں بھی یاد کروں۔

خیال یہ تھا کہ کرنل مراد ہنسنا ہنسانا بھول چکے ہیں۔ کام، کام اور کام نے ان کی شخصیت کو

مشینی سا بنا دیا تھا۔ لوگ ان کے پاس اپنی مشکلات اور مسئلے لاتے، ان کو حل کرواتے اور اپنا راستہ لیتے۔ ۳۱راگست ۱۹۸۹ء کو رحلت پر ان کی عمر پینسٹھ سال تھی۔ ذمہ داریوں اور رکھ رکھاؤ نے ان کی شخصیت کو اس طرح تقسیم کر دیا تھا کہ آفس میں وہ مردِ مجاہد اور سولجری کا نمونہ ہوتے لیکن میس اور سن روم میں وہ خوش گپیوں اور لطیفوں کی محفل سجاتے۔ مجھے ان کا خودساختہ حصار توڑنے میں ایک سال لگا۔ وہ دن میں ساٹھ ستر سگریٹ پیتے اور میں نے ان کی سگریٹ نوشی کم کروانے کے لیے بہت دفعہ ڈانٹ کھائی کیوں کہ میں سگریٹ چھپا دیتا تھا۔

ایک دن کہنے لگے، جنرل ضیاء الحق کو دیکھو کیسی باتیں کرتے ہیں۔ آج مجھ سے پوچھ رہے تھے، چاپلوسی آتی ہے؟ میں نے بھی کہہ دیا کہ سر آپ کے ساتھ نوکری کر رہے ہیں، اس خوبی سے یکسر عاری تو نہیں ہوسکتے۔ بہرحال انھوں نے کہا ہے کہ کل آسٹریا کی فنانس منسٹر دروش تشریف لا رہی ہیں جو لواری ٹنل کے لیے فنڈز کا وعدہ کر رہی ہیں۔ بس اس کی خوب چاپلوسی کرنی ہے تاکہ اس سے فنڈ لیے جاسکیں۔

دوسرے دن مہمان خاتون آئیں تو ہم نے پلاننگ کے تحت چاپلوسی شروع کر دی۔ پولو میچ اور ڈنر کے بعد آشٹوک (چترالی ڈانس) کا اہتمام کیا گیا۔ خاتون ایسے اہتمام پر واری واری ہو رہی تھیں۔ کمانڈنٹ رات کو کہہ کر چلے گئے کہ صبح ناشتا جلدی کروا دینا ہم نے زیارت اور لواری ٹاپ کا چکر لگانا ہے۔ صبح مسز سلویا جیمس ناشتے کے بعد لان میں چترالی ٹوپی پہن کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فوٹو بنوانے لگیں۔ میں ہچکچایا مگر اس کے لیے یہ نارمل سی بات تھی۔ اسی لمحے کرنل مراد کی جیپ آ کر رکی۔ دیکھا تو انتہائی غصے میں مجھ سے کہا کہ یہ خاتون اسٹیٹ گیسٹ ہے، کوئی بات نکلی تو تمھیں پھانسی لگوا دوں گا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا، سر میں نے بہت روکنا چاہا مگر کہتی ہیں، یو آر بیچلر یو نیڈ اٹ۔ کرنل صاحب ایک دم ہنسنے لگے اور کہا، اوئے پاگلا، دس ناں میرا کرنل وی بیچلر اے۔ (پاگل اسے بتاؤ کے میرا کرنل بھی بیچلر ہے۔)

ہمارے اکاؤنٹ افسر میجر ملک اقبال عرف بالا جو سروس کے آخری سال میں تھے، ایک دن استری سے داغ دار پتلون پہن کر آفس آ گئے۔ کرنل صاحب ناراض ہوئے کہ سینئر افسروں کا اس طرح داغ دار وردی پہننا ٹھیک نہیں۔ میجر اقبال کہنے لگے، سر بس بیٹ مین جو رکھ دے پہن لیتا ہوں۔ مجھے اب کچھ پتا نہیں چلتا کیا پہنا ہے۔ کرنل صاحب ہنستے ہنستے مجھ سے کہنے لگے،

ڈاکٹر، ملک صاحب کے بیٹ مین کو قابو کر وا اور اسے کہو کل صبح پہننے کو صرف شرٹ ہی رکھے۔

میجر حسن گردیزی اور میجر اعظم مرزا صبح صبح پولو کے گھوڑوں پر سیر کو نکل گئے۔ واپسی پر کرنل مراد نے دیکھ لیا۔ خوب ناراض ہوئے۔ دونوں آفیسرز کو خوب ڈانٹا کہ پولو کے گھوڑوں کو خراب کر رہے ہو۔ صوبے دار میجر کو بھی ڈانٹ پڑی تو پوری یونٹ میں خاموشی اور افسردگی چھا گئی۔ میں مریضوں سے فارغ ہوا تو کمانڈنٹ نے مجھے آفس میں بلا کر کہا، صبح میں نے غصے میں بڑی گڑبڑ کی ہے۔ تم تمام آفیسرز کو کوئی بہانہ بنا کر لنچ کی دعوت دے دو۔ کچھ ماحول کو ٹھیک کر لو۔

چترالی سولجرز کے ساتھ میں ہر فنکشن میں اٹھ کر ڈانس کرنے لگتا۔ ڈھول کی آواز آتی اور میں جوانوں میں کود جاتا۔ ایک دفعہ ہم بازار میں کسی مسئلے میں کھڑے تھے کہ بارات گزری۔ انھوں نے گزرتے ہوئے بس کی چھت پر ڈھول بجانا شروع کیا۔ کرنل مراد نے جلدی سے میرا بازو پکڑ کر اپنے ساتھ لگا لیا اور کہا، بازار ہے شروع نہ ہو جاویں۔ حالاں کہ خود بھی بچوں کے ساتھ اشٹوک کر کے خوب انجوائے کرتے۔ ایک دفعہ ہم میس میں گئے تو وہ سن روم سے باہر بیٹھے فائلیں دیکھ رہے تھے۔ ہم تین چار افسر دور کرسیاں لگا کر بیٹھ گئے۔ وہ فارغ ہو گئے مگر ہم الگ ہی بیٹھے رہے تو تنگ آ کر ہمیں آواز دی اور کہا، بھئی کرنل ہندوئیں ہوندے۔ مجھ سے بھی گپ لگایا کرو۔

اکثر کہتے کہ آفیسر جتنا سینئر ہوتا ہے اتنا ہی تنہا ہوتا جاتا ہے اور میں اب یہ ہر شعبۂ زندگی میں دیکھ رہا ہوں۔ مجھے نصیحت کرتے تھے کہ اگر کمانڈ کے مزے لینے ہے تو جونیئرز کی دیکھ بھال کرتے رہنا۔ سینئر کو تو سہولیات مل ہی جاتی ہیں۔ یہ ان ہی کی ٹریننگ کا نتیجہ تھا کہ میرے اکثر جونیئر مجھ سے خوش اور سینئرز مجھ سے نالاں رہے۔

بے چارے بیوروکریٹس

شندور پولو فیسٹیول میں وزیرِ اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو میچ دیکھنے آئیں۔ ان کا ایک سیکریٹری میاں نواز شریف صاحب کے ساتھ بھی ہوتا تھا اور گرم چشمہ آ کر نواز شریف صاحب کے ساتھ ٹراؤٹ مچھلیاں پکڑتا تھا۔ گو کہ وہ ہمارے کمانڈنٹ کا دوست بھی تھا اور ہم انھیں جانتے بھی تھے مگر پھر بھی حیران تھے کہ ان کی ایسی کیا خوبیاں ہیں کہ یہ دونوں حکومتوں کے لاڈلے نکلے اور

میاں صاحب کے بعد محترمہ کے ساتھ بھی فٹ۔

کرنل مراد خان نیر نے نہایت رازداری سے پوچھا، سر، محترمہ اور میاں صاحب کے ساتھ نوکری میں زیادہ اچھا تجربہ کس کے ساتھ رہا؟ سیکریٹری صاحب روہانسی صورت بنا کر بولے، کرنل صاحب دونوں پرائم منسٹرز کے ساتھ ہم بیوروکریٹس کا مسئلہ بالکل ایک ہی جیسا ہے۔کرنل مراد نے حیرت سے پوچھا، سر وہ کیسے؟

سیکریٹری صاحب سرگوشی میں کہنے لگے، کرنل صاحب، بس میاں صاحب سمجھتے نہیں تھے، بی بی سنتی نہیں ہیں۔ہم سب سیکریٹری صاحب کی بات سن کر خوب ہنستے رہے۔

زمانہ گزر گیا۔تبدیلی آ گئی۔شکر ہے، اب اس طرح کے سوال پوچھنے والے کرنل مراد خان نیر نہیں رہے ورنہ ان کا کوئی نہ کوئی سیکریٹری دوست رو رہا ہوتا کہ ہائے لوگو! وہی میاں صاحب اور بی بی رانی اچھے تھے۔

یہ والا تو ٹو ان ون ہے۔نہ سنتا ہے نہ سمجھتا ہے۔

چترال سے مکہ مکرمہ تک

ایبٹ آباد سے بنیادی ملٹری ٹریننگ کے بعد پہلی پوسٹنگ پر ۱۷/اگست ۱۹۸۴ء کو چترال اسکاؤٹس دروش پہنچا اور میں آج تک یہی کہتا ہوں کہ اللہ کا شکر ہے مجھے پہلا کمانڈنٹ کرنل مراد خان نیر جیسا شخص ملا۔فوج میں چلنا پھرنا، بولنا بات کرنا اور ایمان داری سے نوکری کرنا اسی شخص نے سکھایا۔اس لیجنڈ فوجی کی اپنے انڈر کمانڈ لوگوں کے لیے بے شک شفقت تو پدرانہ تھی اور وہ کھلاتا سونے کا نوالہ تھا مگر دیکھتا شیر کی آنکھ سے تھا۔فوجی وردی میں بھی وہ انسان اچھا تھا۔ لواری ٹاپ سے شندور تک کمانڈ تھی مگر نہ تکبر تھا نہ احساسِ برتری۔رعب داب بے تحاشا مگر دل موم کا تھا۔ایک کمال اور تھا کہ جو سبق دیتا اس کا رول ماڈل بھی خود ہی ہوتا۔نہ جانے ہم اس سے ڈرتے زیادہ تھے یا اس کی عزت زیادہ کرتے تھے۔مگر کوشش یہ ہوتی تھی کہ کوئی ایسا غلط کام نہ کر بیٹھیں جس سے وہ ناراض ہو جائے۔

میں چترال اسکاؤٹس ہیڈ کوارٹر کی آفیسرز میس کے معاملات سنبھالتا تھا۔ مجھے اکثر کہتے کہ جونیئر آفیسرز مہمان بنیں تو ان کا زیادہ خیال رکھا کرو۔ سینئرز تو ڈنڈے کے زور پر اپنا خیال کروا ہی لیتے ہیں۔ ان کا جینا مرنا خاکی وردی تھی۔ جنرل ضیاء الحق سے ذاتی مراسم تھے مگر کبھی کوئی ذاتی فائدہ نہ اٹھایا۔ ڈی ایچ اے کے پلاٹ، عسکری کے گھروں اور ریٹائرمنٹ پر زمینوں کی الاٹمنٹ سے ان کا کوئی سروکار نہ تھا اور یہی ہمیں سکھاتے تھے۔ ان کے ساتھ اڑھائی سال پلک جھپکتے گزر گئے اور میری پوسٹنگ کوئٹہ ہوگئی۔ کرنل مراد نے شادی نہیں کی تھی۔ اپنوں سے ناراض تھے۔ مجھ سے وردی میں کمانڈنٹ کی طرح بات کرتے مگر شام کو میس میں بیٹھ کر بیٹا بنا لیتے۔ میری پوسٹنگ پر زیادہ خوش نہ تھے۔ کہنے لگے، چلے جاؤ مگر واپس آؤ گے۔ میری چترال اسکاؤٹس میں دوبارہ بھی پوسٹنگ ہوئی۔ اس کا ذکر آگے کروں گا۔

کور صوبے دار میجر کو بلا کر کہا کہ کیپٹن بشیر کو چترال اسکاؤٹس کی روایات کے مطابق خدا حافظ کرنا ہے۔ میں حیران رہ گیا کہ میری دعوتوں کا سلسلہ پورے سات دن تک پھیلا دیا گیا۔ جوانوں کی طرف سے ہر ونگ میں، ہیڈ کوارٹر میں، جے سی اوز میس میں، اپنے اسٹاف کی طرف سے ہاسپٹل میں اور آفیسرز میس میں الگ الگ کھانے کا اہتمام ہو رہا تھا۔ پولو میچ بھی ہوا اور چھ سات راتوں میں اشٹوک (چترالی ڈانس) کا اہتمام الگ رہا۔ یہ سب مجھے ہر لمحہ مغموم کر رہا تھا۔ حد یہ تھی کہ ہر دعوت میں شہر سے بے شمار سول لوگ بھی بلائے جاتے کیوں کہ میں ان کے دکھ سکھ میں شریک ہونے اور علاج معالجے کے لیے ہر ہر گاؤں تک جاتا رہا تھا اور ان کی محبتوں کے مزے لوٹتا رہا تھا اور اب وہ مجھے خدا حافظ کہنے کو جمع ہو جاتے تھے۔

چترال اسکاؤٹس سے میری الوداعی تقریب کے منظر مجھے آج بھی رلا دیتے ہیں۔ مجھے چترال اسکاؤٹس ہیڈ کوارٹر نے لنچ کے بعد الوداع کہنا تھا۔ آفیسرز میس میں لنچ ہوا۔ کیپٹن انجم پرویز کے ساتھ مجھے کوارٹر گارڈ پر سلامی دی گئی اور جب میں کوارٹر گارڈ کے جوانوں سے گلے مل رہا تھا تو نہ وہ ضبط کر سکے نہ میں۔ سب رو دیے۔ کرنل مراد بھی دور کھڑے چشمہ اتار کر آنکھیں صاف کرتے رہے۔ میں سب دیکھ رہا تھا اور وردی کو دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھ رہا تھا کہ یہ محبتیں باقی اداروں میں کہاں۔ جب دروش قلعے کے گیٹ سے باہر نکلا تو سامنے فوجی بینڈ بجنے لگا

اور حدِ نظر تک سڑک کے دونوں طرف جوان ہار لیے کھڑے تھے۔ میں نے کرنل مراد کی طرف دیکھا تو میری آنکھوں سے محبت اور عقیدت کے آنسو رواں ہو گئے۔ مجھے انھوں نے بڑھ کر یوں گلے سے لگایا جیسے کوئی باپ اپنے چھوٹے سے بچے کو شدتِ جذبات سے مضبوط گرفت میں لے لے۔ بینڈ یک دم خاموش ہوا اور قلعہ کے چاروں کونوں پر پکٹس سے فائر شروع ہو گیا اور اگلے دو منٹ تک ہم صرف گولیوں کی گونج سنتے رہے۔ قلعے کے دروازے سے دروش بازار تک ایک فرلانگ کا راستہ میں نے دو گھنٹوں میں طے کیا اور تب جا کر میں جیپ میں بیٹھا تا کہ چترال جا سکوں۔ میرے گلے میں ڈالے جانے والے ہار نہ جانے کتنی دفعہ زیادہ ہو جانے پر اتارے گئے اور جوانوں کو ڈانٹا گیا کہ اب بس کرو۔ اسے چترال جانے دو۔

یہ تھیں وہ فوجی روایات جن کی وجہ سے وردی والے اپنے ملک و قوم کے لیے ہنستے کھیلتے شہید ہو جاتے ہیں اور سبز پرچم میں شہید گھر پہنچتا ہے تو باپ سینہ تان کر کہتا ہے کہ میں شہید کا باپ ہوں۔ اب سب بدل سا رہا ہے۔ وردی والے بھی اور پوری قوم بھی۔ سمجھ ہی نہیں آ رہا کہ کیسے تین چار دہائیوں کو واپس کھینچ لاؤں۔ وہی فوجی ہوں اور وہی قوم کی محبتیں۔

میں نے جیپ میں بیٹھنے سے پہلے آفیسرز کو خدا حافظ کہا اور کمانڈنٹ کو سلیوٹ کیا تو وہ ہنس کر کہنے لگے، یہاں نہیں، چلو چترال چلتے ہیں، ہم تمھیں وہاں خدا حافظ کہیں گے۔ دروش سے چترال کا سفر ان دنوں دو گھنٹوں کا ہوتا تھا۔ ہم سب چترال پہنچ گئے۔ رات کو چترال ونگ نے دوبارہ ڈنر اور اشٹوک کا اہتمام کر ڈالا۔ خوب مزے کیے۔ جوانوں کے ساتھ میں نے بھی خوب ڈانس کیا۔ ۲۷ر ستمبر ۱۹۸۶ء کی صبح مجھے ائیر پورٹ پر سب خدا حافظ کہنے جمع ہوئے تو نہ جانے میں کتنی ہمت کر کے چپ چاپ پشاور کے لیے جہاز میں جا بیٹھا۔

چترال اسکاؤٹس کی اڑھائی سال کی خوب صورت یادوں کے ساتھ میں اپنی دوسری پوسٹنگ پر روہڑی اور سکھر کے درمیان کھجوروں کے باغ میں ڈیرے لگائے اپنی فیلڈ میڈیکل یونٹ میں پہنچا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سندھ پر ڈاکوؤں کا ایسا راج تھا کہ پولیس ان کے سامنے بے بس نظر آتی تھی۔ بسوں کو سرِ عام لوٹا جاتا تھا۔ لوگوں کو تاوان کے لیے اغوا کیا جاتا تھا اور وقت پر پیسے نہ پہنچتے تو انھیں قتل کر دیا جاتا۔ صورتِ حال صوبائی حکومت سے مکمل بے قابو ہوئی تو آرمی

کے ۱۶/ انفنٹری ڈویژن کو سندھ گورنمنٹ کی درخواست پر کوئٹہ سے سکھر منتقل کر دیا گیا اور اس کے تین بریگیڈ ہیڈ کوارٹرز شکار پور، لاڑکانہ اور پنوں عاقل پہنچ گئے۔ میڈیکل ایڈ کے لیے ہمارا فیلڈ ہاسپٹل روہڑی سیمنٹ فیکٹری کی بلڈنگ میں اور یونٹ کا کیمپ نیشنل ہائی وے پر روہڑی کے قریب کھجوروں کے باغ میں لگا ہوا تھا۔

وردی کی نوکری میں سب دعا کرتے ہیں کہ کمانڈنگ آفیسر اور بیٹ مین اچھا ملتا رہے۔ یہ دونوں لوگ اپنی اپنی طبیعت کے مطابق آپ کی زندگی آسان یا مشکل بناتے ہیں اور اگر آپ بارڈر ایریا یا سکیورٹی ڈیوٹی پر ہوں تو پھر تو سونے پہ سہاگا۔ میں آج بھی اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے کمانڈنگ آفیسرز ہمیشہ اچھے ملے اور فوجی زندگی کے پہلے کمانڈنگ آفیسر کرنل مراد خان نیر کی تربیت کے مطابق اگر سروس کے دوران سینئر کا کچھ برا لگتا تھا تو خود کمانڈنگ آفیسر بننے کے بعد میں نے اپنے جونیئرز کے لیے وہ سب کچھ بہتر کر دیا۔ میں ہمیشہ اس نظریے پر کمانڈ کرتا رہا کہ جو مجھے برا لگتا تھا، وہ اپنے جونیئرز پر کیوں لاگو کروں اور شاید یہی اصول تھا کہ مجھے اپنی تینوں کمانڈ میں کبھی جونیئرز کی حکم عدولی کا مسئلہ درپیش نہ آیا۔ میں جونیئرز کا کمانڈر کم اور سینئر ساتھی زیادہ بنتا رہا۔

نواب شاہ میرا آبائی گھر ہے۔ حالات مزید خراب ہوئے تو اسپیشل سروسز گروپ اپنے ہیڈ کوارٹر سمیت چراٹ سے نواب شاہ پہنچ گیا۔ میری ایس ایس جی کے ساتھ پیرا ٹروپر والی ٹریننگ اور واقفیت کام آئی اور مجھے ہیڈ کوارٹر کے لیے نواب شاہ بھیج دیا گیا۔ میرے خاندان اور بچپن کے دوستوں نے مجھے پہلی دفعہ وردی میں دیکھا۔ بی بی جی تو ہر صبح میرا چھوٹے بچے کی طرح منہ چومتیں اور دعائیں دے کر رخصت کرتیں کہ اللہ کسی بھی انہونے حادثے سے محفوظ رکھے کیوں کہ جنگلوں میں ڈاکوؤں کے ساتھ مڈبھیڑ میں بہت سے جوان اور ۳۲ پنجاب رجمنٹ کے چار آفیسرز شہید ہو چکے تھے۔ سندھ میں ڈاکوؤں اور ان کے سرپرستوں کے لیے بہت لکھنا ہے مگر پھر سہی۔ ڈاکوؤں کے پیچھے بھاگتے دوڑتے سوا سال گزرتے پتا ہی نہ چلا۔

کرنل مراد خان نیر سے جب بھی بات ہوتی وہ کہتے، تمھیں چترالی یاد کرتے ہیں کب ملنے آرہے ہو؟ میرا دل بھی وادیِ چترال سے نکلتا ہی نہ تھا۔ میں نے ایک ماہ سالانہ چھٹی لی اور کرنل مراد کو بتائے بغیر چترال جا پہنچا۔ سوچا تھا سرپرائز دوں گا مگر ائیر پورٹ پر ہی پتا چلا کہ

کیپٹن سہیل بشیر، کیپٹن صاحب زادہ طارق، کیپٹن بشیر آرائیں ۔ بنیادی ملٹری ٹریننگ ایبٹ آباد ۱۹۸۴ء

بنیادی ملٹری ٹریننگ ایبٹ آباد ۱۹۸۴ء

۱۹۸۴ء آرمی میڈیکل کورسینٹر ایبٹ آباد۔کیپٹن بشیر آرائیں،کیپٹن فہیم قائم خانی،
کیپٹن امجد آرائیں اور کیپٹن ظفر منہاس

آرمی میڈیکل کورسینٹر ایبٹ آباد میں بنیادی ملٹری ٹریننگ میں کیمپنگ کے دوران۔

پیراٹریننگ کے بعد زخمی حالت میں ایک یادگار تصویر۔

پیرا جمپنگ سے پہلے سی ون تھرٹی جہاز میں اندر کی تصویر۔

۱۹۸۴ء میں میجر جنرل سردار چودھری سے ایس ایس جی پیرا اسکول پشاور میں پیرا ونگ لیتے ہوئے۔

۱۹۸۴ء میں پیرا ونگ کے حصول کے بعد میجر جنرل سردار چودھری
اور مشہورِ زمانہ کمانڈو بریگیڈیئر ٹی ایم کے ساتھ۔

آفیسرز میس چترال میں آئی جی ایف سی میجر جنرل غازی الدین رانا اپنی فیملی اور والدین کے ساتھ پہنچے ہوئے ہیں اور کرنل مراد بھی انھی کے ساتھ موجود ہیں۔ میں میس پہنچا۔ کرنل مراد بزرگوں کی طرح گلے لگا کر پیار سے ملے۔ آئی جی ایف سی اور ان کے والدِ محترم جنرل بختیار رانا سے تعارف ہوا کہ میں سکھر سے چترال اپنے کمانڈنگ آفیسر سے ملنے آیا ہوں۔ وہ بہت حیران اور خوش ہو کر کہنے لگے، شکر ہے پروردگار کا کہ فوج میں اب بھی یہ محبتیں پائی جاتی ہیں۔

کرنل مراد، جنرل بختیار رانا سے کہنے لگے کہ سر ہم تو کیپٹن بشیر کو دوبارہ چترال اسکاؤٹس میں پوسٹ کروانا چاہتے ہیں مگر ابھی اس کو گئے ہوئے کم عرصہ ہوا ہے۔ انھوں نے فوراً مجھ سے پوچھا، ہاں بھئی دوبارہ پوسٹنگ چاہیے۔ میں اس سوال سے انکار کیسے کرتا۔ ایکسچینج آپریٹر سے کہا گیا کہ جی ایچ کیو میں ایم ایس برانچ ملائے۔ دوسری طرف جنرل فرخ تھے۔ جنرل بختیار نے صرف اتنا بولا، ''فرخ کیپٹن بشیر ہمیں چترال میں چاہیے۔'' اور فون مجھے دے دیا کہ لو بھئی اپنا پی اے نمبر لکھوا دو۔ مجھے چترال میس میں پہنچے بمشکل ایک گھنٹا ہوا تھا۔ میری حالت پر سب زور زور سے ہنس رہے تھے اور میں آنکھیں پھاڑے سب کو ٹک ٹک دیکھ رہا تھا کہ فون پر جنرل فرخ کی آواز آئی، ''یس بشیر، پی ایس ایس ون زیرو ون کے بعد بتاؤ؟''

میں نے اپنا آرمی نمبر بتا دیا اور سوچا کہ کہاں اتنی جلدی دوبارہ پوسٹنگ ہوتی ہے۔ بہرحال لنچ کے بعد ہم پھر لان میں آ بیٹھے۔ سگنل حوالدار نے ایف سی ہیڈکوارٹر کا ایک سگنل لا کر کمانڈنٹ کو دیا اور مجھے مسکراتے ہوئے آہستہ سے سلام کر کے مبارک باد دیتا ہوا واپس چلا گیا۔ کرنل مراد خان نیر زور سے ہنسے اور سگنل مجھے دے دیا۔ یہ میری ایف سی میں دوبارہ پوسٹنگ کا سگنل تھا۔

مجھے نہیں پتا کہ میں آج یہ پوسٹنگ چاہتا تھا کہ نہیں مگر اٹھ کر جنرل بختیار رانا کا شکریہ ضرور ادا کیا۔ کرنل مراد خان نیر نے ایک دفعہ بھی نہ پوچھا کہ میں اپنی پوسٹنگ پر خوش ہوں کہ نہیں۔ سب لوگ اٹھ کر چلے گئے تو میس حوالدار اور اسٹاف دھمالیں ڈالتے مجھے گلے مل رہے تھے جیسے ہم نے انڈیا فتح کر لیا ہو۔ میں ایک ماہ کی چھٹیاں گزارنے آیا تھا مگر پوسٹنگ ہوئی تو سوچا، دس دن بعد ہی واپس چلا جاتا ہوں کیوں کہ دوبارہ جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔

اس دفعہ کرنل مراد خان نیر بہت مختلف لگ رہے تھے۔ نہ جانے مجھے کبھی کبھی کیوں لگتا کہ ان

کی باتوں میں مایوسی کی جھلک نمایاں تھی۔ میں اس وقت بہت پریشان ہوتا جب وہ کہتے کہ ریٹائرڈ لوگ کسی کام کے نہیں رہتے، ان کا جینا تو بالکل بے کار ہی ہوتا ہے۔ ایک شام دروش میس کے لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے کہنے لگے، ڈاکٹروں کو خودکشی کے سب سے کم تکلیف دہ طریقے پر ریسرچ کرنی چاہیے۔ میں نے کہا، سر کیوں ایسی باتیں کرتے ہیں؟ وہ ہنس کر کہنے لگے، مرنے کے آسان طریقے تو پتا ہونے چاہییں نا۔ میں جلد پوسٹنگ پر آنے کا وعدہ کرکے سکھر چلا آیا۔ میری پوسٹنگ کا خط مجھ سے پہلے ہی یہاں آ چکا تھا اور میری یونٹ میں سب یہی سمجھ رہے تھے کہ میں چترال کی پوسٹنگ لینے ہی چھٹی گیا تھا۔ یہ مئی ۱۹۸۹ء کے دن تھے اور یونٹ میں آفیسرز بھی ضرورت سے کم تھے، اس لیے کمانڈنگ آفیسر نے کہا کہ جب تک میری جگہ کوئی آفیسر نہیں آئے گا، مجھے جانے نہیں دیا جائے گا۔ اور اس طرح اس سال میرا شندور پولو میلہ دیکھنے کا خواب چکنا چور ہو گیا۔

پھر بہت دنوں تک چترال میں کسی سے بات ہی نہ ہوئی۔ ہمارا فیلڈ ہاسپٹل روہڑی سیمنٹ فیکٹری سے نئی بننے والی پنوں عاقل چھاؤنی میں منتقل کر دیا گیا۔ وہاں اب سی ایم ایچ کی بنیاد بھی رکھ دی گئی تھی اور اندرونی سکیورٹی ڈیوٹی سے آفیسرز بھی واپس آنا شروع ہو گئے تھے۔ مجھے کمانڈنگ آفیسر نے بلا کر بتا دیا کہ ۲۶ / جولائی ۱۹۸۹ء کو آپ تیاری کر لو کیوں کہ اب تم اپنی نئی پوسٹنگ پر جا سکتے ہو۔ مجھے ۱۱ / اگست ۱۹۸۹ء کو چترال اسکاؤٹس میں رپورٹ کرنے کی تاریخ مل گئی اور میں نے چترال اسکاؤٹس ایکسچینج میں فون کر کے بتا دیا کہ میں دروش پہنچ رہا ہوں۔ ۹ / اگست ۱۹۸۹ء ایف سی ہیڈکوارٹر بالا حصار پہنچا تو پہلی بری خبر یہ ملی کہ کرنل مراد خان نیر نے ۳ / اگست ۱۹۸۹ء کو خود کو گولی مار کر خودکشی کر لی ہے۔ ہیڈکوارٹر بالا حصار میں آئی جی ایف سی میجر جنرل غازی الدین رانا سے انٹرویو ہوا تو انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ بشیر کیا تم اب بھی چترال اسکاؤٹس جانا چاہتے ہو۔ میں ان کے سامنے خاموش بیٹھا ہوا تھا کہ کیا کہوں۔ انھوں نے دوبارہ پوچھا تو میں نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ انھوں نے انٹرکام پر کسی آفیسر کو بتایا کہ کیپٹن بشیر آرائیں کو چترال اسکاؤٹس کا موومنٹ آرڈر دے دو اور مجھ سے اٹھ کر محبت سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگے، جاؤ اے کیو سے مل لو۔

میں اٹھ کر ہیڈکوارٹر کے اے کیو لیفٹیننٹ کرنل نعیم کے آفس آ گیا۔ اے کیو صاحب نے اپنی ڈیوٹی کے مطابق مجھ سے کسی تعارف اور تمہید کے بغیر ہی چترال کے بارے میں بتانا شروع

کر دیا کہ یہ بہت خوب صورت جگہ ہے۔ وہاں کے لوگ بہت محبت کرنے والے اور ملنسار ہیں۔ موسم ذرا ٹھنڈا ہے۔ وہاں کا کمانڈنٹ بہت اچھا آفیسر تھا مگر کچھ دن پہلے اس نے نہ جانے کیوں خودکشی کر لی تھی مگر تم وہاں بہت انجوائے کرو گے۔ میں یہ سب خاموشی سے سنتا رہا۔ انھوں نے آخر میں مجھ سے پوچھا کہ تم نے کبھی کیلاش وادی کا نام سنا ہے۔ میں نے عرض کیا، سر میں پہلے بھی کرنل مراد خان نیر کی کمانڈ کے وقت اڑھائی سال چترال اسکاؤٹس میں نوکری کر چکا ہوں۔ وہ ایک دم غصے میں آ گئے کہ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ میں نے گزارش کی کہ سر آپ نے موقع ہی نہیں دیا۔ اب ان کی آنکھوں سے میرے لیے ناپسندیدگی کے شعلے نکلنے شروع ہوئے مگر اللہ بھلا کرے اس کلرک کا جو میرا موومنٹ آرڈر لایا اور میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ کرنل نعیم نے میری طرف دیکھے بغیر مجھے فوجی خدا حافظ کہہ دیا اور میں مسکراتا ہوا ان کے آفس سے باہر نکل آیا۔

چترال ائیر پورٹ پر اترا تو روایات کے برعکس کوئی بھی لینے نہیں آیا تھا۔ کرنل مراد خان نیر کے زمانے میں نئے آنے والے آفیسر کو ائیر پورٹ سے کوئی آفیسر ہی لینے جاتا تھا۔ پچھلی پوسٹنگ میں دسیوں دفعہ میری ڈیوٹی لگ چکی تھی کہ نئے آنے والے آفیسر کو ائیر پورٹ سے میس میں لے آؤں۔ آج سب بدلا بدلا سا تھا۔ چترال پہنچا تو وہاں بھی سناٹا تھا۔ پرانے میس ویٹر بھاگتے ہوئے آئے، مسکرا تو رہے تھے مگر آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہر کوئی ایک ہی بات کر رہا تھا کہ سر بابا مر گیا، آپ کیوں واپس آیا ہے؟ آپ کا دل کیسے لگے گا۔

میں کچھ دیر بعد دروش کے لیے روانہ ہو گیا کیوں کہ چترال میس کی بہت یادیں تھیں جو یہاں بیٹھ کر مزید دکھی کرتیں۔ دروش پہنچا تو میس سنسان تھی۔ میس کے چاروں کمرے خالی تھے۔ میس حوالدار سلطان ولی نے میرا پرانا کمرہ ہی میرے لیے تیار کر رکھا تھا۔ چائے آئی تو کئی سولجرز ملنے آ گئے۔ ہر کوئی گھما پھرا کر بات کرنل مراد خان نیر کی یاد پر ختم کر رہا تھا۔

نئے کمانڈنٹ کرنل حمید اللہ پوار تھے جن کا تعلق رحیم یار خان سے تھا، دوسری صبح میرا بلاوا آیا تو میں ان سے ملنے ان کے آفس پہنچا۔ سلیوٹ کر کے کمانڈنٹ کی طرف مسلسل دیکھتا رہا اور پھر نہ جانے کیوں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگ گیا۔ کرنل حمید اللہ پوار اپنی کرسی سے اٹھے، مجھے بہت محبت سے گلے لگایا اور کہنے لگے، بشیر میں نے تمھارے بارے میں

بہت سنا ہے۔ میں خوش ہوں کہ تم دوبارہ چترال اسکاؤٹس آئے ہو۔ کرنل مراد خان نیر سے تمھارے تعلق کا مجھے پتا ہے۔ اس شخص کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا مگر یہ یاد رکھنا کہ میرے ہوتے ہوئے تمھیں اپنی دوسری پوسٹنگ پر کبھی مایوسی نہیں ہوگی۔ محنت سے اپنا کام کرو اور چترال اسکاؤٹس میں اپنی دوسری پوسٹنگ کو بھی انجوائے کرو۔

میں نے دروش میں زندگی کے معمولات شروع کیے مگر دل نہ لگتا تھا۔ مجھ سے سینئر ایک ڈاکٹر بھی چترال اسکاؤٹس میں آچکا تھا جو کتاب کے مطابق نوکری کر رہا تھا۔ بہت مشکل سے چھ ماہ گزارے اور چھٹی لے کر پوسٹ گریجویشن کورس کرنے کراچی آ گیا۔ گریجویشن کیے سات سال ہو چکے تھے۔ بی بی جی کہتی تھیں، پتر ہمارے جیتے جی شادی کر لے تاکہ ہم یہ خوشی بھی دیکھ لیں۔ میں نے بی بی جی کو کہہ دیا کہ کر دیں شادی اور پھر اچانک ہی شادی کر کے میں واپس دروش پہنچ گیا۔ ان دنوں چک درہ قلعہ میں چترال کی ایک ونگ نفری پوسٹ تھی تو کرنل پوار نے مجھے دروش کی یادوں سے نجات دلوانے کے لیے چک درہ بھجوا دیا۔ چھوٹی سی میس تھی۔ ونگ کمانڈر میجر حنیف اپنی فیملی کے ساتھ گھر میں رہتے تھے اور ہم میاں بیوی میس میں۔ ہمارا بہت سا وقت دریائے سوات کے کنارے بیٹھے گزرتا۔ مچھلیاں پکڑتے رہتے۔ کہاں کرنل مراد کے زمانے میں چترال کے گاؤں گاؤں گھومتا، بیماروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کو دروش ہاسپٹل لاتا تاکہ ان کا علاج ہو جائے اور کہاں اب زندگی کے معمولات تھے کہ نہ کوئی کام تھا، نہ کوئی پوچھنے والا کہ کوئی کام کیوں نہیں ہے۔

پھر کرنل حمید اللہ پوار کی جگہ بریگیڈیئر اختر ضامن کمانڈنٹ پوسٹ ہو گئے۔ مجھے حکم ملا کہ فوراً دروش آ جاؤ۔ میں نے طلعت بیگم کو واپس نواب شاہ بھیج دیا اور خود دروش پہنچ گیا۔ دو دن بعد دروش سے نیا آرڈر ملا کہ بالا حصار پشاور نئے کمانڈنٹ کو لینے پہنچو۔ میں دو جیپوں میں گارڈز کے ساتھ بریگیڈیئر اختر ضامن کو لینے بالا حصار پہنچ گیا۔ نئے کمانڈنٹ نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے کہا کہ سنا ہے کہ تم کرنل مراد کے بہت لاڈلے آفیسر ہو۔ ان کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرنے لگا۔ میرا معمول کی ڈیوٹی کے علاوہ دروش میں کوئی کام نہ تھا۔

یہ وہ دن تھے جب عراق، کویت پر قبضہ کر چکا تھا۔ ایک صبح دھوپ میں بیٹھے سکون سے چائے پی رہے تھے کہ سگنل آفس سے ایک مختصر سا سگنل لیٹر ملا۔ حکم صادر تھا کہ فوراً سامان
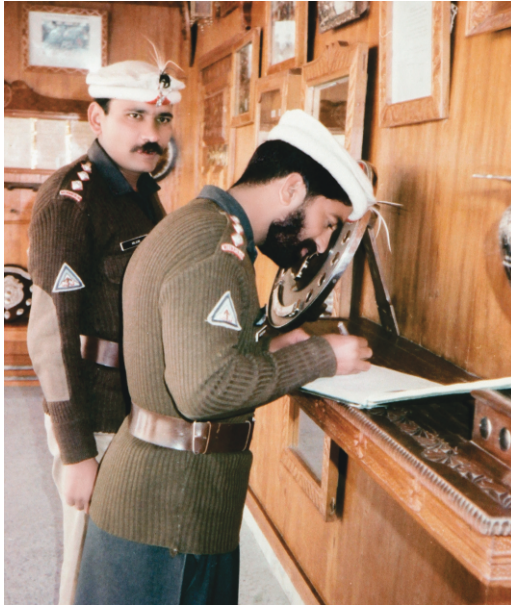
پہلی پوسٹنگ پر الوداعی تقریب پر کوارٹر گارڈ دروش قلعہ میں اپنے تأثرات لکھتے ہوئے۔

کوارٹر گارڈ دروش قلعے کے جوانوں سے آخری مصافحہ۔

۱۹۸۴ء میں چترال اسکاؤٹس آفیسرز میس میں ایک یادگار تصویر۔

لواری ٹاپ پر چترال اسکاؤٹس کے جوانوں کے ساتھ۔

پہلی پوسٹنگ کے بعد الوداعی تقریب کے دوران چترال آفیسرز میس دروش میں لنچ۔

الوداعی تقریب کے لنچ کے بعد کرنل مراد خان نیر کمانڈنٹ
چترال اسکاؤٹس سے یونٹ شیلڈ وصول کرتے ہوئے۔

ہاسپٹل اسٹاف کی طرف سے الوداعی تقریب میں۔

دروش میں اپنی الوداعی تقریب کا دل فریب منظر کرنل مراد خان نیر اور جوانوں کے ساتھ۔

باندھیں اور دو دن میں اسلام آباد پہنچیں کہ آپ کو ایک فیلڈ میڈیکل یونٹ کے ساتھ تبوک کینٹ سعودی عرب پہنچنا ہے۔ چترال سے صرف میں واحد افسر تھا جس کو یہ حکم سنایا گیا اور دوسرے آفیسر سب خوش تھے کہ چلو ایک کی قربانی دے کر ہم سب بچ گئے۔

لواری ٹاپ پچھلے تین ماہ سے بند تھی۔ پشاور اور چترال کے درمیان یہ واحد زمینی راستہ تھا جس نے کہیں مئی میں جا کر کھلنا تھا۔ پشاور پہنچنے کا دوسرا ذریعہ پی آئی اے کی پرواز تھی جو موسم کی خرابی کی وجہ سے ایک ہفتہ سے کینسل ہو رہی تھی۔ ہر طرف سے مایوسی کے بعد ایک ذریعہ مجاہدین کی مدد سے افغانستان سے ہوتے ہوئے جانے کا ہو سکتا تھا اور سویلین لوگ سردیوں میں یہی راستہ استعمال کرتے تھے۔ فوجیوں کے لیے یہ راستہ ممنوع تھا اور خاص کر افسروں کو تو بالکل اجازت نہ تھی کیوں کہ یہ بہت ہی خطرے کا کام تھا۔ مجھے تو اس طرح کا ایڈونچر اللہ دے اور سونے پہ سہاگا کہ جب بریگیڈیئر اختر ضامن جیسا نڈر کمانڈنٹ اس ایڈونچر کو سپورٹ بھی کر دے۔

میجر آفتاب نے ہیڈ کوارٹر ایف سی کو ایک سگنل بھیجا کہ میجر بشیر آرائیں کو ایک گشت پارٹی لواری ٹاپ کراس کرانے کو چلے گی۔ دوسری طرف پروگرام کے مطابق مجھے ارندو چیک پوسٹ سے مجاہدین کے حوالے کیا گیا جو لے کر مجھے افغانستان میں چگا سرائے سے ہوتے ہوئے سرور آباد کیمپ تک آئے اور پھر محمد گھٹ سے دوبارہ پاکستان میں داخل کر گئے۔ میں انھی کی جیپ میں باجوڑ اسکاؤٹس کی ایک چیک پوسٹ تک پہنچا جنھوں نے مجھے تیمر گرہ سے پشاور بالا حصار قلعے تک پہنچا دیا۔

جو سفر افغانستان کے اندر رہا، وہ زندگی بھر یاد رہے گا اور اگر وہ سب کچھ فلما کر پردہ اسکرین پر دکھا دیا جائے تو پوری دنیا کے انسان سڑکوں پر نکل آئیں کہ آج کے بعد کوئی جنگ نہیں ہوگی۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر ٹوٹے پھوٹے الٹے پلٹے پڑے لڑاکا ہیلی کاپٹر، دریا میں گرے تباہ شدہ دیوہیکل ٹینک، سڑکوں کے کنارے سیکڑوں تباہ حال فوجی گاڑیاں، جگہ جگہ سڑکوں کے کنارے قبریں، جلے ہوئے درختوں کے ساتھ کھلے آسمانوں کے نیچے بیٹھے معذور لوگ، لولے لنگڑے آوارہ گھومتے جانور چیخ چیخ کر دہائیاں دے رہے تھے کہ جنگ نہیں امن چاہیے۔ میں ان سوچوں میں گم رہا کہ اگر یہی سب سعودی عرب میں دُہرایا گیا تو کیا ہوگا۔

بالا حصار میں کسی کو کوئی سروکار نہ تھا کہ میں کیوں آیا ہوں اور کہاں جانا ہے۔ اپنے

بندوبست پر راتوں رات اسلام آباد کیمپ پہنچ گیا۔ یہاں رئیر ہیڈ کوارٹر ایف سی این اے (فرنٹیر کور ناردن ایریا) میں ایک تماشا تھا۔ افسروں اور جوانوں کی فیملیز ان سے ملاقات کو آ رہی تھیں کہ نہ جانے عراق وار سے زندہ لوٹنا ہے کہ نہیں۔ یہی سوچ کر میں نے بھی سعودی عرب سدھارنے سے پہلے بیوی اور اپنے سترہ دن کے نومولود بیٹے کو دیکھ لینے کی خواہش کا اظہار اپنی بیگم سے کیا۔ دوسرے ہی دن بیگم صاحبہ علی طلال کو لے کر کراچی سے سکھر اور پھر سکھر سے راول پنڈی پہنچیں تاکہ آپریشن ڈیزرٹ اسٹرام میں جانے سے پہلے ایک دوسرے کو جی بھر کے دیکھ تو لیں۔

دوسرے ہی دن ان کو کراچی کے لیے روانہ کیا اور نہ جانے کیسے اگلے چوبیس گھنٹوں میں پاسپورٹ بنے اور ویزے لگے، بس ہوش اس وقت آیا جب دھکم پیل کرتے سعودی عرب سے بھیجے گئے یورپین ہوائی جہازوں میں چڑھ کر جو سیٹ ملی اس پر دھڑام سے گر گئے۔

کمال کا سفر تھا، تقریباً پچانوے فی صد سولجر ایسے تھے جو زندگی میں پہلی دفعہ جہاز میں سفر کر رہے تھے اور سونے پر سہاگا کہ یورپین میزبانوں کی دیکھ بھال میں۔ جہاز میں تمام آفیسرز کی ڈیوٹی لگی تھی کہ جوانوں پر نظر رکھیں کہ کہیں جنگ جیتنے سے پہلے ہی جہاز میں موجود مالِ غنیمت کے بٹوارے نہ شروع کر لیں۔ خوب صورت ہوائی میزبانوں نے جنت کے میوہ جات سے تواضع شروع کی تو ہر کوئی جنگ کی فکر سے بے پروا خوب صورت ہوائی میزبانوں کو کھٹے انگوروں کی طرح رد کر کے پیٹ سیوا پر لگ گیا۔

پاکستان آرمی میں معمول کا ناشتا چائے اور نام نہاد پراٹھا ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تو دنیا جہان کے چاکلیٹ اور خشک میوہ جات صرف اسٹارٹر کے طور پر پیش کیے جا رہے تھے۔ کھانا تو کیا ہی ہونا تھا۔ جوانوں کے سامنے ٹرے آتی اور جیسے ہی کوئی چیز ملتی، وہ جھٹ سے کھولتے اور منہ میں ڈال کر ہڑپ کرنے کی رفتار سے بھی زیادہ تیزی سے معدے تک دھکیلتے تاکہ جلدی سے منہ خالی ہو جائے۔ میرے ساتھ بیٹھے ایک جوان نے تو تہیہ کر لیا تھا کہ شاید جنگ میں شہید ہونا پکا ہے تو کیوں نہ اپنے حصے کی نعمتیں اسی سفر میں کھا لی جائیں مگر اس کا منہ اس وقت دیکھنے کے قابل تھا جب جلدی سے گیلے ٹشو کو کھول کر منہ میں ڈال لیا اور چبانے کے بعد برے سے تأثر کے ساتھ اپنے ساتھی کو بتانے لگا، یار اے ناں کھاویں پھکا ای۔

میں نے فلائٹ میں زیادہ تر وقت سوتے ہی گزارا کیوں کہ جو خواتین میزبانی کے فرائض سرانجام دے رہی تھیں، ان کے خیال سے چھٹکارا سو کر یا پھر تصور میں مکہ مدینہ کی سیر سے ہی پایا جا سکتا تھا۔ مجھے آج بخوبی سمجھ آ رہا تھا کہ صبر اور کھٹے انگوروں کے اصل معنی کیا ہیں۔

جب ہم تبوک ائیرپورٹ پر اترے تو کچھ پاکستانی آفیسرز ہمارے استقبال کو آئے ہوئے تھے۔ استقبال کیا تھا بس ٹرکوں جیپوں اور مختلف گاڑیوں کی بھرمار تھی اور ہر کوئی اپنا سامان اور بستر بند اٹھا کر جہاں جگہ مل رہی تھی، سوار ہوتا گیا۔ تبوک شہر سے بیس کلومیٹر دور ایک فوجی چھاؤنی میں پہنچے تو ہمارے لیے مخصوص کیے گئے کمروں میں سامان رکھا گیا۔ ایک پاکستانی انفنٹری بریگیڈ ہم سے پہلے پہنچ چکا تھا اور ہم آرمڈ بریگیڈ کے ساتھ تھے۔

میں میڈیکل بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر جن کی کمانڈ میں ہم نے جنگ لڑنی تھی سے ملا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ چھ فٹ قد آور گورا چٹا ڈاکٹر لیفٹیننٹ کرنل کی وردی میں ملبوس تھا۔ جب انھوں نے پہلی کانفرنس لی تو ہمیں بچوں کی طرح سمجھایا اور ڈرایا۔ ان کی باتوں سے یوں لگ رہا تھا کہ کچھ بھی کرنا پڑے بس ریال ملنے چاہییں۔ میں اس کے بالکل برعکس سوچ رہا تھا اور بول پڑا کہ سر عزت سے رہیں گے یا وطن چلے جائیں گے۔ چند لمحوں میں ہی میں ان کا ناپسندیدہ افسر بن چکا تھا، لہٰذا مجھے پاکستان کے بارہویں آرمڈ بریگیڈ کے ساتھ عرعر جانے کا حکم صادر ہو گیا۔

دوسرے دن نمازِ فجر کے بعد دسیوں فوجی گاڑیوں میں پورا بریگیڈ تبوک سے دومتہ الجندل اور سکاکا سے ہوتا ہوا عرعر پہنچنے کو رواں دواں تھا۔ بوقتِ ضرورت کسی کو طبی سہولت پہنچانا میرے ذمہ تھا۔ یہ سعودی عرب کا نادرن ایریا ہے جہاں آبادی بہت ہی کم ہے اور سڑک پر سفر کرتے دور میلوں تک کوئی درخت تک نظر نہیں آتا۔

اگر کسی نے جنگ پر جاتی فوج کو دیکھا ہو تو ہی یقین آتا ہے کہ یہ سفر کیسا ہوتا ہے۔ دنیا جہان سے بے نیاز جاں نثار اس طرح ان دیکھی منزل کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں کہ یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ واپسی کسی کے کندھوں پر ہو گی یا کسی کو کندھا دیتے ہوئے۔ ہمارا قافلہ بھی میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ پورا آرمڈ بریگیڈ بسوں، ٹرکوں، جیپوں میں رواں دواں تھا۔ میں بریگیڈ کے ساتھ ایڈوانس میڈیکل اسٹیشن کے عملے اور برق رفتار دو امریکن ایمبولنسز لیے رواں دواں

تھا۔ میں ایمبولنس میں کبھی پورے قافلے سے آگے نکل جاتا اور کبھی رک کر قافلے کے پیچھے پیچھے ہو لیتا۔ دومتہ الجندل اور سکاکا کے درمیان ہر طرف صحرا تھا مگر سڑک کنارے ایک چائے کا کھوکھا نظر آیا۔ قافلہ آگے نکل چکا تھا تو میں نے ڈرائیور سے اس کھوکھے پر رکنے کو کہا۔ دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا شخص کھوکھے میں چائے پانی اور بسکٹ وغیرہ رکھ کر بیٹھا تھا۔ نہ جانے پورے دن میں کتنے لوگ رکتے ہوں گے جس سے اس کی روزی چلتی تھی۔ ہم نے بھی اسے چائے کا آرڈر دیا۔ وہ چپ چاپ بغیر بات کیے چائے بناتا رہا مگر ہماری باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔

میری عادت تھی کہ میں سولجرز سے ہمیشہ ان کی مادری زبان میں بات کرتا۔ اس لیے اب بھی میں کبھی پنجابی بولتا اور کبھی سندھی۔ جب ہم چائے پی چکے تو میں نے ڈرائیور کو پیسے دے کر بھیجا تاکہ وہ بل کی رقم ادا کر دے۔ اس شخص نے پیسے لینے سے انکار کر دیا اور آہستہ آہستہ میری گاڑی کے ساتھ آ رکا۔ ان دنوں میری بلوچانہ انداز کی داڑھی مونچھیں ہوتی تھیں اور میں اپنی مادری زبان پنجابی اور سندھی کے علاوہ کئی علاقائی زبانیں روانی سے بولتا تھا۔ وہ شخص اپنا گلا صاف کرتے ہوئے مجھ سے سندھی زبان میں کہنے لگا کہ صاحب آپ پاکستان کے فوجی ہو اور میرے علاقے سندھ کی زبان بھی بولتے ہو، میں یہاں چھ سال سے ہوں۔ یہاں میرے ملک سے کوئی نہیں آتا۔ آج پہلی دفعہ کسی کو اپنی زبان بولتے سنا ہے۔ میری خوشی کے لیے چائے میری طرف سے پی لیں۔ میں ایمبولنس سے اتر کر اس سے گلے ملا اور جا کر اس کے کھوکھے میں بیٹھ گیا۔ وہ شخص حیدرآباد کے قریب ہالا کا رہنے والا تھا اور عمرہ کے ویزے پر یہاں آ بیٹھا تھا اور کچھ کما کر بچوں کو بھیج دیتا۔ اس کا خیال تھا، جب تک نہ پکڑا گیا اس سنسان سڑک پر روزی کماتا رہوں گا۔ میں نے یادگار کے طور پر اس کے کھوکھے پر پاکستان کا جھنڈا لگایا تو وہ بے اختیار دوبارہ مجھے گلے ملا۔ ہم سب نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا اور اسے خدا حافظ کہہ کر تیز رفتاری سے عرعر کی طرف چل نکلے۔ دومتہ الجندل سے سکاکا کا درمیانی راستہ اس طرح گزرا جیسے یہاں انسان تو بستے ہی نہ ہوں۔ مکمل صحرا اور بیچ میں ایک بل کھاتی سڑک اور اس پر میلوں تک آپ کو شاید ہی سامنے سے آنے والی کوئی گاڑی نظر آئے۔ یہ سڑک مدینہ کی طرف جاتی ہے اور عرعر شہر کے بیچ پہنچ کر اگر آپ الٹے ہاتھ مشرقی سڑک پر مڑ جائیں تو پھر آپ سیدھے عراق بارڈر پر اس جگہ پہنچ

جاتے ہیں جو راستہ کربلا کی طرف جاتا ہے۔ ہمارے بریگیڈ کا اسی روڈ پر عرعر شہر سے پندرہ کلو میٹر دور پڑاؤ ہوا اور بریگیڈ ہیڈ کوارٹر نے سڑک کے کنارے صحرا کے بیچ ایک لاوارث سی پکی بلڈنگ میں ڈیرے ڈال دیے۔ چوں کہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کے ساتھ میری ڈیوٹی لگی ہوئی تھی اور مجھے ایڈوانس ڈریسنگ اسٹیشن لگانا تھا تو مجھے بھی تپتی ریت پر ٹینٹ لگانے کا حکم مل گیا۔

ایک فوجی کے کیا کیا دکھڑے ہوتے ہیں، کاش کوئی جان سکے اور آج میرا بھی ایک دکھڑا تھا اور میں سخت پریشان بلکہ افسردہ بھی تھا۔ یہ ۳۱/جنوری ۱۹۹۱ء کی شام تھی اور میری شادی کی پہلی سال گرہ۔ میرا بیٹا ۱۹/دسمبر ۱۹۹۰ء کو پیدا ہوا اور میں اسے اٹھارہ دن کا چھوڑ کر اس صحرا میں آ بیٹھا تھا۔ آج کوئی ذریعہ ہی نہیں تھا کہ بیگم کو فون کر سکتا۔ نہ یہاں کسی کو پتا تھا کہ میں افسردہ کیوں ہوں۔ بریگیڈ کے سب آفیسرز یہ سمجھ رہے تھے کہ چوں کہ مجھے پکی بلڈنگ میں جگہ نہیں ملی تو میں پریشان ہو گیا ہوں۔ بریگیڈ میجر زیاد حامد انتہائی نفیس آفیسر تھا اور دورانِ سفر ہماری دوستی بھی ہو گئی تھی۔ وہ بھانپ گیا کہ مجھ جیسا آفیسر صرف ٹینٹ لگانے سے کبھی بھی پریشان نہیں ہو سکتا۔ وہ میرے پاس آ کر پوچھنے لگا اور کہا کہ میجر بشیر اج موڈ ٹھیک نئیں وچلی گل دس دے۔ میں نے بغیر تمہید کے کہا کہ سر میری شادی کی پہلی سال گرہ ہے اور میں اپنی بیگم کو لو یو تو کیا کہنا، ہیلو بھی نہیں کہہ سکتا۔ بیٹا آج پینتالیس دن کا ہے اور اس کی گوں گاں بھی نہیں سن سکتا۔ کیا فائدہ اس افسری کا۔

وہ چپ چاپ واپس چلا گیا۔ آپ تصور کریں کہ بریگیڈ میجر کی جیپ دو گھنٹے بعد واپس آ گئی کہ پورے عرعر شہر میں کوئی کیک نہ مل سکا۔ میجر زیاد حامد نے جیپ واپس بھیج دی کہ بازار سے جو میٹھی چیز ملے لے آؤ اور پھر صرف آئس کریم ملی۔ میری شادی کی پہلی سال گرہ عرعر کے صحرا میں آئس کریم سے منائی گئی۔ میجر زیاد حامد نے وعدہ کیا کہ کمیونیکیشن بحال ہوئی تو پہلی فون کال میری ہو گی تا کہ میں نواب شاہ ملا کر بیگم کو شادی کی سال گرہ کی مبارک باد اور لو یو کہہ سکوں۔ میں بھی اس وعدے پر آئس کریم پر ہی سال گرہ منا کر خوش ہو گیا۔

پھر عجیب موسم دیکھا۔ رات کو اتنی سردی ہوتی کہ میں لانگ بوٹ پہنے پہنے ہی سو جاتا اور صبح جیسے ہی سورج نکلتا تو لگتا جلتے تندور کے کنارے بیٹھے ہوں۔ ریت ایسے اڑ کر ہمارے ناک منہ میں گھستی جیسے عراق کے حملے کا بدلہ بھی سعودی ریت کے ذریعے ہم سے لیا جا رہا ہو۔ دوپہر کا

کھانا کھانے کے لیے ہم ایمولینس اسٹارٹ کرتے۔ اس کا اے سی چلاتے اور اس میں بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ اس تمام اہتمام کے باوجود بھی ریت اپنی چرچراہٹ سے منہ میں کہیں نہ کہیں اپنی موجودگی کا احساس ضرور دلاتی۔

سعودی آرمی کا یہ حال تھا کہ ان کو کوئی پروا نہ تھی کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ صرف صبح آٹھ بجے سے دو بجے تک وردیاں پہنتے تھے اور اس کے بعد شہر سے باہر دور بڑے جنریٹرز کے ساتھ اے سی والے آرام دہ ٹینٹوں میں اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ مزے کرتے تھے کہ اگر شہر پر کوئی میزائل بھی آ گرا تو وہ تو محفوظ ہوں گے۔ ان کا ایک رابطہ آفیسر صبح ہمارے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر آتا۔ کار سے اتر کر اپنا چغہ اتارتا تو پتا چلتا وہ سعودی فوجی ہے۔ سارا دن قہوہ پیتا اور ظہر کی نماز پڑھ کر وردی کے اوپر دوبارہ چغہ پہنتا اور غائب۔ اس کے بعد اگر ایٹمی حملہ بھی ہو جائے تو ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اس سے کہاں رابطہ ہو سکتا ہے۔ کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ایمرجنسی میں ایمبولنس کا پیٹرول ختم ہوا تو بتایا گیا کہ پیٹرول ڈلوانے کا خط کل صبح ملے گا۔

سچ تو یہ ہے کہ ہم کرائے کے فوجی تھے اور بعض اوقات شرم آتی تھی کہ تیرہ سو پچاس ریال کے لیے، اس پاک سرزمین کی حفاظت کے لیے ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ شکر ہے کہ ایک امید پر یہ سب برداشت کرتے تھے کہ عمرہ نصیب ہوگا اور اپنے پروردگار کے سامنے حاضری کا موقع مل جائے گا۔

سعودی عرب کے علاقے عرعر کے صحرا کی جہنم جیسی گرمی میں ڈیوٹی انجام دینا ایک جہاد ہی تھا۔ کربلا جانے والی سڑک اسی علاقے سے گزرتی ہے۔ جنگ ختم ہوئی تو کویت سے آنے والے عراقی فوج کے قیدی یہیں سے گزر کر واپس عراق جا رہے تھے۔ بسوں کے قافلے گزرتے تو ہم ان فوجیوں کی دیکھ بھال بھی کرتے۔ سیکڑوں فوجیوں کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ انھوں نے کویت پر چڑھائی کیوں کی تھی اور اس جنگ کا مقصد کیا تھا۔

اس سال کا حج آ پہنچا تو سعودی گورنمنٹ نے اعلان کیا کہ اپنے اپنے خرچ پر پچاس فی صد پاکستانی فوجیوں کو حج پر جانے کی اجازت ہوگی۔ ہم پہلے عمرہ کر چکے تھے مگر حج کی سعادت کو ترسے ہوئے تھے۔ پیسوں کی کمی سب کو تھی مگر حج کے لیے ایک دوسرے سے ادھار لے کر پروگرام بنا رہے تھے۔ ہر یونٹ سے کن پچاس فی صدی لوگوں نے حج پر جانا تھا، اس کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا

گیا۔ گروپ بنائے گئے اور پروگرام کے مطابق بسوں میں روانہ ہوئے۔ زندگی کا یہ پہلا حج تھا۔ جوش وخروش دیدنی تھا۔ بسوں میں تلبیہ کی آوازوں سے فضا گونج رہی تھی۔

ہمارا چھ آفیسرز کا گروپ بنا جن کا ایک ٹینٹ لگنا تھا اور ساتھ ساتھ حج کرنا تھا۔ ہمارے لیڈر میجر ساحر ضمیر صدیقی تھے اور میں، میجر طارق محمود اور میجر نیر طور بھی اس گروپ میں شامل تھے۔ مکہ پہنچے، عمرہ ادا ہوا۔ منیٰ میں جا ڈیرے لگائے اور میجر طارق محمود کو الٹیاں شروع ہو گئیں۔ پھر ڈائیریا بڑھا اور ڈرپ لگانی پڑ گئی۔ یوں میجر طارق کی حالت بگڑی، ساتھی حاجیوں نے کنی کترانی شروع کر دی۔ میجر طارق زار وقطار رونے لگا کہ مجھ سے کوئی ایسا گناہ ضرور سرزد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو میرا حج کرنا قبول نہیں۔ اس کی حالت یہ ہوئی کہ مشکل سے وضو کر کے نماز لیٹے لیٹے ادا کرتا۔ میں نے ساتھیوں سے کہا کہ ہم ویگن کروا لیتے ہیں تاکہ میجر طارق کو سنبھال سکیں۔ ہمارے لیڈر نے کہا کہ بھئی قسمت سے پہلا حج نصیب ہوا ہے، اب اس کی بیماری کی وجہ سے ہم اپنا حج تو خراب نہیں کر سکتے۔ ہم تو عرفات پیدل جائیں گے کیوں کہ اس کا زیادہ ثواب ہوتا ہے۔

یہ باتیں میجر طارق نے سنیں تو وہ مزید پریشان ہو گیا اور رو رو کر دعا مانگنے لگا کہ یا اللہ مجھے چلنے کے قابل کر دے کیوں اس سے تو اٹھا بھی نہ جا رہا تھا۔ ہمارے لیڈر اور ساتھیوں نے فیصلہ سنا دیا کہ ہر کوئی آزاد ہے جیسے چاہے حج کرے۔ میں نے میجر طارق سے کہا کہ فکر نہ کرو سب کے ساتھ تمھارا بھی حج تو ضرور ہو گا۔

میرا چھوٹا بھائی شبیر مکہ میں رہتا تھا مگر اس سال وہاں کے رہائشیوں کو حج کی اجازت باقاعدہ گورنمنٹ سے لینا پڑ رہی تھی۔ چوں کہ وہ پچھلے پانچ سال سے حج کر رہا تھا تو اس سال حج کا ارادہ نہ تھا۔ میں نے اپنی پریشانی اسے بتائی تو وہ تیار ہو گیا کہ میں آتا ہوں۔ پھر کیا تھا، اسی رات وہ احرام میں کسی عربی کی وین کروا کر منیٰ پہنچا اور میجر طارق کو یوں سنبھال لیا جیسے کوئی ماں اپنے بیمار بچے کو گود میں لے کر گھوم رہی ہو۔ ہمارے زیادہ ثواب کمانے والے ساتھی پیدل نکل گئے اور ہم نے میجر طارق کو وین میں ڈال لیا۔ عرفات جاتے ہوئے راستے میں دسیوں دفعہ وین روکنی پڑی۔ شبیر، میجر طارق کو پیٹھ پر اٹھا کر باتھ روم لے جاتا۔ میں نے وین میں ہی دو دفعہ میجر طارق کو ڈرپ لگا دی۔ میجر طارق کی الٹیاں اور موشن بہتر تھے مگر وہ حج کی سختیاں جھیلنے کے قابل

نہ تھا۔ بہرحال عرفات سے واپسی ہوئی۔ مزدلفہ میں رات گزاری اور دوسری صبح شبیر نے جا کر میجر طارق کی جگہ رمی کے لیے کنکریاں بھی مار لیں۔ منیٰ سے طوافِ زیارت کے لیے مکہ پیدل جانا بہت آسان تھا مگر وین میں گھنٹوں کا سفر بن گیا۔ رات کے پچھلے پہر ہم مکہ پہنچے۔ اگر کسی نے اسّی نوے کی دہائی میں حج کیا ہو تو پتا ہوگا کہ وھیل چیئر بھی مشکل سے ملتی تھی۔ عربی لڑکے اجرت لے کر ڈولی میں بھی طواف کرواتے تھے۔ جوان بیٹے اپنے بوڑھے ماں باپ کو اپنی پیٹھ پر اٹھا کر طواف کرواتے نظر آتے تھے۔

میجر طارق پہلے ہی درمیانے وزن کا اسمارٹ سا آفیسر تھا اور اس بیماری نے اسے ٹین ایج بچے جیسا کر دیا تھا۔ وہ دس بیس قدم چلتا اور پھر شبیر اسے پیٹھ پر اٹھا کر طواف کرواتا رہا۔ بہت وقت لگا مگر طوافِ زیارت سے فارغ ہو کر ہم واپس منیٰ پہنچ گئے۔ رمی بھی ہوئی، قربانی ہوئی تو احرام کھل گئے۔ میجر طارق کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ میجر ساحر ضمیر صدیقی اور میجر نیر طور بھی نظر آ گئے۔ میجر طارق ان کو دیکھ کر خوب رویا اور کہتا رہا کہ سر دیکھ لیں، میں آپ کے زیادہ ثواب کمانے میں بالکل مخل نہیں ہوا مگر ایک اجنبی لڑکے نے میرا حج کرنا ممکن بنا دیا اور میرے حج کے تمام ارکان گرتے پڑتے پورے کروا ہی دیے۔ ہمارے مدینہ جانے سے پہلے شبیر اپنے کام پر واپس لوٹ گیا۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اللہ کے گھر جا کر انسان بات بات پر روتا ہے۔ ہم بھی بلا وجہ روتے تھے۔ ایک بات کا آج تک پتا نہ چل سکا کہ بیمار ساتھی کو چھوڑ کر عرفات پیدل جانے والوں کے حصے میں اس حج کا ثواب ہم سے کتنا زیادہ آیا تھا۔ میجر طارق میرے بھائی شبیر کو خدا حافظ کہتے ہوئے کچھ زیادہ ہی رویا۔ کہتا تھا، اس طرح کے احسان کوئی کیسے اتار سکتا ہے۔ شبیر عمر میں ہم سے بہت چھوٹا تھا مگر روانہ ہونے سے پہلے کہنے لگا کہ میں نے پہلے پانچ حج کیے ہیں مگر جو سکون اس حج میں ملا ہے، وہ پہلے کبھی محسوس نہیں ہوا۔ باقی حج کا ثواب کتنا ہے یہ اللہ جانے۔

ہم سب ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ میں جب کبھی بھی لاہور جاؤں کرنل طارق محمود سے ضرور ملتا ہوں اور وہ اس حج کا ذکر ضرور کرتا ہے۔ وہ پچھلے تیس سال سے میرے چھوٹے بھائی شبیر سے دوبارہ نہیں ملا مگر ہر دفعہ بہت محبت سے اس کی خیریت بھی ضرور پوچھتا ہے۔

سعودی عرب اور عراق بارڈر پر، ۱۹۹۱ء آپریشن ڈیزرٹ اسٹورم۔
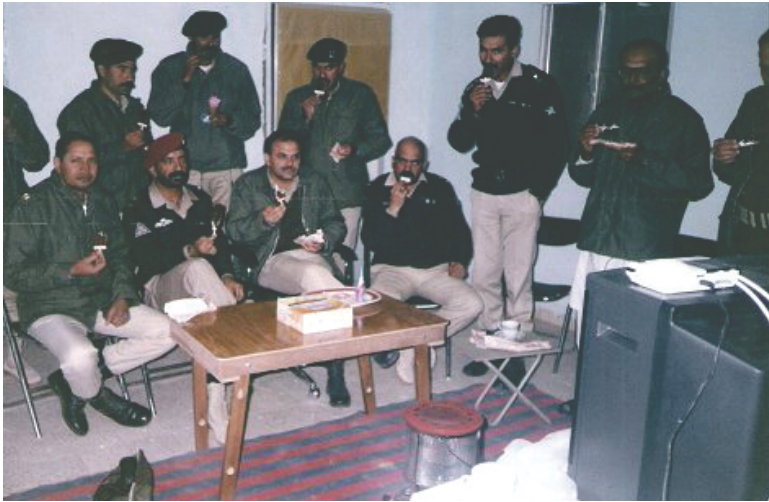
۳۱ / جنوری ۱۹۹۱ء اپنی شادی کی پہلی سال گرہ، ۱۲ آرمڈ بریگیڈ کے آفیسرز کے ساتھ عرعر کیمپ میں۔

عرعر کیمپ میں جوانوں کو کیمیکل اور بیالوجیکل وارفیئر سے بچاؤ کی ٹریننگ دیتے ہوئے۔

سعودی عرب کے رابطہ آفیسر اور میجر شیرازی پاکستانی رابطہ آفیسر کے ساتھ۔ (عرعر ہیڈکوارٹر)

الزام تراشیاں

میں۱۹۹۱ء میں سیاچن بیس کیمپ گوما میں میڈیکل بٹالین کا سیکنڈ اِن کمانڈ تھا تو بیگم کو پاسکوم کے ذریعے فون کرنا پڑتا تھا۔شادی کو ابھی ایک ہی سال ہوا تھا۔بیگم کہتی، کیسے فوجی ہو کبھی لو یو ہی کہہ دیا کرو۔ میں نے سمجھایا کہ یہ بیچ ایکسچینج والے ہمارے فون سنتے ہیں۔ دوسرے دن سگنل کمپنی کے آفیسر کمانڈنگ کا فون آیا کہ سر ہم کسی کا فون یا باتیں نہیں سنتے، آپ بھابھی جی سے جو مرضی کہا کریں۔اس بات نے سیاچن کی برف باری میں مجھے ہیٹر جیسی حرارت بخشی اور میں نے یہ بات بیگم کو بھی بتائی۔ہنس کر کہنے لگی، اچھا تو پھر خط میں ہی لکھ دیا کرو۔ میں نے خط میں لکھا کہ یہاں ہمارے خط بھی سنسر کرنے والے کھول کر پڑھتے رہتے ہیں، اس لیے خط میں بھی کوئی ایسی ویسی بات نہ لکھ دینا۔

دوسرے دن مجھے سگنل کمپنی کی طرف سے ایک چٹھی ملی جس میں لکھا تھا:

سر ہم کسی کا خط نہ کھولتے ہیں نہ پڑھتے ہیں آپ بلاوجہ ہم پر غلط الزام نہ لگایا کریں۔

اب پھر لوگ کہہ رہے کہ یہ لوگ سیاست میں مداخلت کرتے ہیں۔ الزام تراشی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

کیا واقعی روزی لگی ہوئی تھی

مئی ۱۹۹۴ء میں میری پوسٹنگ پاکستان نیوی شپ نصر پر سینئر میڈیکل آفیسر کے طور پر ہوگئی۔ یہ پاکستان نیوی کا لاجسٹک بحری جہاز ہے جو بیرونی دوروں پر جاتے یا جنگ میں شریک لڑاکا بحری جہازوں کو اسلحہ، پیٹرول، ڈیزل اور کھانے پینے کا سامان مہیا کرنے کی ذمہ داریاں نبھاتا ہے۔

میں چترال اور کیلاش کی وادیوں میں پانچ سال گزار چکا تھا۔ان سالوں میں بروگل کی اذیت ناک سردی دیکھی۔شندور کی برف باری میں پولو میچ دیکھے۔سیاچن بھی بھگتا لیا تھا اوران سب جگہوں پر پہاڑوں کی وجہ سے الٹیاں کرکر کے تھک چکا تھا کہ ایم ایس برانچ مہربان ہوگئی اور آخرکار کراچی بھیج دیا۔خوشی خوشی سفید وردی پہنی اور نصر جہاز پر چڑھا تو چند دنوں میں ہی

سمندری ہچکولوں کی الٹیوں نے پہاڑوں کی الٹیاں بھلا دیں۔

اگر آپ کو کبھی جہاز پر گہرے سمندر میں جانے کا اتفاق ہو اور بدقسمتی سے آپ کو سمندری ہچکولوں سے الٹیوں والی بیماری بھی پکڑ لے تو سمجھ لیں، آپ مارے گئے۔ جب تک جہاز پانی میں ہچکولے کھاتا رہے گا، آپ کی الٹی نہیں رک سکتی حتیٰ کہ سولجر تو خون کی الٹیاں کرتے بھی دیکھے ہیں۔ ظلم یہ ہے کہ جب آپ جہاز سے اتر جاتے ہیں تو مکمل تندرست نظر آتے ہیں اور کوئی ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا کہ سمندر کے اندر آپ کی حالت آپے سے باہر تھی۔ میں تو آسمان سے گرا اور کھجور میں اٹکا والی کہاوت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ مگر مرتا کیا نہ کرتا، نوکری تو بہرحال کرنی ہی تھی۔

ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ جہاز پر پوسٹنگ کے پہلے ہفتے میں ہی ایک خوش گوار خبر ملی کہ چیف آف نیول اسٹاف ایڈمرل منصور الحق نے وزیرِ اعظم پاکستان بے نظیر بھٹو کو پی این ایس نصر پر گہرے پانیوں میں ایک دن گزارنے کی دعوت دی ہے اور وہ عنقریب پوری آن بان سے تشریف لا رہی ہیں۔ ہم سب زور شور سے تیاریاں شروع کر چکے تھے۔

چیف آف نیول اسٹاف ایڈمرل منصور الحق کی کمانڈ میں نیوی میں لگتا تھا کہ بادشاہت کا دور دورہ ہے کہ جو چیف کے منہ سے نکلے گا وہی وقت کا قانون ہوگا۔ ہم جہاز پر کیپٹن عارف قریشی اور کمانڈر خامس نقوی کی کمانڈ میں تھے۔ جہاز کے سپلائی آفیسر لیفٹیننٹ کمانڈر اصغر کی خریداریاں رنگ دکھانے لگی تھیں۔ اس تیاری میں جہاز کے ہر کونے کو سنوارا جا رہا تھا۔ رنگ و روغن پر بے تحاشا پیسہ خرچ ہونے لگا۔ مہنگے قالین آ رہے تھے۔ فائیو اسٹار ہوٹلز سے کھانے پینے کے معاہدے ہو رہے تھے کہ گہرے پانیوں میں ہیلی کاپٹر سے کھانے کس طرح پہنچائے جائیں گے۔ ڈرائی فروٹ کی ایسی ایسی پیکنگ دکھائی دے رہی تھی جو ہم نے کبھی ناولوں میں ہی پڑھی ہوں گی۔

میں جہاز پر سینئر میڈیکل آفیسر تھا۔ آج سے پہلے سک بے یا میڈیکل چیک اپ روم کی حالت لاوارث یتیم ننگ دھڑنگ بچے جیسی تھی اور میں میڈیسن کی کمی کا رونا روتا رہتا تھا مگر اب نعمتوں کی گنگا بہنے لگی تو ہم نے بھی مالِ غنیمت کی لوٹ مار سے دونوں روم کارپٹ کروا لیے کہ اگر کوئی وی آئی پی بیمار ہو گیا تو میڈیکل چیک اپ روم تو شایانِ شان دکھا سکیں۔

ایک نیول آفیسر کی بیوی کی ڈیوٹی لگی کہ وہ بے نظیر بھٹو کی سیکریٹری ناہید خان سے رابطہ کر کے معلومات حاصل کرے کہ ان کے باتھ روم میں صابن، شیمپو، ٹوتھ پیسٹ اور برش، پرفیوم کس برانڈ کے استعمال ہوتے ہیں اور پھر جہاز پر تیار ہونے والے باتھ روم میں بھی یہی سب مہیا کیا جائے۔ مجھے حکم ملا کہ ممکنہ ضرورت کی ہر میڈیسن پی این ایس شفا سے حاصل کروں یا بازار سے خرید کر سک بے میں فراہم کردوں۔ مجھے تاکید کی گئی کہ وزیرِاعظم کے پروٹوکول کے مطابق پی این ایس شفا اور آغا خان ہاسپٹلز میں وی آئی پی روم مخصوص کروالوں تاکہ خدانخواستہ کوئی ایمرجنسی ہو تو علاج معالجے میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ سرکردہ مہمانوں کی لسٹ میں وزیرِ اعظم کے علاوہ ان کے شوہر آصف علی زرداری، غلام مصطفیٰ کھر اور ان کی نئی نویلی دلھن، وزیرِ دفاع جناب شعبان آفتاب میرانی اور ناہید خان بھی تھے۔ اس کے علاوہ چاپلوس اور خوشامدی وزیروں، بیوروکریٹس، فوجی آفیسرز کی الگ لسٹ تھی۔

سپلائی آفیسر لیفٹیننٹ کمانڈر اصغر میرے کام کرنے سے ابھی ناواقف تھے، اس لیے انھوں نے ایک ہفتہ پہلے فوڈ انسپیکشن سٹیفکیٹ میرے سامنے رکھ دیا کہ اسے سائن کردوں تاکہ وزیرِاعظم کے دورے والے دن کی تاریخ اس سٹیفکیٹ پر لگا کر کھانا پیش کر دیا جائے۔ میں نے جب کھانا چیک کیے بغیر سٹیفکیٹ پر سائن کرنے سے انکار کر دیا تو جہاز پر جیسے بھونچال آ گیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ ایک ایک ڈش بارہ بارہ پندرہ پندرہ ہزار کی ہوگی، آپ اسے چیک کر کے کیوں خراب کریں گے اور میں بضد تھا کہ اگر طریقۂ کار کے مطابق قانون نے ڈاکٹر کو ٹیسٹنگ لیبارٹری بنا دیا ہے تو میں کسی کھانے کو چکھے بغیر سائن نہیں کروں گا۔ سپلائی آفیسر میرے تیور دیکھ کر اس بات پر راضی ہو گیا کہ تمام ڈشز میں سے کچھ چیک کر کے سائن کر دینا تاکہ ہماری ڈیکوریشن خراب نہ ہو۔ میں حیران اس وقت ہوا جب میرے رہائشی کیبن میں بھی نیا کارپٹ ڈالا گیا اور ڈرائی فروٹ کے پیکٹ رکھے گئے۔ میں نے وہ پیکٹ فوراً اپنے جہاز کے ینگ آفیسرز کو بانٹ کر خوب داد وصول کی۔

ہم نے بے نظیر بھٹو کے استقبال کے لیے سمندر میں جانے کے لیے سفر شروع کیا اور تقریباً دوسو ناٹیکل میل کے فاصلے پر سمندر میں جا کر جہاز روک دیا۔ تاریخ یاد نہیں مگر جب ہیلی

کاپٹر نظر آئے تو ہم پُر جوش تھے۔ ہماری ہر دل عزیز وزیرِاعظم اور شاہی طبیعت کے چیف آف نیول اسٹاف ہمارے جہاز کے اوپر اڑتے ہیلی کاپٹر میں آ پہنچے تھے اور ہم خوشی سے نعرے لگا رہے تھے۔ کھلے سمندروں میں جہاز پر مہمانوں کے استقبال کے لیے ہماری تمام تیاریاں مکمل تھیں۔

پی این ایس نصر کے پچھلے حصے کو ہینگر ڈیک یا فلائی ڈیک کہتے ہیں جو ہیلی پیڈ کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ گہرے پانیوں میں ہچکولے کھاتے جہاز پر ہیلی کاپٹر اترتے دیکھنے کا میرا بھی یہ پہلا موقع تھا۔ فورسز میں ڈاکٹر ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ وی آئی پیز کو میڈیکل کور دیتے ہوئے ان کو قریب سے دیکھتے ہیں اور بعض اوقات آپ کا ان سے تعارف بھی ہو جاتا ہے۔ جب ہیلی کاپٹر اتر چکا تو ہم سب آفیسرز کاریڈور سے باہر آ کر وزیرِاعظم کو سلیوٹ کرنے کے لیے فلائی ڈیک پر لائن بنا کر کھڑے ہو گئے۔ لیفٹیننٹ احمد رضا بخاری خوب خوش تھا کیوں کہ اس نے وزیرِاعظم کے ساتھ کنڈکٹنگ آفیسر کی ڈیوٹی کرنی تھی اور کسی ینگ لیفٹیننٹ کے لیے یہ اعزاز کی بات تھی۔

جہاز اس طرح ہچکولے کھا رہا تھا کہ بغیر سہارے ہینگر ڈیک پر کھڑے ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر کا دروازہ کھلا تو سب سے پہلے ناہید خان باہر نکلیں اور انھوں نے ہاتھ پکڑ کر محترمہ بے نظیر بھٹو کو نیچے آنے کے لیے سہارا دیا۔ ایڈمرل منصور الحق اترے تو ان کے ساتھ ایک کلین شیو شخص جس نے بغیر ٹائی لگائے کالر بٹن بھی بند کیا ہوا تھا، ہنستے ہوئے اترا۔ میں نے غور کیا، پہچان گیا کہ یہ کون ہے۔ میں نے نواب شاہ کی سڑکوں اور دوستوں کے فنکشنز میں دسیوں دفعہ آصف علی زرداری کو دیکھا تھا مگر اس طرح کلین شیو اور بغیر ٹائی لگائے کالر بٹن بند کیے پہلی دفعہ دیکھا۔ لیفٹیننٹ احمد رضا کو میں نے اشارے سے بتا دیا کہ یہ صاحب کون ہیں۔ اس کے بعد ہم نے دیکھا ہی نہیں کہ ہیلی کاپٹر سے اور کون اتر رہا ہے۔ آفیسرز کے سلیوٹ کا جواب دیتے ہوئے وزیرِ اعظم گینگ وے کی طرف بڑھیں تو بے خیالی میں ان کے سینڈل کی ہیل ڈیک پر لکڑی کے فرش میں کہیں جا پھنسی۔ وہ گرتے گرتے بچیں مگر پہلے ناہید خان نے اور پھر بھاگ کر آصف علی زرداری نے ان کو تھاما۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ وزیرِاعظم کو تھامتا یہ مسکین سا نظر آنے والا شخص کسی دن صدرِ پاکستان بن بیٹھے گا۔ جہاز کے سینٹرل کاریڈور سے گزر کر سب لوگ دوسری طرف جا نکلے۔ کوارٹر ماسٹر اور گینگ وے اسٹاف نے وزیرِاعظم کو خوش آمدید کہنے کا

گہرے سمندروں میں پی این ایس نصر پر وزیرِاعظم بے نظیر بھٹو کی ہیلی کاپٹر میں آمد۔

پی این ایس نصر پر وزیرِاعظم بے نظیر بھٹو سلامی لیتے ہوئے۔

پی این ایس نصر پر وزیرِ اعظم بے نظیر بھٹو جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے۔

لیفٹیننٹ حید رنقوی، لیفٹیننٹ کمانڈر بشیر آرائیں، لیفٹیننٹ انجم بھٹہ۔

روایتی سلیوٹ کیا اور کیپٹن عارف قریشی انھیں کمانڈنگ آفیسر کے آفس میں لے گئے۔

جناب غلام مصطفیٰ کھر اپنی خوب رونئی بیوی کے ساتھ گینگ وے کے سامنے سے اس طرح گزرے جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لوگ دہلی کی گلیوں سے انڈیا کے فاتح کے طور پر گزر رہے ہوں۔ پاکستان کا ڈیفنس منسٹر گینگ وے کے سامنے سے گزرا تو کسی کو یہ خبر ہی نہ تھی کہ ہم وردی والے اسے قانونی طور پر سلیوٹ کرنے کے پابند ہیں اور شاید آفتاب شعبان میرانی صاحب کو بھی اب تک اپنے اختیارات اور پروٹوکول کی کوئی خبر نہ تھی۔

پہلا ہیلی کاپٹر ڈیک سے اڑ گیا تو ہوا میں مزید دو ہیلی کاپٹر نمودار ہوئے۔ سپلائی آفیسر لیفٹیننٹ کمانڈر اصغر بھاگتے ہوئے جہاز کے ٹاپ فلور پر پوپ ڈیک کے قریب میرے پاس آئے اور بتایا کہ کھانے والے ہیلی کاپٹر آ پہنچے ہیں، آپ نیچے آئیں اور فوڈ ٹیسٹنگ میڈیکل سرٹیفکیٹ پر دستخط کریں تاکہ ہم لنچ کی تیاری کر سکیں۔ جونیئر آفیسرز کی ڈیمانڈ اور اپنی بے ایمان طبیعت کے مطابق میں نے کچھ کھا کر ہی سرٹیفکیٹ پر دستخط کرنے تھے۔

ایک کے بعد دوسرا ہیلی کاپٹر اترا اور کھانے کی تمام ڈشز ڈائننگ ہال میں منتقل ہو گئیں۔ فائیو اسٹار ہوٹلز سے سولوگوں کا کھانا منگوا کر چودہ لوگوں کو کھلانے کا بندوبست ہو چکا تھا۔ میں نے ایک ڈش سے ایک ٹیبل اسپون سے لقمہ لیا تو سپلائی آفیسر منتیں کرنے لگا کہ سر یہ بارہ ہزار کی ایک ڈش ہے، کیوں خراب کرتے ہیں۔ بہرحال سرکاری ڈیوٹی تھی میں نے چپ چاپ سرٹیفکیٹ پر دستخط کر دیے کہ قوم کے خون پسینے کی کمائی سے خریدا گیا، یہ مہنگا ترین کھانا وزیرِاعظم کی صحت کے لیے بالکل موزوں ترین ہے۔ پھر ہمیں نہیں پتا کہ کھانے کی میز پر ان ڈشز کو کس کس نے کس کس طرح نوچا ہوگا۔

لنچ کے بعد وزیرِاعظم کو پوپ ڈیک پر لے جایا گیا جہاں کسی لانچنگ پیڈ سے میزائل فائر ہونے کی اطلاع آئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد سگنل آفیسر بھاگتا ہوا آیا اور وزیرِاعظم کو یہ خوش خبری سنائی کہ جو میزائل فائر کیا گیا ہے، وہ عین اپنے نشانے پر جا لگا ہے۔ انھوں نے خوش ہو کر ایڈمرل منصور الحق کو داد دی۔ جناب مصطفیٰ کھر اور ڈیفنس منسٹر کے لیے اس خبر کی کوئی وقعت نہ تھی کیوں کہ وہ سمندر کی لہروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ البتہ آصف علی زرداری نے لقمہ دیا کہ آپ

لوگوں نے تو میزائل نشانے پر لگنے ہی کی خبر سنانی ہوتی ہے، ہم کون سا دیکھ رہے ہیں۔ مگر وزیرِ اعظم سنجیدہ رہیں جہاز پر اذان کی آواز گونجی تو وزیرِاعظم نے خوش ہو کر کہا کہ آپ کے جہاز پر کتنا خوب صورت اذان بج رہا ہے، کیا جہاز پر مسجد بھی ہوتا ہے۔ اس بات پر جو جواب دینا تھا، وہ قریب ہو کر ایڈمرل منصور الحق نے دیا جو ہم تو نہیں سن سکتے تھے۔

نیوی میں وزیرِاعظم کا یہ دورہ بہت ہی انوکھا تھا اور شاید جونیئر آفیسرز ایسا پہلی دفعہ ہی دیکھ رہے تھے، اس لیے وہ ان اللوں تللوں پر پریشان بھی تھے اور حیران بھی کہ ہمیں پڑھایا کیا جاتا ہے، ٹریننگ کیا دی جاتی ہے اور یہ ہو کیا رہا ہے۔ چوں کہ وزیرِاعظم کا ہیلی کاپٹر دوبارہ فلائنگ ڈیک پر اتر چکا تھا اور واپسی کی تیاریاں ہو رہی تھیں، اس لیے ہم بھی فلائنگ ڈیک پر سلیوٹ کرنے کو آ کھڑے ہوئے۔ آصف علی زرداری ڈیک پر پہلے پہنچے تو ہم سے ہاتھ ملانے آ گئے۔ میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا کہ سر میں جام صاحب روڈ نواب شاہ کا رہائشی ہوں۔ وہ زور سے ہنسے اور کہا، میرے شہر کے لوگ فوج میں کیا کر رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھ سے اس وقت فوراً کوئی جواب نہ بن پڑا مگر پھر آہستہ آہستہ پتا چلتا گیا کہ نواب شاہ والوں کا اصل کام کیا ہونا چاہیے تھا۔

نام یاد نہیں مگر وزیرِاعظم کے ملٹری سیکریٹری ہمارے پاس آ کر کھڑے ہوئے تو میری سپاہیانہ رگ پھڑکی اور میں نے کہا، اللہ کرے انڈیا سے جنگ لگے تاکہ سیاست دانوں کی رہبری اور فوجیوں کی بہادریاں ہم جیسے جونیئر آفیسرز کو بھی دیکھنا نصیب ہوں کیوں کہ اب سنی سنائی کہانیوں سے یقین اٹھتا جا رہا ہے۔ سپلائی آفیسر ایک دم بولا، سر یہ بددعائیں کسی اور کو دیا کریں۔ یہ سن کر ملٹری سیکریٹری نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا، ڈاکٹر تو کیوں لوگوں کی روزی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔

میں ایسے کھڑا تھا کہ کاٹو تو خون ندارد۔ پھر نہ جانے کب وزیرِاعظم کا ہیلی کاپٹر اڑ گیا۔ ان کے پیچھے پیچھے دونوں وفاقی وزرا اور نیول چیف بھی ہمیں کھلے پانیوں میں ہچکولے کھاتے چھوڑ کر ہواؤں میں گم ہو گئے۔ ہم ہارے ہوئے لاوارث جونیئر آفیسرز کاریڈور سے نکل کر چپ چاپ فلائنگ ڈیک پر آ بیٹھے۔ اب ہم سب کی ایک ہی بحث تھی کہ ان سب جانے والوں کی کیا واقعی روزی لگی ہوئی ہے؟

ایک انڈا

یونائیٹڈ نیشن پروٹیکشن فورس مشن میں بوسنیا گئے تو ہمیں تنخواہ پاکستانی ہی ملتی تھی مگر مشن کے الاؤنس کے ساتھ ساتھ رہائش اور کھانا پینا فری ہوتا تھا اور ایک جوان کا روزانہ راشن اتنا ملتا تھا کہ اس میں چار لوگوں کا گزارا ہوسکتا تھا۔ چوں کہ پاکستانی چھاؤنی والی ورزشیں اور پی ٹی پریڈ بھی نہیں تھی، اس لیے میں نے تین ماہ بعد ہی محسوس کیا کہ جوانوں کا وزن بڑھ رہا ہے۔ مجھے ایک دفعہ بریگیڈیئر ایس پی شاہد نے اسپلٹ کی میس میں بیٹھے کہا کہ اگر جوان کھا کھا کر وزن بڑھا رہے ہیں تو تم ڈاکٹری طریقے سے یو این سپلائی والوں کو لکھ دو کہ کھانے کی اشیا کی مقدار کم کر دیں۔ ہمیں کھانے میں مٹن، چکن، فش اور انڈوں کے علاوہ بھی ہر قسم کی سبزیاں فروٹ آئس کریم کولڈ ڈرنکس چاکلیٹ اچار اور دنیا کی ہر نعمت مہیا تھی اور وافر مقدار میں۔ میں نے مقدار کم کرنے والی بات تو نہ مانی مگر ہاسپٹل کے قریب ایک ریفیوجی کیمپ میں رہنے والے بوسنین خاندانوں میں پکا ہوا کھانا بانٹنے کی اجازت لے لی اور اپنی ضرورت سے زیادہ راشن اور کھانا وہاں پہنچانا شروع کر دیا۔

یہ طریقہ اتنا مقبول ہوا کہ ۱۸ پنجاب رجمنٹ نے انتہائی منظّم طریقے سے ریفیوجی کیمپس میں تینوں وقت پکا پکایا کھانا پہنچانا شروع کر دیا اور پاکستان آرمی کی یہ نیک نامی پوری بوسنین قوم اور یو این کیمونٹی میں پھیلنے لگی کہ پاکستانی سولجرز اپنے راشن سے بچت کر کے ریفیوجی کیمپس میں لوگوں کو کھانا پہنچا رہے ہیں۔ تمام ریلیف این جی اوز خود مشاہدہ کرنے پہنچتیں اور اپنی رپورٹس میں اس کا ذکر باقاعدہ تصویروں کے ساتھ کرتیں۔

بوسنیا کے بعد میری پوسٹنگ چھور کینٹ (عمر کوٹ) ہوگئی۔ چھور کینٹ بن رہا تھا اور تھر کے لوگوں کے علاج معالجے کے لیے ہاسپٹل بنانے کے لیے فنڈز ہمارے کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل لہراسب خان کی درخواست پر محترمہ بےنظیر صاحبہ نے مہیا کر دیے۔ بوسنیا سے واپس آنے والا میڈیکل کا ساز وسامان جی ایچ کیو کی اجازت سے استعمال ہونا تھا۔ بعد میں چیف آف آرمی اسٹاف بننے والے جنرل اشفاق پرویز کیانی اس وقت چھور میں ہمارے بریگیڈ کمانڈر تھے۔ وہ

جب بھی ہاسپٹل کی بنتی بلڈنگ دیکھنے آتے تو مجھ سے بوسنیا مشن کے بارے میں ضرور پوچھتے۔

ایک دن میں نے بوسنیا میں ملنے والے راشن کا ذکر چھیڑ دیا اور سپلائی ہونے والی اشیا گنواتے ہوئے درخواست کی کہ سر کیوں نہ ہم اپنے سولجرز کو بھی ناشتے میں انڈا مہیا کیا کریں۔ یاد رہے کہ آرمی میں سولجرز کو لنگر سے تین وقت کھانا فری مہیا ہوتا ہے اور ناشتے میں چائے کے کپ کے ساتھ نام نہاد پراٹھا ملتا ہے۔سول بھائیوں کی یہ غلط فہمی بھی دور ہونی چاہیے کہ فوج کے آفیسرز کو کھانے کی کوئی بھی چیز میس میں فری ملتی ہے۔ جو بھی کھائیں اس کا بل آتا ہے۔ جنرل اشفاق پرویز کیانی نے ہنستے ہوئے کہا، یہ تو پالیسی کی بات ہے مگر چلو حساب لگاتے ہیں کہ خرچہ کتنا آئے گا۔

ایک انڈے کا آملیٹ یا خاکینہ بنانے کا حساب لگایا تو تقریباً ساڑھے تین روپے پڑا۔اگر کمبیٹ اور نان کمبیٹ نفری کے لیے روز چھ لاکھ انڈے بنیں تو اکیس لاکھ،تیس دن کے چھ کروڑ تیس لاکھ اور سال کے پچھتر کروڑ ساٹھ لاکھ (آج کے حساب سے تقریباً چار ارب) روپے بن گئے۔ کہنے لگے،بھئی یہ حساب کر کے تو دل گھبرانے لگا ہے۔ جوانوں کو ناشتے میں ایک انڈا مہیا کرنے کی اتنی بڑی رقم کہاں سے پوری ہوگی، رہنے ہی دو۔ چائے اور کچے پکے پراٹھے پر ہی رہنے دو۔

میں بھی یہ سن کر چپ ہو گیا کیوں کہ اس سے زیادہ ضروری تو سینئر سول اور فوجی آفیسرز کے اللے تللے اور سینیٹرز، ایم این ایز اور ایم پی ایز کی تنخواہیں اور سفری الاؤنس پورے کرنے ہوتے ہیں کیوں کہ ان سب کا پولیس اور فوج کے جوانوں سے زیادہ حق ہوتا ہے۔ یہ سب ملک و قوم کی وہ وہ خدمت کرتے ہیں کہ ہلالی پرچم میں لپٹی ملک وقوم پر قربان ہوئے جوانوں کے جسدِ خاکی ان کی خدمات کے سامنے شرماتے شرماتے دفن ہو جاتے ہیں۔

سر آپ افسر تو لگتے ہی نہیں ہیں

۱۹۹۵ء میں جب میں بوسنیا سے واپس آ کر یو این مشن ہاسپٹل کا سامان آرمڈ فورسز میڈیکل اسٹورز ڈپو کراچی میں جمع کروا رہا تھا تو حادثاتی طور پر کور کمانڈر کراچی لیفٹننٹ جنرل

بریگیڈ کمانڈر بریگیڈیئر اشفاق پرویز کیانی چھور ہاسپٹل کی انسپکشن کے دوران۔
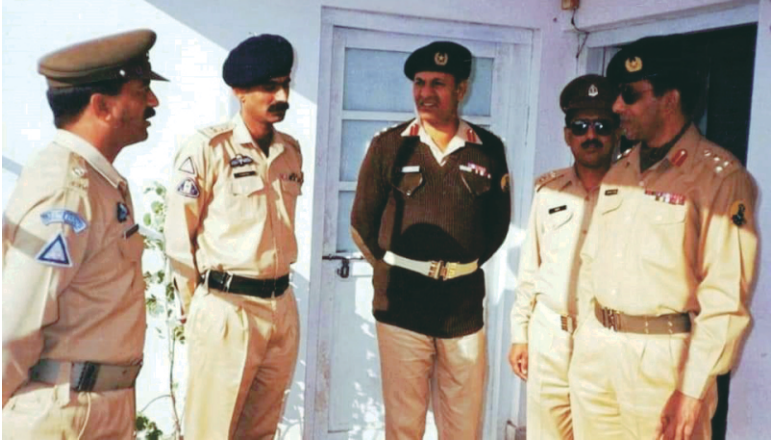
بریگیڈیئر اشفاق پرویز کیانی کے ساتھ۔ چھور کینٹ عمر کوٹ (سندھ)۔

عمرکوٹ کے قریب چھور کینٹ کا مین گیٹ۔

سی ایم ایچ چھور کینٹ کا بیرونی منظر۔

لہراسب خان سے آمنا سامنا ہوگیا۔تعارف ہوا تو انتہائی محبت بھرے لہجے میں کہنے لگے،تھر میں لوگوں کے لیے ایک نیکی کا کام شروع کرنا ہے۔تم بوسنیا ہاسپٹل کا سامان چھور کینٹ لے جانے کی تیاریاں کرو۔ جی ایچ کیو سے اس کی اجازت اور تمھاری پوسٹنگ کا بندوبست ہو جائے گا۔

پتا چلا کہ وزیرِاعظم بےنظیر بھٹو صاحبہ نے تھر کے لوگوں کے علاج معالجے کی سہولت کے لیے کور کمانڈر کراچی کو کچھ فنڈز دیے تھے اور لیفٹننٹ جنرل لہراسب خان کے فیصلے کے مطابق ان فنڈز سے چھور کینٹ میں ایک ہاسپٹل بنانے کی تیاری ہو رہی تھی اور اس طرح آرمی یونٹوں کے ساتھ ساتھ وہاں کے لوگوں کو بھی علاج کی سہولتیں مہیا کی جانی تھیں۔اب صرف جی ایچ کیو سے اجازت لینی باقی رہ گئی تھی۔

میری پوسٹنگ ۸ فیلڈ میڈیکل بٹالین چھور کینٹ ہوگئی۔ چھور کینٹ زور شور سے بن رہا تھا اور ہاسپٹل کی بنتی بلڈنگ کی دیکھ بھال ہماری میڈیکل یونٹ کے ذمے لگ گئی۔

فیلڈ میڈیکل بٹالین میں ڈاکٹرز کو پرائیویٹ پریکٹس کی اجازت نہیں ہوتی مگر کور کمانڈر نے کہا کہ اگر مقامی لوگوں کو اس سے فائدہ ہوسکتا ہے تو ڈاکٹر پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دیں۔ میں یونٹ میں سیکنڈ اِن کمانڈ تھا۔سی او نے ہاسپٹل کے آفیسرز وارڈ میں عارضی طور پر میس بنانے کی اجازت دے دی اور میں دوسرے چند آفیسرز کے ساتھ وہیں ہاسپٹل کے اندر رہائش پذیر ہوگیا۔ اردگرد کے علاقوں میں اعلان کیا گیا کہ فوجی ڈاکٹرز سے واجبی سے گورنمنٹ چارجز پر سویلین لوگ بھی علاج کروا سکتے ہیں۔تھر کے لوگ انتہائی غربت کا شکار نظر آتے تھے اور کینٹ کے اندر آنا، ان کے لیے بالکل ہی نیا تجربہ تھا۔ بریگیڈیئر اشفاق پرویز کیانی نے حکم دیا کہ سول مریضوں کو کینٹ کے اندر آنے سے بالکل نہ روکا جائے۔بس پھر کیا تھا،لوگ دھڑا دھڑ ہاسپٹل میں آنے لگے۔

میں ان سب کا محبت سے استقبال کرتا، پانی اور چائے پلواتا۔ زیادہ لوگ اپنے بوڑھے بیمار والدین کو علاج کے لیے لاتے یا خواتین بچے کی ڈیلیوری کے لیے آتیں۔ گھروں میں دائی سے کیس خراب ہو جاتا تو وہ خاتون کو گدھا گاڑی یا بیل گاڑی پر ڈال کر ہمارے پاس لے آتے۔ ہاسپٹل کا خرچہ پوچھتے تو میرا سوال ہوتا کہ آپ کے پاس کتنے پیسے ہیں؟ کوئی ہزار پندرہ سو بھی کہہ دیتا تو میں سمجھاتا کہ یہ تو بہت زیادہ رقم ہے۔اس میں آپریشن کرکے بھی کچھ پیسے بچ

جائیں گے۔ ان دنوں لوگ مجبوری میں چھور یا عمر کوٹ سے حیدر آباد تک ایمولنس کا کرایہ ہی چار ہزار روپے دیتے تھے۔ ہم نے کبھی کسی کو یہ احساس نہ ہونے دیا کہ پیسے کم ہونے کی وجہ سے اس کا علاج یا آپریشن نہیں ہو سکے گا۔ اس سارے عمل میں کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل لہراسب خان، بریگیڈ کمانڈر اشفاق پرویز کیانی اور ہمارے سی او کرنل نور محمد میمن کی زیادہ مہربانیاں شامل تھیں۔ میجر ارشد نسیم (اب میجر جنرل ہے) میڈیکل اسپیشلسٹ میجر اعظم (سرجن)، میجر روبینہ (گائنا کالاجسٹ) اور میجر اطہر صدیقی (انیستھیٹسٹ) کی خدا ترسی نے میرا کام اور بھی آسان کر دیا تھا۔ سیکنڈ اِن کمانڈ ہوتے ہوئے میں تو بس سہولت کار کی ڈیوٹی نبھاتا تھا۔

کسی بھی ہاسپٹل کو چلانے کے لیے سول اسٹاف کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے وہیں تھر کے لڑکوں کو ہاسپٹل کا چائے کا اسٹال دے دیا۔ کسی کو شہر سے دوائی لانے اور کسی کو میس ویٹر لگا کر، ان کے دل سے فوج کے ڈر یا جھجک کو کچھ دنوں میں ہی دور کر دیا۔

اب میرے سندھ کے ذاتی دوست، اردگرد کے زمین دار اور سول آفیسر بھی ملنے آنا شروع ہو گئے۔ کچھ تو مریضوں کے لیے سفارشیں بھی کرتے۔ میرا تو سب مریضوں اور لوگوں کے ساتھ ایک جیسا ہی محبت والا رویہ ہوتا تھا۔ ہر کوئی یہی سمجھتا کہ اس کا خیال سب سے زیادہ رکھا جا رہا ہے۔ مجھے حیرت اس وقت ہوتی، جب تھر ہی کے وڈیرے، زمیں دار، کاروباری لوگ اور سول آفیسرز مجھے ایک ہی بات سمجھاتے کہ آپ ان گدھا گاڑیوں اور بیل گاڑیوں میں آنے والوں سے جس طرح ملتے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ آپ افسر لگتے ہی نہیں ہیں۔ آفیسرز کا اپنا ایک اسٹیٹس ہوتا ہے اور وہ ہرا یرے غیرے سے ہاتھ بھی نہیں ملایا کرتے اور آپ ہیں کہ ان سے گلے ملتے رہتے ہیں اور چائے پلاتے ہیں۔ روز بہ روز آپ کا سارا فوجی آفیسر والا رعب اور دبدبہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ میں یہ باتیں سن کر مسکرا کر سب سے کہتا کہ نہیں نہیں لوگ مجھ سے بہت ڈرتے ہیں، آپ فکر نہ کریں۔

مدتیں گزر چکی ہیں۔ میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہوں مگر تھر کے لوگ اب بھی مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ میں اب بھی ان سے اٹھ کر گلے ملتا ہوں۔ تھر میں پانی کی قلت تب بھی تھی مگر ذاتی طور پر کچھ نہ کر پایا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے تو وہاں سولر سسٹم کے ساتھ کنویں لگوانے شروع کر دیے ہیں۔ دل خوش اس وقت ہوتا ہے جب اس چائے کے اسٹال والے لڑکے کو عمر کوٹ

میں ایک خوب صورت ہوٹل چلاتے دیکھتا ہوں۔ وہ شہر سے دوائی لانے والا غریب سالڑکا اب آرمی ہاسپٹلز میں میڈیسن سپلائی کنٹریکٹر بن چکا ہے اور اسلام آباد میں کسی کے ساتھ مل کر دوائیوں کی فیکٹری لگا رہا ہے۔ وہ ہر گرمی کے موسم میں مجھے آم دینے کے بہانے ملنے آتا ہے اور اسے دیکھ کر میں خوش ہوتا ہوں کہ انسان کو ہماری چھوٹی سی رہنمائی کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔

لوگوں کو میرے آفیسر نہ لگنے والی سوچ کی ایک جھلک مدتوں بعد مجھے سی ایم ایچ میں بھی دوبارہ نظر آئی۔ میں سی ایم ایچ ملیر میں میجر اور لیفٹیننٹ کرنل کے رینک میں بھی پوسٹنگ کاٹ چکا تھا اور ہاسپٹل کا مستقل سویلین عملہ یعنی سوپرز، مالی، میس ویٹرز اور باورچی مجھے پچھلے پندرہ سال سے جانتے تھے۔ میں جب بریگیڈیئر بن کر سی ایم ایچ ملیر کمانڈ کرنے پہنچا تو یہ سب لوگ مجھے باری باری ملنے اور سلام کرنے آنے لگے۔ میں اپنے آفس سے باہر آ کر ان سے خوش دلی سے گلے ملتا، ان کے نام لے کر ان کا حال پوچھتا اور وہ خوشی اور حیرت سے مجھے دیکھتے واپس جاتے۔ ایک دن میں نے خود سنا کہ ایک مالی مجھ سے ملنے کے بعد اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا، اوئے بھائیو یہ تو بالکل بھی نہیں بدلا۔ بریگیڈیئر تو لگتا ہی نہیں ہے۔ کیسے اٹھ اٹھ کر گلے ملتا ہے۔ بھلا آفیسر ایسے ہوتے ہیں۔

میں یہ گتھی آج تک نہ سلجھا سکا کہ محبت سے گلے ملنے والا آخر آفیسر کیوں نہیں لگتا۔ آخر لوگ کیوں کہتے تھے کہ یہ بریگیڈیئر تو لگتا ہی نہیں ہے۔ کبھی کبھی بیٹھا سوچتا رہتا ہوں کہ میں صاحب بہادر کیوں نہ بن سکا، جب کہ ہماری پوری قوم کو تو صرف صاحب بہادر آفیسرز کی ضرورت ہے جو اپنی رعایا سے ہاتھ ملانا بھی اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ہماری قوم کے آفیسرز کا آخر ایک دبنگ اسٹیٹس تو ہونا چاہیے ناں۔

زندگی کا سب سے مشکل سفر

چھور کینٹ کی اچھی یادوں کے ساتھ ایک ایسی بری یاد بھی جڑی ہے جس نے مجھے دنیا کا سب سے بے بس انسان ثابت کر دیا۔ جو لوگ سروس میں میرے ساتھی رہے یا جنھوں نے

میرے ساتھ نوکری کی، شاید کبھی وہ اس بات کی گواہی دے سکیں کہ میں لوگوں کے لیے آسانیاں ڈھونڈتے ڈھونڈتے ناممکن کو ممکن بنا دیتا تھا۔ شاید اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا ڈیزائن کر دیا تھا کہ مجھے کبھی یہ خیال تک نہیں آتا تھا کہ میری نوکری خراب ہو سکتی ہے۔ آفیسرز چھور پوسٹ ہوتے تو پریشان ہو جاتے مگر انھیں کوئی نہ کوئی یہ دلاسہ دیتا کہ ۸ فیلڈ میڈیکل یونٹ میں سیکنڈ ان کمانڈ میجر بشیر آرائیں ہے، تمھیں پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔ میں یہ سب سنتا تو اللہ سے دعا کرتا کہ مجھے توفیق دے کہ لوگوں کی امیدوں پر پورا اتر سکوں۔

چھور میں آفیسر میس واجبی سی تھی۔ ہم زیادہ تر ڈاکٹر بغیر فیملی کے رہتے تھے۔ فیملی کے ساتھ وہ ہوتے تھے جو دونوں میاں بیوی ڈاکٹر تھے اور فوجی بھی۔ میجر اطہر مختار صدیقی بے ہوشی کے اسپیشلسٹ بھی چھور پہنچ گئے۔ ان کی نفیس شخصیت نے ہمیں چند ہی دنوں میں دوست بنا دیا اور ہم نے ایک ہی کمرے میں ڈیرے ڈال دیے۔ میری فیملی کراچی اور ان کی لاہور میں تھی۔ جس کی فیملی ملنے آتی دوسرا ہاسپٹل کے آفیسر وارڈ میں شفٹ ہو جاتا اور یوں بچے چھٹیاں گزار کر چلے جاتے۔ میجر اطہر کی بیگم جو خود بھی ڈاکٹر تھیں، دو معصوم سی بچیوں کے ساتھ آتیں تو میں ہاسپٹل کے وارڈ میں جا کر رہنے لگتا۔ پھر مجھے بھابھی کی پکائی ہوئی مزے مزے کی ڈشز کھانے کو ہاسپٹل میں ڈلیور ہوتی رہتیں۔ بہت دور کی بات نہیں جب پوری آرمی ایک فیملی کی طرح تھی اور پھر ہم سب فوجی نہ جانے کب سیاسی ہو گئے۔ پورا شیرازہ بکھرتا گیا۔ قدریں بدلتی گئیں اور اب آپ امید نہیں کر سکتے کہ اکیلے رہتے کسی آفیسر کو کوئی فیملی کھانے پر بلا لے۔ رواج ہی نہیں رہا۔

ہمارے اسپیشلسٹ ڈاکٹرز کی چھٹی اسسٹنٹ ڈائریکٹر میڈیکل سروسز حیدرآباد سے کنٹرول ہوتی تھیں اور اس کے لیے پندرہ دن پہلے درخواست کرنی پڑتی تھی۔ کسی دوسرے سی ایم ایچ سے اسی اسپیشلٹی کا ڈاکٹر آتا اور پھر جا کر چھٹی ملتی۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ کسی ویک اینڈ پر اچانک میجر اطہر مختار صدیقی کہنے لگے، سر بچیوں سے ملنے کو مرا جا رہا ہوں۔ میں نے جیپ نکالی۔ عمر کوٹ اپنے کلاس فیلو میجر ریٹائرڈ علی نواز انیستھیٹسٹ کو ایمرجنسی کے لیے تیار کیا اور میجر صدیقی سے کہا کہ میری کار لے جاؤ۔ کراچی ائیر پورٹ پر کھڑی کر کے لاہور نکل جاؤ۔ دو رات گزار کر اتوار کی شام واپس آ جانا۔ اللہ بھلا کرے میجر روبینہ گائنا کالاجسٹ کا جسے ہماری ان تمام حرکتوں

کا پتا تھا اور وہ آپریشن ایک آدھ دن ٹال گئیں یا شاید میجر علی نواز کو بلا لیا تھا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ میرے کمرے میں میجر اطہر موجود نہیں ہے۔

اتوار کا دن تھا۔ صبح کے وقت ہم باہر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ میں بادلِ نخواستہ اٹھتا ہوں اور فون اٹھاتا ہوں۔ دوسری طرف کوئی اجنبی شخص کہتا ہے کہ مجھے میجر بشیر آرائیں سے بات کرنی ہے۔ ایک ایمرجنسی ہے۔ لوگ میرے بارے میں کہتے تھے کہ اگر ایٹمی جنگ بھی لگ جائے تو میں شیو کر کے، نہا دھو کے، ناشتا کر کے ہی سی او کو فون کروں گا کہ جنگ لگ گئی ہے مگر نہ جانے آج کیوں دل دھک سے رہ گیا تھا۔ بتانے والے نے کہا کہ آپ کے ساتھی میجر اطہر صدیقی کی دو بیٹیاں جس کشتی میں کینجھر جھیل میں سیر کو گئی تھیں، وہ کشتی الٹ گئی ہے اور اس کے بعد کسی کا کچھ پتا نہیں۔ آپ کینجھر جھیل پہنچیں۔

یہ دونوں وہ بچیاں تھیں جو سال میں ایک دفعہ ہماری میس کی رونق بنتی تھیں۔ میں عمر کوٹ سے ان کے لیے آئس کریم منگواتا۔ ہاسپٹل کے آفیسر وارڈ میں ان کے لیے خود چکن کڑاہی بناتا اور وہ شور مچاتیں کہ انکل مرچیں بہت ڈالتے ہیں۔ میں نے خود کو خود ہی تسلی دی۔ ضرورت کے پیسے جیب میں ڈالے۔ اپنے سی او کرنل نور میمن کو فون پر سب بتایا اور باہر آ کر میجر اطہر سے کہا کہ شاید آج بچیاں اپنے ماموں کے ساتھ کراچی سے ٹھٹھہ کینجھر جھیل کی سیر کو جا رہی تھیں تو کار کچھ بے قابو ہوئی اور کہیں ٹکرا گئی۔ ہمیں ٹھٹھہ ہاسپٹل جانا ہے تا کہ اگر چوٹ زیادہ ہو تو بہتر انتظام کر سکیں۔ میجر اطہر صدیقی کو مجھ پر اس قدر یقین تھا کہ بغیر کسی اضافی سوال کے میرے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔

موبائل فون کا کوئی نظام نہ تھا۔ سڑک کے کنارے ٹیلی فون بوتھ لگے ہوتے تھے۔ میجر صدیقی بوتھ کو دیکھ کر بے چین ہوتا اور کہتا کہ سر ٹھٹھہ ہاسپٹل فون کر لیتے ہیں کہ کہیں زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔ میں بھاگ کر بوتھ پر جاتا۔ فرضی نمبر ڈائل کرتا اور کہہ دیتا کہ ڈاکٹر سے بات نہیں ہو پا رہی۔

میں اللہ کے کرم سے بہت اچھا ڈرائیور جانا جاتا تھا۔ مگر آج کلچ بریک میرے قابو میں نہیں تھے۔ نہ جانے کیسے باتیں کرتے، تسلیاں دیتے میجر صدیقی کو لے کر چھور سے میر پور خاص، حیدر آباد سے ہوتے ہوئے ٹھٹھہ کی طرف جا رہا تھا کہ کینجھر جھیل سے کچھ پہلے ایک ٹیلی

فون بوتھ نظر آیا۔ پھر کار روکی۔ میجر صدیقی مجھ سے پہلے اتر کر بوتھ کی طرف گیا کہ اب وہ خود بات کر لے لیکن بات کس سے کرنی ہے اسے کچھ پتا نہ تھا۔

بوتھ کے پاس دو کھڑے دیہاتیوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ فوجی ہو؟ میں نے ہاں میں جواب دیا تو کہنے لگے، صبح کسی فوجی کی دو بچیاں کینجھر جھیل میں ڈوب گئیں تھیں اور ابھی تک نہیں ملیں۔ وہاں بہت لوگ جمع ہیں۔ میجر اطہر نے میری طرف حیرت سے دیکھا تو میں نے نظریں چرائیں۔ وہ کار کا سہارا لے کر آہستہ سے زمین پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر کو میں چپ چاپ کھڑا رہا۔ ہمت کر کے میجر صدیقی کو پکڑ کر کھڑا کرنا چاہا تو انھوں نے مجھے نہ جانے کتنے کرب سے، کتنے درد سے اور کتنے شکووں سے پوچھا، سر کیا یہ سب آپ کو پتا تھا؟ میں نے اپنے آنسو روکنے تھے اس لیے خاموش رہا اور اسے خاموشی سے کار میں بٹھا دیا۔ یہی وہ دس کلومیٹر کا سفر تھا جو اس کہانی کا عنوان ہے۔ میں عمر کوٹ سے یہاں تک تو پہنچ گیا تھا مگر یہ دس کلومیٹر زندگی کا سب سے طویل اور مشکل سفر رہا۔ کار کی رفتار ایسی رکھ رہا تھا کہ کینجھر جھیل کبھی نہ آئے، نہ جھیل پر پہنچوں نہ مجھے وہاں کچھ دیکھنا پڑے۔

جس جگہ زیادہ لوگ تھے گاڑی وہیں جا روکی۔ پہلے میجر اطہر کو کار سے اترنے نہیں دیا۔ دور درختوں کے نیچے بھابھی کو اپنے بھائی کا ہاتھ تھامے کھڑے دیکھا تو میجر اطہر کو اتار کر وہاں تک پہنچا دیا۔ میں دوسری طرف منہ کر کے آہستہ آہستہ چلنے لگا تا کہ آہیں اور سسکیاں نہ سن سکوں۔ پولیس کے ایک افسر نے بتایا کہ ہم آرمی ہیڈ کوارٹر کو بتا چکے ہیں اور نیوی کے لوگ پہنچنے والے ہیں۔ آٹھ گھنٹے گزر چکے تھے، بچیوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ زندہ ہونے کی تمام امیدیں ٹوٹ چکی تھیں۔ مجھے پولیس افسر نے ایک جگہ لے جا کر فون مہیا کیا کہ میں جس جس جگہ اطلاع کرنا چاہوں، کر لوں۔

آرمی کا ایسا مضبوط نظام ہے کہ میں جہاں بھی فون کرتا، ان کو پہلے سے خبر تھی اور تمام ممکنہ وسائل حرکت میں آ چکے تھے کہ بچیوں کو جھیل سے کیسے ڈھونڈ کر نکالا جائے۔ میں نے پولیس آفیسر سے کہا کہ مجھے کشتی میں اس جگہ لے چلو جہاں کشتی الٹی تھی اور میرے اسی فیصلے نے مجھے دنیا کا سب سے بے بس انسان بنا دیا۔

میں اس جگہ پہنچا جہاں تحریم اور حریم بیٹی کشتی سے باہر گری تھیں۔ کیسی بے بسی تھی۔ کیا کرتے۔ کیا کر سکتے تھے۔ واپس آ گیا اور کنارے لگنے سے پہلے ہی میجر اطہر نے مجھے کشتی میں دیکھ لیا اور اونچی آواز لگائی کہ وہ دیکھو میرا یار آ گیا ہے، وہ ان کو ڈھونڈ لائے گا۔ وہ جو کہتا ہے وہ ضرور کرتا ہے۔ میں نے اس کی یہ بات سنی تو سانس لینا مشکل ہو گیا۔ میں انتہائی لاچاری سے کشتی میں سیٹ سے اٹھ کر نیچے تختے پر بیٹھ گیا اور ڈرائیور سے کہا کہ کشتی واپس موڑ لو۔ ہم دوبارہ جھیل میں اسی جگہ جا رکے جہاں حادثہ ہوا تھا۔ مغرب ہونے کو تھی۔ نیوی کے غوطہ خور پہنچ چکے تھے مگر اندھیرے کی وجہ سے آپریشن صبح فجر کے بعد شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

اپنے جن مضبوط اعصاب پر مجھے ناز تھا، وہ چکنا چور ہو چکے تھے۔ میں نے واپس نہ جانے کا فیصلہ کیا اور جھیل کے دوسری طرف جا اترا۔ وہاں سے اپنے سی او کرنل نور محمد میمن کو فون کیا کہ خدا کے واسطے اپنے یونٹ کے کسی افسر کو بھیج دیں۔ میں اکیلا میجر اطہر کو کیا تسلیاں دوں۔ میں نے میجر اطہر کا اس وقت بھی سامنا نہ کیا جب دوسرے دن ہم بچیوں کو سفید چادر میں لپیٹ کر جھیل سے باہر لے آئے تھے۔

آپ فوجی ہوں، جوان ہوں، سینہ تان کر چلتے ہوں، دوسرے لوگ آپ کے بل بوتے پر دشمن کو للکارتے ہوں، آپ کے سہارے لوگ راتوں کو سکون کی بے خطر نیند سوتے ہوں، پھر سوچیں کہ اگر آپ ان کے سامنے رو پڑیں تو ماحول کیسا ہو گا؟ ہم خوب روئے مگر چھپ چھپ کر۔ سسکیاں نہ رکتیں تو میں کھانسنے لگتا۔ ہم فوجی آفیسر جو کالے چشمے اسٹائل کے لیے پہنتے رہتے تھے ان چشموں نے آج ہماری مردانگی کا بھرم رکھا ہوا تھا اور سوجی لال آنکھوں کو چھپایا ہوا تھا۔ اب تک کی ساری نوکری میں ہم نے بچوں کو اپنے باپ کی گھر آئی لاش پر روتے دیکھا تھا۔ آج میں نے سب فوجیوں کو اپنے بچوں کے لیے روتے دیکھا۔ ۵ کور میں کراچی سے چھور اور چھور سے پنو عاقل تک ہر آنکھ اشک بار تھی۔ ان چالیس گھنٹوں میں ایک لمحے کو بھی میں نے میجر اطہر کی طرف نہیں دیکھا۔ بچیوں کو لے کر وہ لاہور جا رہے تھے۔ میں ائیر پورٹ پر خدا حافظ کہنے کو موجود رہا۔ لاؤنج میں جانے سے پہلے میں نے پیچھے سے میجر اطہر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اسے جو بات زباں سے نہ کہہ سکتا تھا دل میں کہتا رہا کہ میں کتنا بھی پکا سچا یار سہی مگر سب کچھ کبھی

نہیں کر سکتا۔ قدرت کے فیصلوں سے کون لڑے۔ وہاں بھی ہم میں کوئی بات نہ ہوئی اور وہ سب لاہور چلے گئے۔

لوگ مجھے بہت مضبوط انسان کے طور پر جانتے ہیں مگر میرا حال یہ ہے کہ دو دہائیاں گزر گئیں ہیں، میجر اطہر سے بات نہیں کرتا۔ ہم چھور میں اپنے کمرے میں بیٹھے گھنٹوں اپنے بچوں کی باتیں کرتے رہتے مگر اب ایسا ہوگیا ہوں کہ میں اپنی بیٹی معصومہ کی شادی پر بھی اسے دعوت نہ دے سکا کہ اکٹھے ہوئے تو پھر ہمیں وہ دو بیٹیاں یاد آئیں گی تو ہم سوائے آنسو بہانے کے کیا بات کریں گے۔

میں نے سالوں بعد اسے فون کر کے یہ واقعہ لکھنے کی اجازت مانگی کہ شاید میں لکھ کر اسے سمجھا سکوں کہ میں اس سے بات کیوں نہیں کر پاتا۔

فوج سے محبت

۱۹۸۴ء میں میری پوسٹنگ چترال اسکاؤٹس میں ہوگئی۔ کرنل مراد خان نیر کمانڈنٹ تھے۔ دروش پہنچا تو پتا چلا پوری وادی میں ان کا ہی طوطی بولتا ہے۔ وہ ہر قصبے، ہر گاؤں میں لوگوں کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے۔ پہلے انٹرویو میں ہی کہنے لگے کہ ڈاکٹر ہونے کے ناتے تم میرے ساتھ ہر جگہ اور ہر گاؤں چلا کرو گے تا کہ اگر کہیں لوگوں کی صحت کے مسائل ہوں تو مجھے براہِ راست بتا سکو کہ ہم کس طرح ان کی مدد کریں کہ ان کا بہتر علاج و معالجہ ہو سکے۔

ایک دفعہ ہم ایک شادی کی دعوت میں شریک ہونے دور دراز کے ایک گاؤں میں گئے۔ گاؤں سے کچھ پہلے پہاڑوں سے بہتے پانی کا نالہ پڑا تو جیپ رک گئی کیوں کہ جیپ کا پانی سے گزرنا خطرناک تھا۔ ہمیں آگے خود پانی سے گزر کر جانا تھا۔ کمانڈنٹ لوگوں سے مل رہے تھے تو میں نے اپنی وردی کی شلوار اوپر چڑھا لی اور چپل اتارنے لگا۔ مجھے صوبے دار میجر فاروق جان نے کہا کہ سر یہ لوگ اپنے ہاتھوں کا جھولا بنا کر آپ کو اس میں بٹھا کر پانی سے پار لے کر جائیں گے۔ میں نے کہا، میں ایسا کیوں کروں گا۔ میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ کہنے لگا، سر یہاں کے لوگ کہتے ہیں فوجی ہمارے ملک کے محافظ ہیں۔ یہ فوج سے اپنی محبت اور عقیدت

کا اظہار اسی طرح کرتے ہیں۔ میں حیران و پریشان دو چترالی نوجوان کے ہاتھوں کے جھولے میں نالہ پار کر رہا تھا اور کرنل مراد خان نیر بھی ہنستے ہوئے اسی طرح میرے پیچھے آ رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا، یا اللہ خا کی وردی والوں سے قوم کی یہ کیسی محبت ہے کہ نالے میں ہمارے پاؤں بھی بھیگنے نہیں دیتے۔

۱۹۸۷ء میں سندھ پر ڈاکوؤں کا قبضہ ہوتا جا رہا تھا اور ان کا قلع قمع کرنے کو ایس ایس جی کا ہیڈ کوارٹر چراٹ سے نواب شاہ پہنچ گیا۔ ایس ایس جی کمانڈوز سندھ میں ہر کونے کھدرے میں ڈاکوؤں کا پیچھا کر رہے تھے۔ فورس کمانڈر بریگیڈیئر ٹی ایم نے سولہ ڈویژن پنوں عاقل سے سندھی اسپیکنگ ڈاکٹر مانگ لیا تاکہ طبی امداد کے ساتھ ساتھ وہ ایس ایس جی فورس اور مقامی لوگوں کے درمیان ترجمانی کے فرائض بھی انجام دے۔ میں ان دنوں ۳۴۳ فیلڈ میڈیکل یونٹ روہڑی سیمنٹ فیکٹری میں تھا۔ ایس ایس جی کے ساتھ پیراٹروپنگ اسکول پشاور میں ایک کورس بھی کر چکا تھا اور پھر نواب شاہ کا رہائشی تھا۔ میری ایس ایس جی کے ساتھ ڈیوٹی لگ گئی۔

میں نواب شاہ پہلی دفعہ فوجی وردی پہن کر نکلا تو بہت سے لوگ کیمرے اٹھائے ملنے آتے اور میرے ساتھ فوٹو بنواتے۔ نواب شاہ کے بہت سے معززین کہتے کہ ہمیں فوجی بھائیوں کے ساتھ گروپ فوٹو بنوانے ہیں اور میں ان کی یہ خواہش پوری کرنے میں مدد کرتا رہتا تھا۔

ہیڈ کوارٹر میں صلح مشورے کے بعد فیصلہ ہوا کہ جس علاقے سے بھی کوئی اطلاع ملے گی ڈاکوؤں کا پیچھا کیا جائے گا اور جہاں رات ہو جائے گی، آبادی اور گوٹھوں سے ذرا دور ہی اپنی جیپیں اور ٹرک روک کر انھی میں بستر بچھا کر رات گزار لیا کریں گے۔ دوسری رات مورو شہر سے ذرا دور سنہری فارم کے قریب گاڑیاں روک لی گئیں۔ شام کا وقت تھا۔ ہم تقریباً پچاس لوگ تھے۔ باورچی لکڑیاں جلا کر کھانا بنانے لگے اور جوانوں نے زمین پر اور ٹرکوں پر بستر بچھانے شروع کر دیے۔ ہم کھانا کھا رہے تھے کہ قریب کے گوٹھ سے لوگ بیل گاڑیوں پر چار پائیاں اور کندھوں پر پانی کے مٹکے لے کر پہنچ گئے۔ مجھے کمپنی کمانڈر نے کہا کہ ان سے کہو یہ تکلیف نہ کریں۔ ہم اس طرح ان کو پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ گوٹھ کے کچھ لڑکے پڑھے لکھے بھی تھے۔ اس لیے مجھے سندھی بولنے کی ضرورت ہی نہ پڑی اور وہ کمپنی کمانڈر سے خود ہی مخاطب ہوئے کہ

یہ تکلیف نہیں ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ ہمارے گاؤں کے پاس رات گزاریں گے۔ پاک فوج ہماری شان ہے۔ آج ہمیں خدمت کا موقع دیں۔ ہم سب تھکے ہوئے تھے۔ چارپائیوں پر رلیاں بھی بچھ گئیں اور ہم مزے سے سو گئے مگر اصل حیرت صبح اس وقت ہوئی جب سورج نکلتے ہی پچاس لوگوں کا لسی مکھن والا دیسی ناشتا بھی پہنچ گیا۔ اندرونِ سندھ اس علاقے میں فوجی پہلی دفعہ دکھائی دے رہے تھے اس لیے لوگ شوق در شوق دور کھڑے ہمیں ہاتھ ہلا رہے تھے۔ کمپنی کمانڈر نے سب کو بلا کر ان سے ہاتھ ملانا شروع کیا تو ان کے چہروں پر محبت اور خوشی دیدنی تھی۔ یہ ۱۹۸۷ء کی باتیں ہیں۔

۲۰۰۱ء میں جب انڈیا سے جنگی تیاریاں عروج پر تھیں تو میں بطور کمانڈنگ آفیسر ایک فیلڈ ہاسپٹل لے کر اوکاڑہ کینٹ سے فورٹ عباس جا رہا تھا۔ پوری آرمی جنگی تیاریوں میں اپنے اپنے محاذ پر پہنچنے کو رواں دواں تھی اور ہر طرف سڑکوں پر فوجی گاڑیاں نظر آتی تھیں۔ ہم نے ہارون آباد سے پہلے ایک گاؤں کے ساتھ پڑاؤ کیا تا کہ جوان دوپہر کا کھانا کھا سکیں۔ ساتھ ہی مالٹے اور کنّو کا ایک باغ تھا اور کھیتوں میں گُڑ بنانے کا بیلنا چل رہا تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ کچھ مالٹے اور گنے کا رس خریدا جائے۔ اپنے بیٹ مین کو بیلنے کے مالک کے پاس بھیجا لیکن وہ خالی ہاتھ واپس آ گیا۔ کہنے لگا، وہ بیلنے والے بابا جی کہتے ہیں، جو چاہیے لے جاؤ مگر میں فوجیوں سے پیسے نہیں لوں گا۔

میں جیپ سے اتر کر خود بیلنے پر گیا۔ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس بابا جی خوب محبت سے ملے۔ میں نے مالٹے اور گنے کا رس خریدنے کی خواہش ظاہر کی تو کہنے لگے، جی جی جو چاہیے لے لو۔ میں نے کہا، بابا جی مگر آپ پیسے تو لیں ناں۔ بابا جی نے آگے بڑھ کر بہت محبت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہنے لگا، ''پتر کیا اب ہم اپنے محافظوں سے مالٹوں اور گنے کے رس کے پیسے لیں گے؟'' میں لاجواب کھڑا رہ گیا۔ کوئی جواب نہ بن پڑا تو دو قدم پیچھے ہٹ کر بابا جی کو اس طرح فوجی سلیوٹ کیا جیسے سامنے جی او سی کھڑے ہوں۔ بابا جی پھر دو قدم آگے آ گئے اور محبت سے دعا دی، ''جا پتر تینوں رب دیاں رکھاں۔'' ان دنوں اپنے لیے اس طرح کی محبتیں دیکھ کر اس ملک و قوم پر مر مٹنے کی ایسی تحریک ملتی تھی کہ شہادت سپاہی کا مقصدِ حیات بن جاتا تھا۔

۲۰۲۱ء میں ایک صدارتی آرڈیننس آنے کا سنا کہ اگر کوئی شخص فوج کی عزت نہیں کرے گا تو اسے لاکھوں روپے جرمانہ ہوگا اور دو سال سزا بھی الگ بھگتنا پڑے گی۔

میں ذاتی تجربوں کی روشنی میں بھی یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ ہماری پاکستانی قوم بدل گئی ہے یا پاکستانی فوج۔ چترال اسکاؤٹس کے کرنل مراد خان نیر اور ایس ایس جی کمانڈر بریگیڈیئر ٹی ایم کو آواز دینی چاہیے۔ شاید وہی دلوں میں جھانک کر بتا سکیں کہ گڑبڑ کہاں ہوئی ہے، کس کے قصور کی وجہ سے صدارتی آرڈیننس لانا پڑ گیا ہے۔

رول ماڈل

کسی بھی سی ایم ایچ میں ایڈمن آفیسر کا بہت کام ہوتا ہے اور اگر ہاسپٹل کلاس اے ہو تو ایک آفیسر یہ سارا کام سنبھال نہیں سکتا۔ اسے لازماً کسی جونیئر آفیسر کو اپنا اسسٹنٹ رکھنا پڑتا ہے۔ پچھلے پندرہ سال سے آرمی میڈیکل کور میں مرد میڈیکل آفیسرز کی بہت کمی ہے اور اس طرح لیڈی میڈیکل آفیسرز ہر جگہ اور ہر پوسٹ پر قابض ہو رہی ہیں۔ میں نے سی ایم ایچ ملیر میں ایڈمن آفیسر کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو اسی صورتِ حال کا سامنا تھا اور مجھے بھی ایک جونیئر کیپٹن فضیلہ یونس کو اپنے ساتھ آفس میں بٹھانا پڑ گیا۔ میری سروس تئیس سال اور اس کی صرف تین سال تھی۔

فوج میں کوئی جونیئر آپ کے آفس میں آئے تو باقاعدہ سر پر رجمینٹل ٹوپی پہنتا ہے۔ اندر آنے کی اجازت مانگتا ہے۔ سلیوٹ کرتا ہے اور آپ جب کہیں تب ہی کرسی پر بیٹھتا ہے۔ یہ سپاہیانہ زندگی کے اصول ہیں۔ میری اسسٹنٹ آفیسر نے دو چار دن تو ملٹری اصول اپنائے مگر دھیرے دھیرے سب بھول گئی اور پھر بغیر ٹوپی پہنے کندھے پر پرس لٹکائے آفس میں داخل ہوتی اور چپ چاپ بیٹھ کر کام کرنے لگ جاتی۔ میں نے عملاً ایک دفعہ اسے اشاروں کنایوں میں باور کرانے کی کوشش کی مگر نئے پاکستان کی طرح اب فوجی آفیسرز نے بھی نئے طور طریقے اپنا لیے ہیں۔

ایک صبح جب وہ اسی انداز میں آفس میں داخل ہوئی تو میں نے فوراً سینئر آفیسر والے موڈ

میں آ کر اسے جھڑکا اور آفس سے باہر نکال دیا اور کہا کہ اپنی کیپ پہنو۔ دروزے پر دستک دو۔ اندر آنے کی اجازت مانگو اور جب تک میں نہ کہوں، آفس میں بیٹھنا منع ہے۔ اس آفیسر کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں ایسا بھی کر سکتا ہوں مگر یہ سب ہوا اور تب ہی وہ آفس میں بیٹھ پائی۔ وہ سارا دن چپ چاپ پریشانی میں کام کرتی رہی۔ دوسری صبح وہ اپنے والد کے ساتھ میرے آفس آئی۔ میں اس کے والد کو جانتا تھا۔ پکا سچا فوجی آفیسر لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوا تھا۔

میں نے بہت عزت سے اسے خوش آمدید کہا مگر اس نے بغیر کسی تمہید کے بات شروع کی کہ میری بیٹی نے مجھ سے آپ کے رویے کی شکایت کی ہے اور پوری بات سننے کے بعد میں نے سوچا کہ مجھے آپ سے ضرور ملنا چاہیے تاکہ آئندہ میری بیٹی کو آپ سے شکایت نہ رہے۔ لیڈی آفیسر فخریہ طور پر بیٹھی یہ باتیں سن رہی تھی۔ کرنل یونس نے پینترا بدلا اور کہا کہ دراصل میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں کہ آپ میری بیٹی کی صحیح تربیت کر رہے ہیں۔ کل اس نے گھر آ کر آپ کی شکایت کی تو میں اندر ہی اندر بہت خوش ہوا کہ اگر جونیئر آفیسرز پر اب بھی اس طرح کے سینئر بیٹھے ہیں تو ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے بچوں کی تربیت ٹھیک ہو رہی ہے اور پاک آرمی پر معاشرے کی برائیوں کا اثر نہیں پڑ سکتا۔ وہ لیڈی آفیسر حیران پریشان کبھی مجھے اور کبھی اپنے والدِ محترم کو دیکھ رہی تھی کیوں کہ وہ سمجھی تھی کہ اس کے والد مجھ سے میرے گزشتہ رویہ پر ناراضگی کا اظہار کریں گے۔

دراصل آج کل فوج کے سینئر آفیسرز نے بھی اپنی الگ دنیا بنا لی ہے اور ان کی بلا سے کہ جونیئر آفیسرز کیا کرتے پھر رہے ہیں اور ان کی کیا تربیت ہو رہی ہے۔ اگر آپ کو کسی بھی فوجی آفیسر کے رویے اور ڈسپلن پر اعتراض ہے تو الزام براہِ راست سینئرز کو جاتا ہے۔ قصور وار وہ ہیں کہ آج عام آدمی ہر چوراہے پر فوج کے خلاف باتیں کرتا ہے۔ سینئرز کو چاہیے کہ وہ اپنے اپنے گریبان میں نیچے ناف تک جھانکیں اور مالی فوائد سے ہٹ کر کچھ تو اپنی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔

دوسرے دن اس لیڈی آفیسر نے میرے آفس میں آ کر اپنی کوتاہی پر شرمندگی کا اظہار کیا اور مستقبل میں ایک اچھی آفیسر بننے کا وعدہ کیا۔ میرے ساتھ وہ دو سال کام کرتی رہی۔ مجھے اس نے اپنے رویے اور ڈسپلن سے مجبور کر دیا کہ میں اس کو نام کے بجائے بیٹا کہہ کر مخاطب کیا

کروں۔ وہ اب ایک سی ایم ایچ میں لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر فائز ہے۔ اگر کسی نے فوج کی کسی مثالی تربیت یافتہ لیڈی آفیسر کو دیکھنا ہو تو اسے دیکھ لے۔ اللہ ایسی بیٹی سب کو دے جو فوج کی شان اور آن نظر آئے اور اس کے والدِ محترم جیسے پرانے آفیسرز کو تندرستی کے ساتھ لمبی عمر عطا کرے جو ہمارے لیے بھی رول ماڈل ہیں۔

کراچی کے گندے نالے

خاکی وردی کی عزت برقرار رکھنی جس طرح ہمیں کرنل مراد خان نیر نے چترال اسکاؤٹس کی پوسٹنگ کے دوران سکھائی تھی، وہ شاید اب یا تو ہم بھولتے جا رہے ہیں یا ہماری قدریں اور ضرورتیں بدل گئی ہیں۔ تب تو جو آفیسرز، جے سی اوز، این سی اوز یا سپاہی کے کام ہوتے وہ بالترتیب انھی سے اسی طرح لیے جاتے تھے۔ حد تو یہ تھی کہ جو کام ہمارے وردی والوں کے نہیں ہوتے تھے، کوئی وردی والا کرتا تو کرنل مراد خان نیر اس کو سزا سنا دیتے تھے کہ مستقبل میں وہ سلسلہ ہی بند کر دیا جائے۔

کراچی میں بارشوں نے تباہی مچائی تو سیوریج کے گندے نالے فوج سے صاف کروانے کی تکلیف دہ خبر پر بہت سے سینئر فوجی آفیسرز نے بھی سوشل میڈیا پر فخر سے لکھا کہ دیکھیے، سول انتظامیہ سے تو گندے نالے بھی صاف نہیں ہوتے۔ اب یہ بھی ہم کر کے دکھائیں گے۔ مجھے کرنل مراد بابا بہت یاد آئے۔

جنرل ضیاء الحق نے شندور پولو میچ دیکھنے کی ہامی بھر لی تو چترال اسکاؤٹس نے استقبال اور انتظامات کی تیاریاں شروع کر دیں۔ شندور ہٹ نیا تعمیر ہوا تھا مگر پھر بھی انجینئر کور کے ایک بہت سینئر افسر روز ہیلی کاپٹر میں گلگت کی طرف سے آ براجمان ہوتے اور ہمیں ہدایت جاری کرتے رہتے۔ حالاں کہ ہم ان کے انڈر کمانڈ بھی نہیں تھے۔ ہم اکثر اپنے کمانڈنٹ سے اس کا تذکرہ کرتے رہتے تھے اور وہ ہمیشہ کہتے کہ درگزر سے کام لیں اور کوئی آفیسر حکم عدولی کا تأثر نہ دے۔ یہ سب کو پتا تھا کہ یہ خالصتاً ایف سی کی یونٹ چترال اسکاؤٹس کے زیرِ انتظام میلہ لگ رہا

تھا اور فوج کی کسی بھی یونٹ کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

آخری دن جب ہم جنرل ضیاء الحق کا انتظار کر رہے تھے تو فوج کے وہی سینئر آفیسر بھی گلگت سے پہنچ گئے اور انھوں نے آتے ہی ہمارے کیپٹن رینک کے سگنل آفیسر سے کہا کہ جاؤ ذرا باتھ روم بھی چیک کر آؤ، کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ خلافِ معمول نہ جانے کیوں کرنل مراد خان نیر کی برداشت اب ختم ہو چکی تھی۔ انھوں نے اس سینئر آفیسر سے تو کچھ نہ کہا مگر اپنے ہی کیپٹن پر چیخ اٹھے کہ فوجی آفیسرز کب سے باتھ روم اور ٹوائلٹ کی صفائی دیکھنے لگے ہیں۔ تم جاؤ ٹیلی فون ایکسچینج سنبھالو اور اپنی کمیونیکیشن کی ڈیوٹی نبھاؤ۔ باتھ روم کی صفائی کا کام سوئیپر بخوبی دیکھ لیتے ہیں۔ ان کی اس بات کا فائدہ یہ ہوا کہ اس سینئر آفیسر نے دوبارہ چترال اسکاؤٹس کے کاموں میں پورا دن کوئی مداخلت نہ کی۔

اخبارات، ٹی وی اور سوشل میڈیا پر گندے نالوں کی صفائی کی فخریہ پیش کش اور ستائش بھرے پیغامات پر میں بہت دنوں سے یہ امید لگائے بیٹھا ہوں کہ کہیں سے کرنل مراد خان نیر جیسے کسی مردِ مجاہد کی غصے بھری آواز آئے گی کہ گندے نالوں کی صفائی کی ڈیوٹی جس محکمہ کی ہے وہی کرے۔ فوجیوں کے لیے ملکی دفاع اور دشمن کو ناکوں چنے چبوانے سے زیادہ فخریہ کوئی اور بات ہو ہی نہیں سکتی اور نہ ہونی چاہیے مگر ہر طرف خاموشی ہے بلکہ گندے نالوں کی صفائی کو فوج کے بڑے کارنامے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

میری بے ایمانیاں

بیراگیری سے ڈاکٹری تک کا سفر

کمانڈنٹ چترال اسکاؤٹس کرنل مراد خان نیر وہ آرمی آفیسر تھا جس کی ایمان داری، حب الوطنی، سپاہیانہ آن بان کی گواہی دوسری یونٹوں والے بھی دیتے تھے۔ ابتدائی فوجی تربیت کے بعد میری پہلی پوسٹنگ چترال اسکاؤٹس میں ہوئی تھی۔ میرا ان کے ساتھ پہلا ماہ ہی تھا کہ ایک دن مجھے آفس میں بلا کر کہنے لگے، ''بشیر دو بے ایمانیاں کرنی ہیں اور تمھاری مدد چاہیے۔'' میں پریشان تھا کہ کیا جواب دوں کیوں کہ سنا تھا، یہ شخص تو بے ایمانی کسی صورت برداشت ہی نہیں کرتا۔

کہنے لگے، ''پہلی یہ کہ ارندو میں ہمارا جو نائب صوبے دار شہید ہوا ہے، اس کا بیٹا پندرہ سال کا ہے۔ اَن پڑھ ہے، تم اس کی عمر اٹھارہ سال لکھ کر میڈیکل فٹنس دے دو۔ ہم اسے سپاہی باورچی بھرتی کر لیتے ہیں بعد میں دیکھا جائے گا فی الحال شہید کا خاندان پلتا رہے گا۔''

''دوسری یہ کہ ایک یتیم بچہ ہے جو چترال سے سائنس کے مضامین کے ساتھ بارہویں کلاس میں پورے ضلع میں اوّل آیا ہے۔ والد کے فوت ہونے کے بعد اپنا گھر چلانے کو ایک ہوٹل میں نوکری کرتا ہے۔ میڈیکل کالج میں نام آ گیا ہے مگر جا نہیں سکتا۔ خرچ کے پیسے نہیں ہیں نہ اپنے لیے نہ گھر کے لیے۔ اسے اپنے ہاسپٹل کے لیے نرسنگ سپاہی بھرتی کر لیتے ہیں مگر ڈیوٹی تمھارے پاس نہیں کرے گا۔ ہیڈکوارٹر بالا حصار میں اپنی ریر پارٹی میں بھیج دیں گے۔ میڈیکل کالج جاتا رہے گا۔ کھانا اور رہائش یونٹ میں مفت ہو جائے گی اور اس کی تنخواہ میں اس کے اپنے اور گھر والوں کے خرچ چلتے رہیں گے۔ ایم بی بی ایس ہونے تک زندہ رہے تو اس کا

کوئی ڈسپلین کیس بنا کر نوکری سے فارغ کر دیں گے۔'' میں نے ان دونوں بے ایمانیوں پر یس سر کہہ دیا۔ دوسرے دن دونوں کے میڈیکل فٹنس سرٹیفکیٹ میں نے دے دیے۔ آگے کیا ہوا میں نے کبھی نہ پوچھا، نہ اس کی ضرورت پڑی۔

پھر دو سال بعد میری پوسٹنگ ہوگئی اور میں پنوں عاقل آ گیا۔ تین سال بعد میری چترال اسکاؤٹس میں دوبارہ پوسٹنگ ہوگئی جو ایک الگ کہانی ہے۔ بہت سی پرانی باتیں یاد ہی نہ تھیں۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی کرنل مراد خان نیر نے خودکشی کر لی تھی۔ میں انھی کے کہنے پر دوبارہ پوسٹنگ آیا تھا مگر یہاں ۱۹۸۹ء میں دنیا ہی بدل چکی تھی۔ ایک دن افغان ریفیوجی کیمپ کا ایک ڈاکٹر ہاسپٹل میں مجھ سے ملنے آیا تو ہاتھ ملا کر میرے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ میں حیران تھا کہ یہ اتنی محبت سے پیش آ رہا ہے اور میں اسے جانتا بھی نہیں۔ وہ رو رہا تھا اور بمشکل اپنی بھرائی ہوئی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہنے لگا، ''سر میں آپ کا نرسنگ سپاہی قطب ولی ہوں جس کو کرنل مراد نے آپ کی مدد سے ڈاکٹر بنا دیا اور اب ڈبلیو ایچ او کے ساتھ کبھی افغانستان اور کبھی یہاں کام کرتا ہوں۔ آپ کے آنے سے چھ ماہ پہلے جب میرا ایم بی بی ایس مکمل ہوا تو کرنل مراد صاحب نے مجھے نافرمانی کے الزام میں نوکری سے فارغ کر دیا۔''

میں نہ جانے کیسے اپنے جذبات پر قابو پا رہا تھا مگر وہ تو روتا ہی رہا۔ ذرا سنبھلا تو کہنے لگا، ''سر پھر کرنل مراد نے کسی کو فون کر کے مجھے ڈبلیو ایچ او میں نوکری دلوائی اور مجاہدین کے ایک کیمپ میں افغانستان کے اندر پوسٹ کروا دیا۔ سر میں جب بھی دو ماہ بعد دروش آتا ہوں، ان کی قبر پر جا کر ان سے ضرور سوال کرتا ہوں کہ آپ تو دوسروں کو زندہ رہنے کے راستے دکھاتے تھے، خود کو کیوں مار لیا؟''

ڈاکٹر قطب ولی میرے پاس آدھ گھنٹا مزید بیٹھا رہا، مگر ہم میں اس کے بعد کوئی بات نہ ہوئی۔ ہم چپ چاپ بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ کہنے کو اب کچھ نہ تھا۔ دل چاہتا تھا کہ کہیں سے کرنل مراد خان نیر آ جائیں تو میں بھی ان کے ہاتھ چوم کر عقیدت کا اظہار کر پاؤں۔ ڈاکٹر قطب ولی جب اپنے آنسوؤں پر قابو نہ پا سکا تو یک دم اٹھا اور بغیر خدا حافظ کہے میرے آفس سے نکل گیا۔ میں نے اس دن کرنل مراد خان نیر کی ان دو بے ایمانیوں پر بہت غور و خوض کیا اور پھر اسی طرز کی بے ایمانیاں کرنا شروع کر دیں اور اب تک کر رہا ہوں۔

بوسنیا میں ختنہ پروجیکٹ

بوسنیا بہت خوب صورت ملک ہے اور اس کے لوگ اس سے بھی زیادہ خوب صورت مگر جب ہم یو این پروٹیکشن فورس کے جھنڈے تلے تزلا کینٹ پہنچے تو ایسا لگ رہا تھا کہ اس حسین قوم و ملک کو نوچ نوچ کر بدشکل بنانے میں ساری دنیا شامل ہوگئی ہے اور مالِ غنیمت کی لوٹ مار جاری ہے۔

میں نے وسچا کیمپ پہنچ کر پاک بٹالین ۲ فیلڈ ہاسپٹل کی کمانڈ سنبھالی۔ پہلے ہی دن ہاسپٹل گیا تو وارڈ کے کاریڈور میں ایک انتہائی پروقار اور خوش شکل ادھیڑ عمر خاتون کو فرش پر پوچا لگاتے دیکھا۔ میں اس سے پوچھے بغیر رہ نہ سکا کہ آپ جنگ سے پہلے کیا کرتی تھیں۔ کہنے لگیں، میں تزلہ یونی ورسٹی میں ہسٹری کی پروفیسر ہوں۔ مجھے سن کر جنگ کے ان نتائج پر بہت افسوس ہوا۔ میں کیا کرتا اب۔ بس اسے فرش پر پوچا لگانے سے ہٹا کر ہاسپٹل میں آنے والے مہمانوں کو چائے پلانے کی ذمہ داری سونپ دی تاکہ کم از کم کچھ تو عزت کا کام ہو۔ اس پروفیسر سمیت ہاسپٹل میں نرسوں کی تنخواہ صرف تین سو ڈالر ماہانہ تھی۔ بوسنین مسلمان خاندانوں کے مرد یا تو مارے گئے تھے یا بغیر تنخواہ کے اپنی قوم کو بچانے کی جنگ لڑ رہے تھے۔ پیچھے گھروں میں عورتیں اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے سے قاصر تھیں اور یہاں آنے والی این جی اوز یا دوسری فلاحی تنظیموں میں نوکریوں کی تلاش میں رہتی تھیں۔

جگہ جگہ ریلیف کے لیے اَن گنت تنظیمیں موجود تھیں مگر سب سے بہتر کام غیر مسلم یا چرچ کے لوگ کر رہے تھے۔ سعودی تنظیم انٹرنیشنل اسلامی ریلیف کے سب لوگ بڑی بڑی گاڑیوں میں بس گھومتے رہتے تھے۔ ہر عربی مرد ریلیف کا جو پہلا کام کرتا، وہ کسی کم عمر خوب صورت لڑکی سے شادی ہوتی۔

۱۹۹۴ء میں جب پاکستان آرمی بوسنیا پہنچی تو چند ہی دنوں میں پاک آرمی کے ڈاکٹرز اور انجینئرز کی دھوم مچ گئی۔ میری ٹیم نے لوگوں کے علاج معالجے میں دن رات ایک کر دیا اور میجر سعید قادر کی ٹیم کی وجہ سے لوگوں کو چھت ملنے لگی۔ ۱۸ پنجاب رجمنٹ نے اپنے لنگر پر جوانوں

کے لیے پکا پکایا کھانا بے گھر لوگوں کو پہنچانا شروع کر دیا۔

یہ دیکھ کر اسلامی ریلیف والے عربیوں کو بھی آخر خیال آ گیا کہ شادیوں کے علاوہ بھی کچھ ریلیف کے کام ہو سکتے ہیں۔ پاکستان فیلڈ ہاسپٹل تب تک بہت مشہور ہو چکا تھا۔ کچھ عربی میرے پاس آئے اور بتایا کہ انھوں نے سروے کیا ہے کہ یہاں پچھلے دس سال سے لڑکوں کے ختنے نہیں ہوئے اور یہ مسلمانوں کے لیے بہت ضروری ہے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ ہاں واقعی خود کو مسلمان ثابت کرنے کے لیے ہمارا کل سرمایہ اب یہی ایک ختنہ رہ گیا ہے۔ کہنے لگے، ہم ان لوگوں کو آپ کے ہاسپٹل لائیں گے تا کہ آپ ان کا ختنہ کر دیں میں نے صاف انکار کر دیا کہ ہم پر لوگوں کے علاج معالجے کا پہلے ہی بہت بوجھ ہے۔ ہم آپ کا ختنہ والا پروجیکٹ نہیں چلا سکتے۔ وہ تو فوراً منتوں پر اتر آئے کہ یہ کام بہت ضروری ہے۔

ان کی باتیں سن کر میری بے ایمانی کرنے والی رگ پھڑکی۔ میں نے کہا، اگر آپ اس کام کے لیے کوئی فنڈ مہیا کریں تو میں نرسوں سے اوور ٹائم کروا کر یہ ختنہ پروگرام کامیابی سے چلا دوں گا۔ ہر نرس کے تین سو ڈالر ماہانہ طے ہو گئے۔ ان پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ یہ مہینے بعد مکر جائیں، اس لیے میں نے باہر جا کر اپنی انٹرپریٹر کو ساری بات سمجھائی اور کہا کہ اوور ٹائم کرنے کا کہوں تو آپ یہ تین سو ڈالر ماہانہ ایڈوانس دینے کا مطالبہ کر دینا۔

لڑکیوں کے لیے سب طے پا گیا تو شیخ نے مجھے بچوں کی ایک طویل لسٹ تھما دی۔ میجر سرفراز جنجوعہ جو ماشاء اللہ اب بریگیڈیئر ہیں، نے لسٹ دیکھ کر کہا سر یہ لسٹ ہم دو ماہ میں ختم کر دیں گے۔ میں نے اسے اپنی بے ایمانی سمجھا دی کہ یہ لسٹ کم از کم ایک سال چلنی چاہیے تا کہ ان بچیوں کے گھروں کے خرچے بخوبی چلتے رہیں۔

پھر نیٹو فورسز کے آنے تک پورا سال عربی بھائی ختنہ پروگرام کے توسط سے بوسنیا کے بچوں کو ختنائی مسلمان کر کے جنت کماتے رہے اور میں اپنی بے ایمانی کے سہارے ہاسپٹل کی نرسز کے چہروں پر خوشیاں دیکھتا رہا کیوں کہ ان سب کے گھر کی ضروریات پوری ہو رہی تھیں۔ میجر سرفراز جنجوعہ اکثر کہتا، سر اگر یو این کو پتا چل گیا تو کیا ہو گا۔ میں آرام سے کہہ دیتا کہ بھائی پھر ہم اپنی بے ایمانیوں کی سزا بھگتیں گے۔

حکم عدولی کی سزا

۱۹۹۸ء میں چھور سے میری پوسٹنگ سی او ڈی کراچی ہوگئی۔ رجمنٹل میڈیکل آفیسر کا چارج سنبھالا تو ایک چھوٹا سا او پی ڈی نما ایم آئی روم ملا جو اصولی طور پر فوجیوں کی دیکھ بھال کے لیے تھا جب کہ سی او ڈی میں آٹھ سو سے زیادہ سویلین ملازمین تھے جن میں دو سو سے زیادہ تو روزانہ دیہاڑی والے مزدور تھے۔ بیمار ہو جاتے تو ان کو لاوارث قرار دے دیا جاتا کہ جہاں دل چاہے علاج کرواؤ، تم ہماری ذمہ داری نہیں ہو۔ ان دنوں میری بیگم کی پوسٹنگ سول ہاسپٹل کراچی میں تھی۔ اسے یہ سب بتایا تو کہنے لگی اس طرح کے لوگ آپ میرے پاس بھیج دیا کریں۔ اس طرح ہم نے اپنے ہی ذرائع سے بیمار ہونے والوں کی دیکھ بھال شروع کر دی۔

سی او ڈی میں کمانڈنٹ کرنل سلیم، ڈپٹی کمانڈنٹ کرنل افضل رانا اور اسسٹنٹ کمانڈنٹ میجر تنویر کا طوطی بولتا تھا۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کی مرضی کے بغیر زور سے سانس لے کر ذرا زیادہ آکسیجن پھیپھڑوں میں اتار لے۔ مجھے چوں کہ تھر کے لوگوں کی خدمت کر کے یہ بری لت پڑ چکی تھی تو یہاں کیسے باز آ سکتا تھا۔ میں نے ہر میٹنگ میں کہنا شروع کیا کہ سویلین ملازمین کو بھی طبی سہولیات ملنی چاہییں۔ مجھے معلوم تھا کہ قانونی طور پر کمانڈ فنڈ سے یا کسی سینئر فارمیشن سے یہ سہولت دی جا سکتی ہے۔

میری انھی باتوں سے سی او ڈی میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ مجھے ڈاکٹر سے افسر بننے کی تلقین ہونے لگی۔ اپنی ذمہ داری کے دائرے میں رہنے کے پیغام ملنے لگے۔ جب میں باز نہ آیا تو مجھے ڈپٹی کمانڈنٹ نے اپنے آفس میں بلا کر خوب انتظار کروانے کے بعد کمانڈنٹ کی طرف سے حکم سنایا کہ آپ کل سے روزانہ صبح سات بجے والی مارننگ پریڈ میں آیا کریں گے۔ میں نے احتجاجاً کہا کہ میرا صبح کی پریڈ میں کیا کام۔ اشارتاً جواب دیا کہ بادشاہت میں مداخلت کی سزا تو ہوتی ہے۔

میں نے انکار کرنے سے پہلے خوب سوچا تو مجھے ملازمین کے لیے روشنی کی ایک کرن دکھائی دی۔ میں ایک بے ایمانی ترتیب دے کر دوسری صبح پونے سات بجے مارننگ پریڈ میں پہنچ

گیا۔ اس وقت میں اسسٹنٹ کمانڈنٹ سے بھی سینئر میجر تھا اور پریڈ کی کمانڈ ایک لیفٹیننٹ کر رہا تھا۔ ہم دونوں کے علاوہ وہاں دوسرا کوئی افسر موجود نہیں تھا اور نہ کوئی آتا تھا۔ سول ملازمین حیران ہو رہے تھے کہ ہمارا ڈاکٹر صبح کی پریڈ میں کیوں آیا ہے۔

پریڈ ختم ہوئی تو ڈپٹی کمانڈنٹ کی جیپ آ کر رکی۔ وہ فاتحانہ انداز میں اترے اور مجھے بن کہے بھی کہہ گئے کہ بات نہ ماننے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ میں نے بڑھ کر ان کو سیلیوٹ کیا اور پریڈ کو ایڈریس کرنے کی اجازت مانگی۔ بے پروائی کی حد تھی کہ مجھ سے مقصد پوچھے بغیر ہی کہا، ''ڈاکٹر گو اہیڈ۔''

ڈائس اور مائیک میرے قبضے میں آ گیا اور میں نے بات ہی یہاں سے شروع کی کہ مہنگائی کے اس دور میں سب سے مشکل کام بیماری میں علاج معالجہ کروانا ہے۔ سب ہی میری طرف متوجہ ہو گئے کیوں کہ یہی تو ان کے دل کی آواز تھی۔ ڈپٹی نے میری طرف ناگواری سے دیکھا مگر تیر ان کی کمان سے نکل چکا تھا۔

میں نے اعلان کیا کہ کمانڈنٹ اور ڈپٹی کمانڈنٹ نے آپ کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے آپ کے مفت علاج کے لیے مجھے ہدایات جاری کر دی ہیں اور اس کا اعلان کرنے کے لیے مجھے آج پریڈ میں بلایا گیا ہے۔ لوگوں کا جوش اور خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کرنل افضل رانا میرا منہ دیکھتے رہ گئے۔ سویلین ملازمین سب مزدور لوگ تھے۔ پریڈ گراؤنڈ کرنل سلیم زندہ باد، کرنل رانا زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگا۔

آٹھ بجنے والے تھے۔ کمانڈنٹ کی جیپ آ کر رکی تو وہ پریڈ گراؤنڈ میں نعرے سن کر ہماری طرف آ گئے۔ لوگوں نے پھر کمانڈنٹ زندہ باد کے نعرے لگائے۔ میں نے مائیک کمانڈنٹ کے ہاتھ میں دے دیا اور مدعا بھی بتا دیا۔ انھوں نے کمال کی حکمت پائی تھی۔ تنگ آمد بجنگ آمد۔ کمانڈنٹ نے میری یہ بے ایمانی نیکی بنا کر اپنے پلڑے میں ڈال لی اور کمانڈ فنڈ سے میڈیسن کے لیے ماہانہ فنڈز دینے کا خود اعلان کر دیا۔ اب کرنل افضل رانا نے بھی لوگوں کا شکریہ قبول کرنا شروع کر دیا اور حاتم طائی کی چال چلتے آفس بلاک کی طرف نکل گئے۔ کرنل سلیم میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے تو میں نے بھی دل مضبوط کر کے کہہ ہی دیا

کہ ’’سر آپ کی کمانڈ میں یہ نیکی سنہری حروف میں لکھی جائے گی۔‘‘
مجھے دوسرے دن فنڈز مل گئے اور میں نے سویلین ملازمین کا علاج بھی شروع کر دیا۔ اب فوجی اپنا حق سمجھ کر مجھ سے دوائی لیتے اور ڈیوٹی سمجھ کر سلیوٹ کرتے۔ سویلین ایک بہت بڑی سہولت سمجھ کر دوائی لیتے اور محبت سے شکریہ ادا کرتے۔

میں مارچ ۲۰۰۰ء میں لیفٹیننٹ کرنل بن کر سی ایم ایچ ملیر جا رہا تھا تو میرے الوداعی لنچ پر کہے گئے کرنل افضل رانا کے وہ تاریخی کلمات آج بھی نہیں بھولتے کہ ڈاکٹر ’’اس دن توں ساڈے نال چنگا نئیں کیتا۔‘‘

مگر سب سے زیادہ یاد رکھنے والی بات دوسری ہے۔ سی او ڈی سے سویلین لوگ سی ایم ایچ آ کر میرے اسٹاف سے کہتے تھے کہ کوئی بھی کام نہیں ہے، بس ہم اپنے ڈاکٹر کو سلام کرنے آئے ہیں۔

اچھی کمانڈ

آرمی میں کس کی خواہش نہیں ہوتی کہ اسے کمانڈ ملے اور وہ ایک دن کمانڈنگ آفیسر کہلوائے۔ آرمی فیملیز میں تو یہ خواہش ایک قدم اور آگے ہوتی ہے۔ اگر والدِ محترم نے کوئی یونٹ کمانڈ کی ہو تو بیٹے کا یہ خواب ہوتا ہے کہ وہی یونٹ وہ بھی کمانڈ کر سکے اور یہ قسمت والوں کو نصیب ہوتا ہے۔ کمانڈ دو دھاری تلوار بھی ہوتی ہے۔ یہی وقت کسی آفیسر کی تمام تر صلاحیتوں کا امتحان ہوتا ہے اور بے تحاشا اختیارات کے ساتھ ساتھ پوری ذمہ داری کا پہاڑ بھی اسے سر پر اٹھا کے پھرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ کو دلوں پر کمانڈ کا فن آتا ہو تو یہ ذمہ داری کا پہاڑ پھولوں کی ٹوکری ثابت ہوتا ہے۔

۱۷/اکتوبر ۲۰۰۱ء کا دن میرے لیے بھی یادگار رہے۔ اوکاڑہ پہنچ کر پہلی دفعہ فیلڈ میڈیکل یونٹ کی کمانڈ سنبھالی۔ بیوی بچوں کو کراچی ہی چھوڑ آیا تھا۔ ان دنوں انڈیا کے ساتھ جنگی آنکھ مچولی شروع ہو چکی تھی۔ سب یونٹس چھاؤنی سے باہر ڈیرے ڈال کر اپنے اپنے ایریا میں جانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

کمانڈ سنبھالنے کے بعد حسبِ معمول آفیسرز کے ساتھ تعارفی گفت وشنید شروع ہوئی۔ سیکنڈ اِن کمانڈ میجر عارف محمود عرف فیرا کہنے لگا کہ وہ فوجی نوکری سے تنگ ہے اور دوبار استعفیٰ دے چکا ہے۔اب کوئی کام نہیں کرسکتا۔ میں نے اسے اجازت دے دی کہ جاؤ مزے کرو آج کے بعد تمھیں کوئی کام نہیں ملے گا۔

کیپٹن کاشف نے کہا کہ سر میں فوج میں نہیں رہنا چاہتا اور میں بھی کام نہیں کروں گا۔ دو سالانہ رپورٹس خراب لے چکا ہوں۔تیسری خراب رپورٹ آپ سے لے کر فوج سے نکل جاؤں گا۔ میں نے اسے کہا کہ اگر دن رات محنت سے کام کرو گے تو خراب رپورٹ دے دوں گا اور اگر محنت سے کام نہیں کرو گے تو یونٹ میں بہترین سالانہ رپورٹ تمھاری ہوگی۔ جاؤ فیصلہ کرلو کیسی رپورٹ لینی ہے۔وہ حیرت زدہ تھا کہ میں نے اسے کس مصیبت میں ڈال دیا ہے کہ اب گنگا الٹی بہے گی۔

یونٹ میں زیادہ تر افسر اور جوان بہترین رویوں کے حامل تھے مگر کسی کی مجھ سے پہلے سے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ کسی کو پتا ہی نہیں تھا کہ میں کیسا سی او ثابت ہوں گا۔ یونٹ نے بارڈر ایریا کے قریب فیلڈ ہاسپٹل بنانا تھا تاکہ جنگ کی صورت میں زخمیوں اور شہیدوں کو سنبھال سکیں۔ میں نے اپنے ڈویژنل ہیڈکوارٹر کی پلاننگ دیکھ کر فورٹ عباس اور چشتیاں کے درمیان ڈاہرانوالا رورل ہیلتھ سینٹر کو منتخب کرلیا اور یونٹ لے جا کر وہاں ڈیرے ڈال دیے۔سول لوگوں میں جذبۂ حب الوطنی اور جوش وخروش دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا اور وہ پاک فوج کے شانہ بشانہ دشمن کے خلاف لڑنے مرنے کو تیار تھے۔ہم کہیں سے کوئی فروٹ یا سبزی خریدتے تو وہ اس کی قیمت لینے سے انکار کر دیتے۔ہم نے سول ڈاکٹرز سے مشورے کے بعد ایک ہفتے میں رورل سینٹر کو نئی شکل دے دی۔لگتا ہی نہ تھا کہ یہ کسی دیہاتی علاقے کا پرانا ہسپتال ہے۔ہم نے اپنے جوانوں کے ساتھ ساتھ سول آبادی کو بھی مزید بہتر طبی سہولتیں پہنچانا شروع کر دیں۔

پیچھے چھاؤنی میں سب کے خاندان اکیلے رہ گئے تھے۔ میں نے ایک نائب صوبے دار کی سربراہی میں چار لوگوں کی ٹیم بنا کر ان کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ ہر فیملی سے صبح شام گھر جا کر خیریت پوچھیں گے اور ان کی ضروریات گھر بیٹھے مہیا کریں گے۔ یہ خبریں آفیسرز اور جوانوں کو ملنے لگیں تو ان کے چہروں پر گھر کی فکر کا تأثر ذرا کم ہونے لگا۔

آج کے زمانے میں مہلک ہتھیاروں کی جنگ بہت خوف ناک چیز ہے اور اس کی تباہ کاریاں دیکھنی ہوں تو افغانستان، عراق، شام اور صومالیا جیسے ملکوں کا سفر کریں۔ انسانوں کا کیا ذکر کریں، جانوروں کے پورے کے پورے ریوڑ معذور گھومتے نظر آتے ہیں۔ آسمان کو چھوتی تباہ حال عمارتوں کو دیکھ کر جینے کی خواہش دم توڑ دیتی ہے۔ یہ خاکہ ہر وردی والے کے ذہن میں ہر وقت ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں کمانڈر کا کردار بہت اہم ہوتا ہے جو آفیسرز اور جوانوں کے دل سے جنگ کا خوف دور کرکے انھیں ملک وقوم کے دفاع کے فرض سے محبت بڑھاتا رہتا ہے۔

ڈاہرانوالا میں صبح میں سب سے پہلے اٹھتا۔ شیشم کے درختوں کے نیچے میز لگوا کر ناشتا اپنے نوجوان کپتانوں کے ساتھ کرتا اور پھر وہ اپنی ڈیوٹی پر چلے جاتے۔ میں نے اپنے آفیسرز کے بارے میں معلومات لینی شروع کیں تو پتا چلا کہ کیپٹن کاشف کا گاؤں اسی علاقے میں صرف چھ کلو میٹر دور ہے مگر اس کے والدین اس سے کسی وجہ سے ناراض ہیں اور وہ اسی لیے اپنے گاؤں نہیں جاتا اور نہ ان سے ملتا ہے۔ میجر عارف کے والد صاحب فوج کے ریٹائرڈ کیپٹن ہیں اور ٹانگوں کی کسی تکلیف کی وجہ سے چل پھر نہیں سکتے۔ گھر میں ماں کے سوا اور کوئی نہیں اور یہی وجہ میجر عارف کو پریشان رکھتی ہے۔ دونوں آفیسرز کو پتا نہ لگا کہ ان کی پریشانیوں سے میں واقف ہو چکا ہوں۔

ان دنوں وہاں بہت سے لوگوں نے ہمیں فری میڈیسن دینی شروع کر دی تھیں کیوں کہ ہم نے مقامی لوگوں کی دیکھ بھال جو شروع کر دی تھی اور فوج کی طرف سے فری میڈیکل کیمپ لگ رہے تھے۔ میں نے کیپٹن کاشف کے گاؤں میں فری میڈیکل کیمپ لگا کر اس کی ڈیوٹی وہیں لگا دی۔ یہ آفیسر اپنے ہی گاؤں کے لوگوں کا علاج کر رہا تھا اور پورے گاؤں والے اس کے والدین کا شکریہ ادا کر رہے تھے اور کاشف کی تعریفیں بھی کرتے کہ ان کا بیٹا اس قابل ہوا ہے کہ آ کے اپنے گاؤں کی خدمت کر رہا ہے۔ میں کیمپ کے دورے پر گیا تو کاشف سے کہا کہ اپنے والدین سے ملواؤ۔ وہ چپ چاپ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ وہ اپنے والدین سے سالوں بعد مل رہا تھا۔ اس کی ماں اسے گلے لگا کر چوم رہی تھی۔ اس کے والد کو اپنی ناراضگی کا تأثر دینے کا موقع ہی نہ ملا اور کیپٹن کاشف حیرت زدہ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں سے مل رہا تھا۔ میں نے اس کے والد کو یونٹ میں آنے کی دعوت دی اور کاشف کو گھر میں ہی چھوڑ کر واپس آ گیا۔ کیپٹن

کاشف کو آج تک نہیں پتا کہ اس کا والدین سے اس دن ملنا حادثاتی نہیں تھا بلکہ سب کچھ میرے پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔

یونٹ میں تبدیلی یہ آئی کہ تین دن بعد جب کیپٹن کاشف یونٹ میں واپس آیا تو دوسری صبح شیشم کے درخت کے نیچے لگے ناشتے پر میرے انتظار میں کھڑا تھا۔

عیدالضحیٰ آ رہی تھی۔ ہم مکمل جنگی تیاریوں میں تھے۔ کسی ایک لمحے کی غلط خبر سے توپوں کے دھانے کھل سکتے تھے۔ پوری فوج میں چھٹیاں بند تھیں۔ آفیسرز پانچ گھنٹے کی مسافت پر اوکاڑہ چھاؤنی میں بھی اپنی فیملی کے ساتھ عید نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے قربانی کے جانور خریدے۔ میجر عارف نے سخت پریشانی میں اپنے والدین کی قربانی کے جانور بھی خریدے کیوں کہ راول پنڈی میں وہ معذوری کی وجہ سے خود قربانی نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی پریشانی دیکھ کر میرے دل میں ایک بے ایمانی نے سر اٹھایا۔ جنگی علاقے کے سارے اصول بالائے طاق رکھ کر میں نے ہاسپٹل سے دو کلومیٹر دور چشتیاں روڈ کے ساتھ نہر کنارے محکمہ آب پاشی کا ریسٹ ہاؤس بک کروایا۔ عید سے دو دن پہلے مسز میجر عارف کو اعتماد میں لے کر والدین کو راول پنڈی سے پہلے اوکاڑہ اور پھر پوری فیملی کو عید کے دن سے پہلے شام مغرب تک پانچ گھنٹوں میں ڈاہرانوالا ریسٹ ہاؤس میں شفٹ کروا لیا۔ اس بات کی سینئر صوبے دار کے علاوہ یونٹ میں کسی کو خبر نہ تھی۔ مہمانوں کا کھانا بنا تو میں نے میجر عارف سے کہا کہ کسی کو کھانا دینے ریسٹ ہاؤس جانا ہے تم بھی میرے ساتھ چلو۔ اس کا حسبِ عادت موڈ خراب تھا مگر مجبوراً جیپ چلانے لگا۔

جیپ ریسٹ ہاؤس پر جا رکی۔ میں نے بیٹ مین سے کہا کہ کھانا اندر ریسٹ ہاؤس میں مہمانوں کو دے آؤ۔ میجر عارف سے کہا کہ جا کر مہمانوں سے پوچھ لو کسی چیز کی اور ضرورت تو نہیں۔ وہ مرتا کیا نہ کرتا، ریسٹ ہاؤس کے اندر گیا تو میں ڈرائیور کے ساتھ ہاسپٹل آ گیا اور ڈنر کے بعد سو گیا۔

دروازے پر دستک سے میری آنکھ کھل گئی۔ رات کے دو بجے تھے، دروازہ کھولا۔ باہر میجر عارف تازہ شیو کے ساتھ، استری شدہ وردی اور ڈی ایم ایس بوٹ میں پتلون ٹک اِن کے ساتھ سیلیوٹ کرنے کی پوزیشن میں کھڑا تھا۔ میں نے اندر بلایا تو وہ اسی سیلیوٹ کی حالت میں کھڑا رہا۔ میں نے بڑھ کر گلے لگا لیا۔ بہت دیر تک آبدیدہ سا گلے لگا رہا۔ کمرے میں بھی چپ

چاپ بیٹھا رہا۔کافی دیر کے بعد اٹھ کر پھر سیلیوٹ کیا اور صرف دو لفظ سر سوری۔ سر تھینک یو کہہ کر باہر نکل گیا۔

صبح ہاسپٹل کی مسجد میں عید کی نماز کا بندوبست تھا۔ میں اس وقت حیران ہوا جب پہلی صف میں میرے افسروں کے ساتھ کیپٹن کاشف اور میجر عارف کے والدِ محترم بھی موجود تھے۔ یونٹ کا سیکنڈ اِن کمانڈ میجر عارف محمود عرف پھیرا کمال ایکشن میں تھا،قربانی ہوئی۔خوب دھوم دھام سے عید کے بڑے کھانے کا اہتمام کیا گیا۔میجر عارف اور کیپٹن کاشف دوسرے افسروں کے ساتھ یونٹ میں بھاگے پھر رہے تھے اور ان کے والد صاحبان مجھ سے گپیں لگا رہے تھے۔ جانے سے پہلے میجر عارف کے والد کیپٹن محمود مجھے سمجھانے لگے کہ کرنل صاحب آپ جنگی علاقے میں ہیں، آپ نے ہمیں بلا کر اچھا نہیں کیا۔ یہ قانونی طور پر غلط کام ہے۔اگر آپ کی جگہ میں سی او ہوتا تو یہ کبھی نہ کرتا۔ میں ہنس رہا تھا اور میجر عارف حیرت سے اپنے والد کو دیکھ رہا تھا۔ایک دن میجر جنرل ہارون سکندر پاشا ہاسپٹل کے دورے پر آئے تو میں نے سیلیوٹ کر کے کہا سر میری غلطی معاف کرنے کا شکریہ۔

اس دن کے بعد مجھے نہیں معلوم یونٹ کیسے چلتی رہی۔ میں نے میجر عارف کے ہوتے ہوئے کمانڈ کے خوب مزے لوٹے۔فوج سے تنگ آئے افسروں نے مجھ سے بہترین سالانہ رپورٹس لیں۔ یونٹ کے پانچ افسر ڈیپوٹیشن پر سعودی عرب چلے گئے۔کیپٹن کاشف سے بعد میں رابطہ نہ رہا۔ میجر عارف فوج چھوڑنے کا ارادہ بدل کر سعودی عرب سے واپسی پر بریگیڈیئر بن کر ریٹائر ہوئے۔میجر نوید بریگیڈیئر کے عہدے پر اور کیپٹن شکیل، کیپٹن رؤف، کیپٹن آصف اب کرنل کے عہدوں پر فائز ہیں اور جب بھی فون کر کے میری خیریت معلوم کرتے ہیں تو مجھے اپنی پہلی کمانڈ کے اچھے دن یاد آ جاتے ہیں۔

بیٹی پر نوکری قربان

مجھے میری بیٹی کے علاوہ بھی کئی بچیاں بابا کہہ کر مخاطب کرتی ہیں اور انھی میں آرمی کی ایک ریٹائرڈ کیپٹن بھی ہے جو اب برطانیہ کے کسی شہر میں خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔ میں اس

سے ۲۰۰۸ء کے بعد نہیں ملا مگر میرے فیس بک پیج پر کبھی کبھار بابا لکھ کر مخاطب کرتی ہے تو مجھے سی ایم ایچ ملیر کی میری بہت سی بے ایمانیوں میں سے ایک کورٹ مارشل ہونے کے برابر کی اپنی بے ایمانی بھی یاد آ جاتی ہے۔

۲۰۰۵ء میں قائدِ اعظم یونی ورسٹی اسلام آباد سے ہاسپٹل ایڈمنسٹریشن میں ماسٹر کی ڈگری لے کر فارغ ہوا تو میری پوسٹنگ سی ایم ایچ ملیر میں ایڈمن آفیسر کے طور پر ہوگئی۔ بریگیڈیئر محمد اسحاق اور کرنل مسعود بخاری کی شفیق کمانڈ میں ایسا لگتا تھا کہ انھوں نے ہاسپٹل کا سارا کام مجھے سونپ کر خود مزے کی زندگی گزارنے کی ٹھان لی تھی اور سچ بات یہ تھی کہ مجھے بھی کمانڈ کے گُر سیکھنے کا خوب موقع مل رہا تھا۔ اس میں فائدہ یہ تھا کہ اگر مجھ سے کوئی غلطی بھی ہو جاتی تو ذمہ داری تو کمانڈ پر ہی آتی تھی۔

ایک دن ہماری گائنا کالاجسٹ کرنل مبشرہ ثمینہ نے مجھ سے تذکرہ کیا کہ ہماری ایک کیپٹن اپنی شادی کے بعد جب سے ہاسپٹل آئی ہے اپنی ڈیوٹی صحیح طرح نہیں کر رہی اور اگر باز پرس کریں تو رونے لگتی ہے۔ لیڈی آفیسر کا یہ رویہ غیر معمولی ہے۔ آپ ضرور معلوم کریں اسے کیا مسئلہ ہے کیوں کہ اس کا اثر مریضوں پر بھی پڑتا ہے اور میں اس کی ڈیوٹی ایمرجنسی میں لگانے سے ڈرتی ہوں۔

مجھے معلوم تھا کہ اس بچی کی شادی کو ابھی تین ماہ ہوئے تھے۔ اس کا خاوند لندن میں میڈیسن میں پوسٹ گریجویشن کر رہا تھا اور یہ آفیسر اپنے سسرال میں رہتی تھی۔ میں نے اس کو اپنے آفس میں بلایا۔ وہ بہت پریشان اور کسی ذہنی دباؤ کا شکار نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس سے اس کی سینئر کے مشاہدے کا ذکر کیے بغیر اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی۔ اس نے آنسو بہاتے ہوئے بتایا کہ اس کے خاوند نے اسے فوج سے استعفیٰ دے کر لندن پہنچنے کے لیے آخری تاریخ دی ہے ورنہ وہ اسے چھوڑ دے گا۔ سنجیدہ مسئلہ یہ تھا کہ اس تاریخ میں صرف آٹھ دن باقی تھے۔ اس کیپٹن کا ویزہ لگا ہوا تھا مگر فوجی آفیسر کا بیرونی ملک جانے کے لیے چھٹی حاصل کرنے کا ایک طریقہ کار ہوتا ہے۔ آپ چھٹی کی درخواست دیتے ہیں جو اسٹیشن ہیڈ کوارٹر سے ڈویژن ہیڈ کوارٹر اور پھر کور ہیڈ کوارٹر جاتی ہے اور منظور ہو کر اسی طرح واپس آتی ہے تو آپ کو باہر جانے کا اجازت نامہ مل جاتا ہے۔

میں نے لیڈی آفیسر کے سسرال اور میکے میں بات کی تو دونوں گھرانوں کو پریشان پایا اور پتا چلا کہ اگر بچی نہ گئی تو یہ شادی ٹوٹ جائے گی کیوں کہ اس کا خاوند اس معاملے میں ضدی اور ناسمجھ تھا جس نے قسم کھا کر دھمکی دے رکھی تھی کہ تم نہ آئیں تو میں ۲۰ر تاریخ کو تمھیں چھوڑ دوں گا۔ میں نے بچی سے فوراً چھٹی کی درخواست لکھوائی مگر لندن پہنچنے میں صرف آٹھ دن رہ گئے تھے اور درمیان میں سنیچر اور اتوار کی چھٹیاں بھی تھیں۔ کمانڈنٹ سے بات کی تو پکا فوجی جواب ملا کہ قانون کے تحت چھٹی ہو جائے گی، آفیسر کو کہو دو انتظار کرے۔

میں نے اپنے بے ایمانی والے منصوبے کے تحت بچی سے کہا کہ سوموار کی سیٹ کروا لو۔ وہ حیران تھی کہ ایک دن میں چھٹی کیسے ہو گی۔ سوموار کی صبح کمانڈنٹ سے اس کی چھٹی کی درخواست دستخط کروا کر اسٹیشن ہیڈ کوارٹر پہنچا دی گئی۔ کمانڈنٹ کو منصوبہ بتائے بغیر بچی کی ایک ہفتے کی ایمرجنسی چھٹی کروائی اور دوپہر کو میں خود یونی فارم پہن کر اسے کراچی ائیر پورٹ لے گیا۔ ایمیگریشن پر ہر آرمی آفیسر سے باہر جانے کا اجازت نامہ مانگا جاتا ہے لیکن ڈیوٹی آفیسر کے کمرے میں پہنچ کر میں نے بچی کو اونچی آواز میں سمجھانا شروع کر دیا کہ بیٹا اللہ بہتر کرے گا تم پریشان نہ ہو۔ ایمیگریشن آفیسر نے پریشانی کی وجہ جاننا چاہی تو میں نے بتایا کہ بچی کا خاوند بہت بیمار ہے اور بچی پریشانی اور ایمرجنسی میں جا رہی ہے۔ پھر کیا تھا، پاسپورٹ پر فوراً ہی باہر جانے کی مہر لگ گئی۔ بچی انتہائی حیرانی سے مجھے کہنے لگی کہ سر اگر فوج میں سینئر دل میں باپ جیسی محبت رکھتے ہوں تو جونیئرز کے مسئلے اس طرح بھی حل ہو جاتے ہیں۔ وہ آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر مسکراہٹ لیے مجھے خدا حافظ کہہ کر ڈیپارچر لاؤنج کی طرف چلی گئی۔

پھر بہت کچھ ہوا۔ واپس آ کر میں نے کمانڈنٹ کو سب بتا دیا۔ مجھے خوب ڈانٹ پڑی۔ کرنل مسعود بخاری نے مجھے بہت سمجھایا۔ میرا اچھا کیریئر یاد کروایا کہ ان حرکتوں سے کیا نقصانات ہو سکتے ہیں۔ ساتھ ساتھ اس آفیسر کی چھٹی بھی جلدی جلدی منظور کروائی گئی۔ چھٹی ہو کر آ گئی، اجازت نامے پر بھی دستخط ہو گئے۔ اس دوران ہم سب یہ چھپاتے رہے کہ آفیسر چھٹی کی اجازت آنے سے پہلے ہی جا چکی تھی جو ایک جرم ہے۔ بعد میں اس لیڈی آفیسر کو میاں کی ضد کی وجہ سے آرمی سے استعفیٰ دینا پڑ گیا۔ اس نے اپنے کیریئر کی قربانی دے کر اپنا گھر بچا لیا۔ میں ملتان پوسٹ ہو گیا اور پھر اس بچی سے میری کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ سنا ہے،

اب اس کا میاں لندن میں بہت نامی گرامی اسپیشلسٹ ڈاکٹر ہے اور یہ دونوں اپنے تین بچوں سمیت انگلینڈ میں خوش وخرم زندگی گزار رہے ہیں۔

کمانڈنٹ بریگیڈیئر اسحاق مجھے اکثر کہتے کہ تمھاری حرکتوں پر کبھی تمھارا کورٹ مارشل ہو جائے گا اور میں ہنس کر کہتا کہ سر کسی ایک بیٹی کا گھر بچانے کے لیے ایسی سو نوکریاں قربان اور اللہ نیتوں کا حال بھی تو جانتا ہے کسی نقصان ہونے سے بچا ہی لے گا۔

میڈیسن کی چوری روکیں

آپ کسی بھی سی ایم ایچ میں پوسٹنگ جائیں، کمانڈنگ آفیسر سے میڈیسن چوری ہونے کی پریشانی ضرور سنیں گے۔ آپ کو کہا جائے گا کہ بس کسی طرح یہ کنٹرول کرلو۔ متعلقہ آفیسرز یہ چوری کنٹرول کرنے اور جوانوں یا سول اسٹاف کو سزا دلوانے کی تگ و دو میں دو سال گزار جاتے ہیں مگر کوئی اس چوری کی بنیادی وجہ جاننے کی کوشش نہیں کرتا۔ آپ اگر سی ایم ایچ کے اسٹاف کے دوائی لینے کے حقوق دیکھیں تو حیرانی ہوتی ہے۔ جو لوگ سی ایم ایچ کی گندگی صاف کرتے ہیں، ڈاکٹروں کے آفسز کے ٹوائیلٹ دھوتے ہیں، پودوں کو پانی دیتے ہیں، سڑکوں پر جھاڑو دیتے پھرتے ہیں، مریضوں کی الٹیاں اور پیشاب صاف کرتے ہیں، ان کے ماں باپ بیمار ہو جائیں تو وہ سی ایم ایچ میں علاج نہیں کروا سکتے۔

ہمارے ماں باپ کا بڑھاپے میں کیا حال ہوتا ہے، وہ بھی سن لیں۔ میری میجر سے لیفٹیننٹ کرنل ترقی ہوئی تو میں نے خوشی خوشی پہلا فون بی بی جی کو نواب شاہ کیا کہ میری کرنل کے عہدے پر ترقی ہوگئی ہے۔ بی بی جی نے کہا کہ پتر میرے گھٹنوں کے درد کی دوائی بھیجو۔ میں خوب ہنسا اور فوراً دوائی منگوا کر کوریئر سے روانہ کر دی۔ کچھ دنوں بعد ان کو درد سے افاقہ ہوا تو پیار سے فون کر کے دعائیں دیں اور کہا کہ پتا چلا تو کرنل بن گیا ہے۔ میں نے کہا، بی بی جی دوائی بھیجوں تو ہنستے ہنستے کہنے لگیں، اس دن گھٹنوں میں بہت درد تھا۔ تو دوائی نہیں بھیجے گا تو تیری ڈاکٹری کا کیا فائدہ۔

جب ایک لیفٹیننٹ کرنل کی ماں کو اپنے بیٹے سے دوائی چاہیے تو سوچ لیں جوانوں کا کیا مسئلہ ہوگا۔ اگر کوئی سوئیپر سچ بول کر کسی میڈیکل آفیسر کا آفس صاف کرتے ہوئے اس سے کہے کہ سرگاؤں میں ماں بیمار ہے، فلاں میڈیسن بھجوانی ہے تو وہ سوئیپر کو ڈانٹ کر آفس سے باہر نکال دے گا کہ تمھارے ماں باپ کی دوائی قانونی طور پر سی ایم ایچ سے نہیں مل سکتی۔ اب آپ دوائی کسی طرح چوری کر کے بھیج دیں۔ نہ پکڑے گئے تو کچھ نہیں ہوگا۔

میں نے سی ایم ایچ ملتان میں ڈپٹی کمانڈنٹ کی سیٹ سنبھالی تو کراچی سے لوگ بلوا کر خوب صورت فارمیسی ڈیپارٹمنٹ بنوایا۔ لوگوں نے خوب سراہا مگر یہ بات بھی سننے میں آئی کہ سول اسٹاف والے ٹوٹے دل سے کہتے ہیں کہ اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔ میں نے کمانڈنٹ سے اجازت لی کہ جوانوں اور سول اسٹاف سے دربار کی شکل میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ دربار میں اعلان کیا کہ کسی کو والدین یا بیوی بچوں کے لیے دوائی چاہیے تو لکھوا لائیں، میں خود سائین کر دوں گا لیکن آج کے بعد چوری بند۔ فوراً مسئلہ اٹھا کہ سول اسٹاف کے والدین کا کیا ہوگا جن کو قانون کے مطابق دوائی دینے کی اجازت ہی نہیں۔ میری رگِ بے ایمانی نے انگڑائی لی اور میں نے پھر کہا کہ آج کے بعد ملے گی۔

فارمیسی کی انچارج میڈیکل آفیسر کیپٹن عائشہ جہانگیر کو بلا کر پوری بے ایمانی سمجھا دی کہ جس مالی، سوئیپر، پلمبر، چوکی دار یا آیا کے والدین بیمار ہوں، ان کو اپنے کسی آفیسر کے والدین کے نام لکھ کر میڈیسن دے دینا۔ ساری ذمہ داری میری ہوگی۔ وہ کچھ ڈری، کچھ سہمی مگر سمجھ گئی اور اسے یقین آ گیا کہ اگر کوئی آسمان ٹوٹا تو میں سنبھال لوں گا۔

کرنل یٰسین جس کا تعلق میرے شہر نواب شاہ سے ہے، پریشانی میں میرے پاس آیا کہ سر میاں جی کو کیا ہوا۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ کیپٹن عائشہ نے پہلی ہی بے ایمانی میں ایک سوئیپر کے والد کو میڈیسن میرے والد کے نام سے لکھوا کر کاؤنٹر سائین کے لیے جب کرنل یٰسین کے پاس بھیجی تو وہ میاں جی کی خیریت پوچھنے میرے پاس آ گیا۔ عائشہ سے پوچھا تو کہنے گی، سر ڈپٹی کمانڈنٹ کے والد کی چٹ کون روک سکتا ہے، اس لیے بسم اللہ آپ سے کی ہے۔ بہرحال ہم تینوں اس بے ایمانی میں شامل ہو گئے۔ چند ہی دنوں میں لوگوں کو یقین ہو گیا کہ ضرورت ہوئی تو

دوائی مل جائے گی۔

اس کے بعد سی ایم ایچ ملتان میں دو سال تک نہ کسی سوئیپر، مالی، مسالچی کے والدین کو میڈیسن سے انکار ہوا نہ چوری کا کوئی کیس بنا۔ کوئی جوان گاؤں چھٹی جاتا تو اس کو بھی اجازت تھی کہ ماں باپ کے لیے کوئی میڈیسن چاہیے تو بلا خوف و خطر لے جائے۔ ہاسپٹل کے مین گیٹ پر اس کے سامان کی تلاشی نہیں ہوگی۔ کمانڈنٹ کبھی کبھی مجھ سے کہتے کہ تم نے میڈیسن کی چوری کو خوب کنٹرول کیا ہوا ہے اور میں دل ہی دل میں جواب دیتا کہ سر میری بے ایمانیوں میں بڑی طاقت ہے۔ میں جو کہہ دوں، لوگ وہی کرتے ہیں۔

بریگیڈیئر بنا تو پوسٹنگ راول پنڈی ہوگئی۔ آخری دن کیپٹن عائشہ (اب لیفٹیننٹ کرنل) اور کرنل یٰسین (اب ریٹائرڈ) کو بلا کر سمجھایا کہ کل سے فوج کے قانون کے مطابق نوکری شروع کرو ورنہ کوئی ایمان دار سینئر آفیسر تمھاری اگلی ترقی کھا جائے گا۔

برتھ سرٹیفکیٹ

میں ۲۰۰۷ء میں سی ایم ایچ ملتان کا ڈپٹی کمانڈنٹ تھا۔ ایک دن اردلی نے بتایا کہ کوئی ریٹائرڈ میجر صاحب ملنا چاہتے ہیں۔ میرا اصول رہا ہے کہ میں ریٹائرڈ لوگوں سے بہت عزت اور محبت سے ملتا تھا چاہے وہ آفیسرز ہوں یا سولجرز۔ میں میجر صاحب کے آفس میں آنے سے پہلے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ وہ تعارف کرائے بغیر ہی کہنے لگے کہ اب فوج کے قوانین ایسے ہوگئے ہیں کہ میں تین دن سے آپ کے ہاسپٹل کے چکر لگا رہا ہوں مگر کام نہیں ہو رہا۔ میں نے کام سنے بغیر ہی معذرت کی پھر کہا کہ پہلے اچھی سی چائے پی لیں، کام بھی ہو جائے گا۔

کہنے لگے، میں ملتان کا رہنے والا ہوں اور آپ کے موجودہ کور کمانڈر کا کورس میٹ بھی۔ میجر رینک میں ہی فوج چھوڑ کر کینیڈا چلا گیا تھا اور وہیں رہائش پذیر ہوگیا۔ ۱۹۸۸ء میں میرا بیٹا سی ایم ایچ ملتان میں پیدا ہوا تھا۔ برتھ سرٹیفکیٹ گم ہو چکا ہے اور وہاں یونی ورسٹی میں داخلے کے لیے سرٹیفکیٹ لازمی چاہیے۔ کور کمانڈر کے کہنے پر اے ڈی سی نے آپ کے کمانڈنٹ سے بات کی تھی۔ میں ان سے ملا، انھوں نے ہاسپٹل کے اسٹیٹ افسر کے پاس بھجوا دیا۔ اسٹیٹ

افسر نے ریکارڈ چیک کرنے کے لیے مجھے دوسرے دن بلوایا اور بتا دیا کہ اتنا پرانا ریکارڈ نہیں مل سکتا۔ آپ کو جی ایچ کیو راول پنڈی سینٹرل آفیسرز ریکارڈ آفس سے سی آر کی کاپی لانی ہوگی۔ دوبارہ کمانڈنٹ سے ملا تو انھوں نے کہا کہ ہم قانون سے باہر جا کر تو کوئی کام نہیں کر سکتے۔ بتائیے، اب کیا کروں؟ دس دن بعد واپس جانا ہے۔ کینیڈا کے قانون بھی بہت سخت ہیں۔ بیٹے کا یونی ورسٹی کا داخلہ خطرے میں ہے۔ آپ کے کمانڈنٹ کے اردلی نے صلاح دی کہ ڈپٹی کمانڈنٹ سے ملیں تو آپ کے پاس آ گیا ہوں۔ آپ کیا مدد کر سکتے ہیں کہ میرے بیٹے کا برتھ سرٹیفکیٹ مل جائے۔

چائے پیتے ہوئے میں نے فیملی ونگ میں فون کیا اور وارڈ کی اسٹاف نرس سے پوچھا کہ برتھ سرٹیفکیٹ والی بک کس کے پاس ہے؟ کہنے لگی، سر میرے پاس ہے۔ میں نے کہا، کسی کے ہاتھ فوراً میرے آفس بھجوا دو۔ بک میرے آفس آ گئی۔ میجر صاحب سے ان کی ذاتی معلومات لیں۔ ان کی یونٹ، بیگم کا نام اور باقی تفصیلات پوچھ کر اپنے ہاتھ سے لکھتا رہا۔ اردلی سے کہا، باہر کوئی لیڈی میڈیکل آفیسر ہے تو بلاؤ۔ کیپٹن عائشہ جہانگیر نظر آ گئی جو اب لیفٹیننٹ کرنل ہے۔ سرٹیفکیٹ پر پہلے میں نے خود دستخط کیے۔ پھر اس سے کہا کہ بیٹا، میڈیکل آفیسر انچارج فیملی وارڈ کی جگہ دستخط کر کے اپنی مہر لگا دو۔ اپنے پی اے سے کہا کہ ڈپٹی کمانڈنٹ کی مہر لگا لاؤ۔

میجر صاحب یہ سب کچھ حیرت سے سن اور دیکھ رہے تھے۔ سرٹیفکیٹ پر ڈپلیکیٹ کی مہر بھی لگ گئی تو میں نے سرٹیفکیٹ میجر صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا، اور سرٹیفکیٹ بک اردلی کو فیملی ونگ میں واپس کرنے کو دے دی۔

میں نے اپنی بقایا ٹھنڈی چائے کا لمبا گھونٹ لے کر کپ خالی کیا اور اٹھ کر بہت مؤدبانہ انداز سے میجر صاحب سے ہاتھ ملایا۔ میجر صاحب عجیب کش مکش میں مبتلا تھے۔ کبھی سرٹیفکیٹ کو دیکھتے کبھی مجھے۔ جانے سے پہلے تھینک یو کہنا بھی بھول گئے اور خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتے ''یہ کون سی فوج کا افسر ہے'' میرے آفس سے باہر نکل گئے۔

دل تو بہت چاہا کہ واپس بلا کر بتا دوں کہ سر جی، میں آپ کی ایمان دار فوج کا ایک ادنیٰ سا بے ایمان افسر ہوں مگر وہ تو جا چکے تھے۔

کیریئر کا پہلا سپلائی آرڈر

میں نے ریٹائرمنٹ کے بعد صحت کے شعبے میں سپلائیز کا کام شروع کر دیا۔ اللہ نے اس میں ایسی برکت ڈالی کہ نان نفقے سے بے فکر کر دیا۔ ۲۰۲۰ء میں ہاسپٹل آئٹمز کی خریداری کے سلسلے میں مجھے ایک کمپنی میں فون کرنا پڑا۔ اپنا تعارف کروایا تو فون سننے والے اس شخص نے انتہائی محبت سے بات کی اور میرا ایڈریس پوچھا اور کہنے لگا، سر میں آپ سے خود ملنے آ جاتا ہوں۔ میں حیران تھا کہ یہ شخص ایسا کیوں کہہ رہا ہے مگر میں نے اسے اپنے آفس کا ایڈریس اور لوکیشن بھیج دی۔

مجھے اس وقت مزید حیرت ہوئی جب ایک گھنٹے بعد ہی ایک خوش لباس نوجوان شخص کیک لے کر میرے آفس آ گیا۔ اس نے ہاتھ ملانے کے بعد ایک ہی سانس میں اپنا تعارف اس تفصیل سے کروا دیا کہ میں ۲۰۱۰ء میں کور ہیڈکوارٹرز کراچی کے اپنے ڈائریکٹر میڈیکل سروسز کے آفس کی کرسی پر جا بیٹھا اور مجھے اپنی ایک بے ایمانی یاد آ گئی۔

مئی ۲۰۱۰ء کا وسط تھا۔ جی ایچ کیو میڈیکل ڈائریکٹوریٹ راول پنڈی سے حکم صادر ہوا کہ آپ کو اٹھارہ کروڑ کے فنڈز دے رہے ہیں۔ تمام قانونی تقاضے پورے کرتے ہوئے ۵ کور کے تمام سی ایم ایچ اور فیلڈ میڈیکل یونٹس کی ضروریات کے مطابق الیکٹرو میڈیکل سامان خریدیے اور ۱۵/جون تک ہر حالت میں بل جمع کروایئے۔ یہ میرے لیے ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ میں نے کور کے تمام میڈیکل کمانڈرز سے ان کی ضروریات معلوم کیں اور اخبار میں فوراً اشتہار دے دیے۔ تمام سی ایم ایچ سے سینئر ماہر ڈاکٹرز کی کمیٹی بنائی تاکہ بہترین برانڈ کا سامان لینے کے لیے صلاح مشورے کیے جا سکیں۔

مختلف کمپنیوں سے بولی کے کاغذات جمع ہونے لگے۔ ایک دن میرے آفس رنر نے بتایا کہ ایک شخص مجھے ملنے آیا ہے۔ میں نے آفس میں بلوا لیا۔ سفید شلوار قمیص میں ایک چودھری قسم کا بناوٹی بارعب سا آدمی میرے آفس میں داخل ہوا اور سلام دعا کے بعد کوئی نمبر ڈائل کر کے اپنا موبائل فون میری طرف بڑھا دیا اور کہا بریگیڈیئر صاحب، سر جی سے بات کریں۔ میں نے

بادلِ نخواستہ فون لے لیا۔ فون پر راول پنڈی سے ایک بہت ہی سینئر آرمی آفیسر نے اپنا نام بتا کر کہا کہ بشیر چودھری صاحب میرے دوست ہیں، ان کا خیال رکھنا اور ان کو زیادہ سے زیادہ سپلائی آرڈر دے دینا۔ میرا کوئی جواب سنے بغیر ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا۔

فون بند ہوا تو چودھری صاحب نے ایک کمپنی کا لیٹر ہیڈ میرے سامنے رکھا جس پر کچھ میڈیکل کے آئٹمز مع قیمت لکھے تھے اور کہا کہ بریگیڈیئر صاحب یہ آرڈر بنا دیں۔ میں نے اگلے دو منٹ خود کو برداشت کی چکی میں خوب پیسا اور جب خود پر قابو پا لیا تو چودھری صاحب سے کہا کہ آپ کوٹیشنز جمع کروا دیں اور اس دن تشریف لائیں جس دن تمام کمپنی والے بھی جمع ہو رہے ہیں۔ انھیں میرا یہ مشورہ انتہائی ناگوار گزرا مگر میرے شفیق رویے اور نرم لب و لہجے کو سمجھ کر کہنے لگا کہ میں سر جی کو یہ سب بتا دوں' میں نے کہا کہ جی جی چودھری صاحب سر جی کو ایسے ہی لفظ بہ لفظ بتا دیں۔

میں نے سی سی لاگ بریگیڈیئر نصر اللہ ناصر سے مشورہ کر کے باہر لان میں ٹینٹ لگا لیا تاکہ تمام کارروائی سب کے سامنے ہو۔ دی گئی تاریخ پر تمام کمپنی والے تشریف لائے۔ ہم نے ان کو انتہائی عزت سے بٹھا کر چائے پلائی اور بتا دیا کہ ہم بہترین برانڈ مناسب قیمت میں خریدیں گے اور سب کو برابر مواقع ملیں گے کہ وہ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ میں حیران تھا کہ چودھری صاحب آج بھی تشریف لائے مگر کوئی کوٹیشن جمع نہ کروائی بلکہ وہی ایک کاغذ لے کر موجود رہے اور سب کے جانے کے بعد پھر اسی سینئر آفیسر کا نام لے کر مجھ سے سپلائی آرڈر مانگ رہے تھے۔ آج میں نے ان پر واضح کیا کہ چودھری صاحب، اب تو آپ اس سارے کاروبار سے ہی باہر ہو چکے ہیں۔ اپنے سر جی کو بتا دیں کہ چوں کہ آپ نے قانون کے مطابق جو کوٹیشنز جمع کروانی تھیں وہ جمع نہیں کروائیں، اس لیے اب آپ کو کچھ بھی نہیں مل سکتا۔ وہ حیران تھا کہ مجھ جیسا ایک عام سا بریگیڈیئر کسی سینئر آفیسر کے اتنے بااثر دولت مند دوست کو کیسے انکار کر سکتا ہے۔

کچھ دن میں تمام سی ایم ایچ کے ماہر ڈاکٹرز کے مشورے سے ہم نے ٹیکنیکل جانچ پڑتال کر کے ہر آئٹم کے لیے دو تین برانڈ منتخب کر لیے کہ جس کی قیمت مناسب ہوگی، وہ لے لیں گے۔ فنڈز ضائع ہونے کے ڈر سے ہر کام تیزی سے کر رہے تھے۔ ہم کمپنی کے نمائندوں سے

منتخب کیے گئے آئٹم کی قیمت پر گفت وشنید کرتے۔ آن لائن ہی میڈیکل ڈائریکٹوریٹ سے اس کی منظوری لیتے اور وہیں سپلائی آرڈر بنا دیتے۔

تئیس چوبیس سال کا ایک خوب رو بائیو میڈیکل انجینئر اپنی کمپنی کے آئٹمز منتخب کروانے کے لیے مرا جا رہا تھا۔ برانڈ بھی یورپین اور جاپانی تھے مگر قیمت کم کرنے کے اختیارات اس کے پاس نہ تھے۔ اس کا ایک دس لاکھ کا سپلائی آرڈر بنا تو وہ میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے جذباتی سا ہوگیا۔ میں نے کہا، بیٹا خوش لگ رہے ہو۔ کہنے لگا، سر میں چھ مہینے سے اس کمپنی میں ٹرینی انجینئر ہوں اور بغیر تنخواہ کے کام کرتا ہوں۔ پہلا آرڈر ملا ہے، اب میری نوکری اور تنخواہ شروع ہو جائے گی اور میرا کیریئر بن جائے گا۔ اس لڑکے کی یہ بات سن کر حسبِ عادت میری بے ایمانی نے انگڑائی لی۔

میں نے اسے اپنے آفس میں بٹھا لیا اور کیپٹن فضیلہ یونس سے کہا کہ اس کمپنی کے منتخب آئٹمز کی فہرست لاؤ۔ ای سی جی مشین، کارڈیک مانیٹرز اور بہت سے آئٹم منتخب تھے لیکن قیمت پر بات کرنے کا اختیار اس نوجوان انجینئر کے پاس نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ اپنی کمپنی میں بات کرواؤ۔ میں نے کمپنی کے مالک سے کہا کہ آپ کے برانڈ بہترین ہیں۔ ہم نے منتخب بھی کیے ہوئے ہیں۔ آپ کا انجینئر بہت محنتی اور لاجواب ہے مگر اس کے پاس قیمت میں رعایت کرنے کے اختیارات نہیں ہیں۔ اس کو اختیار دیں تاکہ یہ انجینئر آپ کی کمپنی کے لیے کام کر کے دکھائے۔

کمپنی کے مالک کے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ اس سے یہ بات میں خود کہہ رہا تھا۔ انجینئر کو اختیار مل گیا۔ میں نے اسے ایک آدھ قیمت بتائی تو پھر کئی آئٹمز کی رعایتی قیمتیں ہماری مرضی سے طے ہوگئیں اور ۵ سی ایم ایچ کے لیے بہترین برانڈ کی ای سی جی مشین اور کارڈیک مانیٹرز کا ایک بڑا آرڈر اس انجینئر کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے کیریئر کا پہلا آرڈر ہی کروڑوں کا تھا اور وہ اپنی کمپنی کا کور ہیڈکوارٹر میں اکیلا نمائندہ تھا۔ وہ جانے لگا تو میں اٹھ کر کھڑا ہوا اور اسے کہا کہ بیٹا پہلا آرڈر اور پہلی تنخواہ مبارک ہو، جاؤ اپنا کیریئر شروع کرو۔ وہ میرے آفس میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ دو منٹ تک چپ بیٹھا رہا اور پھر ایک دم اٹھ کر بھرائی ہوئی آواز میں صرف

تھینک یو سر کہہ کر چلا گیا۔

آج میرے آفس میں کیک لے کر آنے والا یہ خوش لباس کمپنی کا مالک وہی لڑکا ہے جو ۲۰۱۰ء میں کیریئر شروع ہونے پر مجھے کیک نہ دے سکا تھا کہ اس وقت کسی کمپنی والے کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ مجھے آفس میں کیک دینے آ جائے۔ کہنے لگا، سر اتنے سالوں بعد میں آپ کا فون سن کر آج بھی اتنا ہی خوش ہوا ہوں جتنا اپنے کیریئر کا پہلا آرڈر آپ کے ہاتھ سے لے کر خوش ہوا تھا۔ وہ لمحہ میری زندگی کا نیا آغاز تھا۔ آپ کی وہ مہربانی ایسی تھی کہ اب میں خود امپورٹر ہوں۔ ایک کمپنی کا مالک ہوں مگر آپ کو نہ بھولا تھا نہ بھولوں گا۔ سمجھیں یہ کمپنی بھی آپ کی ہے۔ حکم کیا کریں۔

مجھے آج بھی وہ اسی طرح نوجوان بائیومیڈیکل انجینئر ہی لگا جو میری ایک بے ایمانی کی وجہ سے گیارہ سال بعد بھی مجھے اتنی محبت سے ملنے آ پہنچا ہے اور قدرت کا نظام دیکھیے کہ اب میں اس سے سامان خرید کر کئی ہاسپٹلز کو سپلائی کروں گا تو میرا رزق بھی چلے گا۔

گریڈ 1 اسٹاف کی حالتِ زار

جولائی ۲۰۱۱ء میں میری پوسٹنگ ۵ کور ہیڈکوارٹر کراچی سے بطور کمانڈنٹ سی ایم ایچ ملیر ہوگئی۔ سی ایم ایچ ملیر میں میری پوسٹنگ میجر اور لیفٹیننٹ کرنل کے رینک میں بھی رہی تھی اور ہاسپٹل کا مستقل سویلین عملہ مثلاً سوئیپرز، مالی، پلمبر، الیکٹریشن، دھوبی، نائی سب مجھے میجر رینک سے ہی جانتے تھے۔ آرمی میں کمانڈ تبدیلی کی تقریب بذاتِ خود دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ تقریب میرے لیے اس لیے بھی خاص تھی کہ میں اپنے ہی کلاس فیلو بریگیڈیئر ریاض الحق کے کے سے چارج لے رہا تھا اور اس میں ہمارے بہت سے سویلین دوست بھی مدعو تھے۔

کمانڈ سنبھالی تو سویلین عملے کے لوگ بھی مبارک باد کے لیے ایڈمن بلاک کے سامنے اکٹھے ہوگئے۔ وہ ہاتھ ملانا چاہتے تو میں بڑھ کر انھیں گلے ملتا۔ ایک بریگیڈیئر اور وہ بھی کمانڈنٹ کسی سوئیپر، مالی، دھوبی کو گلے ملے تو ان کی خوشی دیدنی ہوتی ہے اور یہاں بھی یہی ماحول تھا۔ ان کی آپس کی چہ میگوئیاں بھی سننے کو ملیں کہ اوئے میجر بشیر تو بریگیڈیئر بن کر بھی نہیں

بدلا۔ یہ وہ لوگ تھے جو مجھے پچھلے بیس سال سے جانتے تھے اور میں خوش تھا کہ یہی لوگ میری کمانڈ کو آسان بنائیں گے۔

میڈیکل کور کی کمانڈ آرمی کے دوسرے شعبوں سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ دوسرے شعبوں میں کمانڈر سے سب لوگ جونیئر ہوتے ہیں۔ رجمنٹیشن ہوتی ہے، ہر آفیسر اور جوان کو اسی یونٹ میں پوری سروس گزارنی ہوتی ہے۔ یہاں صرف حکم چلتا ہے۔ میڈیکل کور میں اگر آپ کمانڈ میں ہیں تو ممکن ہے آپ کے انڈر کمانڈ اسپیشلسٹ آفیسرز آپ سے بھی سینئر ہوں اور آپ سے بھی زیادہ تعلیم یافتہ ڈگریوں والے اور اپنے شعبے کے نامور ماہر ڈاکٹر ہوں۔ یہاں آپ صرف حکم سے کمانڈ نہیں کر سکتے بلکہ عقل وحکمت اور دوسرے کی قابلیت کو بھی ملحوظِ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔ یہاں آپ کے غلط فیصلوں کی علم وشعور کے دم پر حکم عدولی بھی ہوسکتی ہے مگر آرمی کی دوسری یونٹوں میں غلط فیصلوں پر بھی کسی کو حکم عدولی کی جرأت نہیں ہوتی۔

بطور کمانڈنٹ آپ ہاسپٹل میں عملے کو ڈیوٹی کی بہتر بجا آوری میں جس قدر آسانیاں مہیا کرتے ہیں، آپ کی کمانڈ اتنی ہی کامیاب اور آسان ہوتی جاتی ہے۔ صفائی ستھرائی سے لے کر بجلی، پانی، دوائیاں، کھانا پینا، ہاسپٹل کا سامان اور مریضوں کے علاج کے لیے ہر چیز کی فراہمی کمانڈنٹ اور اس کی ایڈمن ٹیم کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ آفیسرز اور جوانوں کی رہائشی سہولتوں کو بھی کمانڈنٹ کو ہی دیکھنا ہوتا ہے۔ آپ ان کے اور سول اسٹاف کے دکھ سکھ سے بے نیاز ہو کر ہاسپٹل نہیں چلا سکتے اور ہاسپٹل صحیح نہ چلے تو اس کا شور کینٹ کی ہر یونٹ اور ہر فوجی گھر سے اٹھتا ہے۔ آپ ایک ہی وقت میں اصول پرست فوجی کمانڈر اور میڈیکل عملے کے لیے کسی بڑے خاندان کے سربراہ کی طرح نرم دل اور ہمدرد انسان بھی ہوتے ہیں۔

کمانڈ سنبھالنے کے بعد پہلا دربار منعقد ہوا۔ پاکستان آرمڈ فورسز میں سینئر کے سامنے آل او کے کی رپورٹ دینے کا بہت رواج ہے اور یہی اچھے آفیسر کی پہچان ہے۔ میری کمانڈ میں جب مجھے کوئی آل او کے کی رپورٹ دیتا تو میں یہی سمجھتا کہ اگر ہر جگہ آل او کے ہے۔ سب کام اتنے اچھے چل رہے ہیں تو ہمیں کمانڈ پر بٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔

پہلے دربار میں پتا چلا کہ دوسو جوان چارپائی کے بغیر سوتے ہیں۔ میں نے دربار میں پہلا

کمانڈ کی تبدیلی کی تقریب میں بریگیڈیئر ریاض قائم خانی
یونٹ فلیگ بریگیڈیئر بشیر آرائیں کو دیتے ہوئے۔

بریگیڈیئر ریاض قائم خانی بریگیڈیئر بشیر کو کمانڈ اسٹار لگاتے ہوئے۔

کمانڈ کی تبدیلی کے بعد سی ایم ایچ ملیر کے آفیسرز کے ساتھ گروپ فوٹو۔
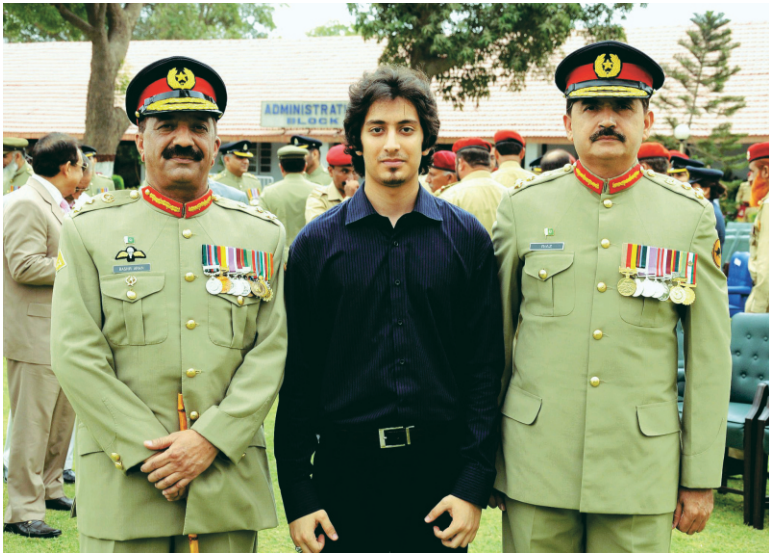
کمانڈ کی تبدیلی کے بعد بریگیڈیئر ریاض قائم خانی اور اپنے بیٹے علی طلال نوری کے ساتھ۔

اعلان یہ کیا کہ آج رات کے بعد کوئی جوان زمین پر نہیں سوئے گا۔ آپ یقین کیجیے کہ فوج میں اگر کمانڈر چاہے تو یہ چھوٹی چھوٹی ضرورتیں ایک فون کرنے سے حل ہو جاتی ہیں۔ بس فون کرنے کی جرأت ہونی چاہیے۔ اگلی رات سے پہلے دو سو چار پائیاں سی ایم ایچ میں پہنچ چکی تھیں۔

میں نے یونٹ میں پہلا دورہ سویلین کے رہائشی کوارٹرز کا رکھا۔ ہسپتال میں دنیا کی ہر چیز مہیا ہوتی ہے لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ۲۰۱۱ء میں بھی ہاسپٹل کی شمالی دیوار اور پاکستان ائیر فورس بیس کی جنوبی دیوار کے بیچوں بیچ سویلین اسٹاف کے بنے کوارٹرز میں نہ واٹر سپلائی کی لائن تھی نہ سوئی گیس کی۔ کواٹرز میں ٹوائلٹ کے دروازوں پر کپڑے یا دریاں لٹکائی ہوئی تھیں اور پانی دور سے بھر کر لایا جاتا تھا۔ گھروں میں جوان بچیاں بھی اسی ماحول میں رہ رہی تھیں۔ میں نے پہلا ہی کوارٹر دیکھا تو اپنے صوبے دار میجر اور کوارٹر ماسٹر کو سی ایم ایچ واپس بھیج دیا تاکہ ان کے اشاروں اور ہدایات سے آزاد ہو کر لوگ اپنی تکالیف مجھے بلا جھجک بتا سکیں۔ میں جیسے جیسے کوارٹرز دیکھتا گیا، میرا سر شرم سے جھکتا گیا کہ یہ وہ لوگ تھے جن کے بل بوتے پر ہمارا ہاسپٹل چلتا تھا۔ ہاسپٹل کی ساری صفائی ستھرائی، ہمارے چمکتے دمکتے دفتر، مریضوں کے کپڑوں کی دھلائی، پانی اور بجلی کی سپلائی، باغ باغیچے اور سڑکیں انھی کے دم سے صاف نظر آتی تھیں اور یہ خود جانوروں سے بدتر زندگی گزار رہے تھے۔ میرا رویہ دیکھ کر اسٹاف کے بچے بچیاں بھی اپنے دکھڑے سنانے لگے۔ میں ان سے وعدہ کر کے نکل آیا کہ بجلی، پانی، سوئی گیس سب کچھ مل جائے گا۔

آفس میں آ کر کوارٹر ماسٹر کو پہلا حکم یہ جاری کیا کہ اگلے ایک ہفتے میں تمام کوارٹرز کے ٹوائلٹ ٹھیک کر کے نئے دروازے لگ جانے چاہییں۔ ہر کوارٹر میں پانی اور سوئی گیس کا کنکشن لگا ہونا چاہیے۔ کوارٹر ماسٹر نے دوسرے ہی دن پھرتی دکھائی اور ایک لمبی کہانی لکھ لایا کہ کوارٹرز میں ٹوائلٹ کے دروازوں کے لیے فنڈز نہیں ہیں جب کہ پانی اور سوئی گیس کے کنکشن ایم ای ایس کے قوانین کے مطابق ان کوارٹر میں نہیں لگ سکتے کیوں کہ یہ سب اپنی مدد آپ کے تحت تعمیر ہوئے ہیں۔

میں نے اکاؤنٹ آفیسر کو بلوا کر کمانڈ فنڈ سے خرچہ کرنے کی اجازت دے دی اور حکم دیا کہ پائپ خرید کر تمام کوارٹرز میں پانی اور گیس کے ایک ایک پوائنٹ کی فٹنگ کر دی جائے اور مین سپلائی کا پائپ کھلا چھوڑ دیں تاکہ ایم ای ایس سے میں خود بات کر کے کنکشن کا بندوبست

کروا دوں۔ جب تمام کام مکمل ہو گیا تو میں نے اپنے بے ایمانی کے پلان کے تحت ہاسپٹل کے پلمبر کو حکم دیا کہ شام کو سی ایم ایچ کی پانی اور سوئی گیس کی مین لائن سے سویلین کے کوارٹرز کا کنکشن جوڑ دے۔ اس رات لوگوں کے گھروں میں میری بے ایمانی کے صدقے دونوں سہولتیں پہنچ چکی تھیں اور ایم ای ایس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ دونوں لائنیں سی ایم ایچ کی دیوار کے باہر پہنچ چکی ہیں۔

مجھے آفس سے اپنے گھر جانے کے لیے انھی کوارٹرز اور ائیر فورس بیس کے بیچ کی سڑک سے گزرنا پڑتا تھا۔ دوسری دوپہر جب میری جیپ ان کوارٹرز کے پاس پہنچی تو کوارٹرز کے باہر چھوٹے چھوٹے کئی بچے زور زور سے آوازیں لگا کر بتا رہے تھے کہ انکل ہمارے گھر میں پانی اور سوئی گیس آ گئی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس کے بعد میرا یہ اسٹاف سی ایم ایچ میں ایسے ڈیوٹی کرتا تھا جیسے یہ ان کا کوئی مذہبی فریضہ ہو اور حیرت کی بات تھی کہ میری کمانڈ میں گیریژن انجینئر یا ایم ای ایس کے کسی اسٹاف نے ان غیر قانونی کنکشنز کی کوئی شکایت بھی نہیں کی۔ مجھے یقین ہے، میری اس بے ایمانی کو بعد میں کسی ایمان دار آفیسر نے اپنی نوکری ٹھیک رکھنے کو ضرور ختم کر دیا ہوگا۔

یہ تو سچ ہے کہ خلقِ خدا کو آسانیاں مہیا کرنے کو آپ کتاب میں لکھے قانون سے ہٹ کر چھوٹی موٹی بے ایمانی کر جائیں تو آپ کی پکڑ کبھی نہیں ہوتی لیکن اس کے لیے آپ کو کتابی نہیں فیلڈ کمانڈر بننا پڑتا ہے۔

مشکل نہیں ہے کچھ بھی اگر ٹھان لیجیے

لیڈی ڈاکٹر ماں بھی تو ہوتی ہے

میں جب ہیڈ کوارٹر ۵ کور کراچی میں ڈائریکٹر میڈیکل سروسز تھا تو سی ایم ایچ ملیر میں لوگ آس لگائے بیٹھے تھے کہ میں ان کا اگلا کمانڈنٹ بنوں گا اور وہ میری سنی سنائی غیر روایتی کمانڈ خود بھی دیکھ سکیں گے۔ آخر کار حسبِ توقع میں نے جولائی ۲۰۱۱ء میں جا کر کمانڈ سنبھال لی۔ میرا ڈپٹی چھ فٹ تین انچ لمبے قد کاٹھ کا پکا فوجی ڈاکٹر تھا جس کی تربیت میڈیکل کیڈٹ ہونے کی

وجہ سے خالصتاً فوجی ماحول میں ہوئی تھی جہاں ہر کام کتاب میں لکھی لکیروں کے مطابق کیا جاتا ہے۔ مجھے پہلے دن ہی پتا چلا کہ جونیئر آفیسرز نے ڈپٹی کمانڈنٹ کا نام سرشکایتی رکھا ہوا تھا۔ وہ ہر صبح مجھے مارننگ رپورٹ میں پچھلے دن کی دو چار شکایتیں ضرور گوش گزار کرتا اور میں سن کر مسکراتا رہتا۔ وہ سب سے زیادہ تنگ ہاسپٹل کی لیڈی ڈاکٹرز سے تھا اور سرِفہرست ایک لیفٹیننٹ کرنل رخسانہ آصف تھی جو میڈیکل اسٹور کی انچارج بھی تھی۔ ڈپٹی کمانڈنٹ نے بتایا کہ وہ روز ہی لیٹ آتی ہے اور بعض اوقات وقت سے پہلے ہی گھر چلی جاتی ہے۔

ڈپٹی کی خواہش کے مطابق اس لیڈی ڈاکٹر کی میرے پاس پیشی ہوئی۔ میں نے اس سے دیر سے آنے اور جلدی چلے جانے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگی، سر میں ایک ماہ پہلے میٹرنٹی چھٹی سے واپس آئی ہوں اور میرے دو جڑواں بیٹے اب تین ماہ کے ہیں۔ میرے میاں ریٹائرڈ آرمی آفیسر ہیں اور ڈی ایچ اے کراچی کے ملازم ہونے کی وجہ سے ہمیں گھر بھی وہیں ڈی ایچ اے میں ملا ہے۔ میں دونوں بچوں کو اپنا دودھ پلاتی ہوں اور اس طرح مجھے کبھی کبھی صبح کچھ دیر ہو جاتی ہے۔ میں نوکری کے ساتھ ساتھ یہ سب ذمہ داری پوری ایمان داری سے نبھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ گھر یہاں سے بیس کلومیٹر دور ہے۔ آتے جاتے دونوں ہی وقت رش ہوتا ہے مگر حتی الامکان نیت ہوتی ہے کہ شکایت کا موقع نہ دوں۔ میں نے پوچھا، آپ کے اس سارے مسئلے کا ڈپٹی کمانڈنٹ کو معلوم ہے کہ نہیں؟ کہنے لگی، سر آپ کے آنے سے پہلے ہی میری باہر رہائش، میٹرنٹی چھٹی اور سی ایم ایچ میں جڑواں بچوں کی پیدائش کے بارے میں ان کو سب معلوم ہے۔ میں نے یہ سب سنا اور ایک بے ایمانی کرنے کا سوچا۔ ڈپٹی کو بلا کر کہا کہ واقعی اس لیڈی ڈاکٹر کو اس کی کوتاہی کی سزا ملنی چاہیے۔ اس کا انتظام کرتے ہیں مگر کیا سی ایم ایچ میں اس طرح کی ماؤں اور بچوں کے لیے کوئی ڈے کیئر سینٹر بھی ہے کہ نہیں۔ ڈپٹی کا جواب نفی میں تھا مگر اپنی شکایت پر خاتون کو سزا ملنے کی کامیابی پر خوش ہو رہا تھا۔

۵ کور ہیڈ کوارٹر کا ایک گیریژن میڈیکل سینٹر شاہراہ فیصل پر ہے جو اب تو بہترین سہولتوں کا حامل ہے مگر ۲۰۱۱ء میں صرف او پی ڈی کے طور پر کام کرتا تھا اور اسے کور کی فیلڈ میڈیکل یونٹ چلاتی تھی، اس لیے ڈاکٹرز کی کمی ہمیشہ رہتی تھی۔ میں نے اپنے بعد آنے والے ڈائریکٹر

میڈیکل سروسز ۵ کور سے کہا کہ آپ مجھے خط لکھ کر ایک لیڈی ڈاکٹر مانگ لیں تا کہ کور گیریژن میڈیکل سینٹر کو بہتر طریقے سے چلایا جا سکے۔ کور ہیڈ کوارٹر سے خط آ گیا۔ میں نے ڈپٹی سے کہا کہ سی ایم ایچ ملیر نے ۵ کور ہیڈ کوارٹر کو ایک لیڈی ڈاکٹر دینی ہے کیوں نہ ہم اسی لیفٹیننٹ کرنل کو بھیج دیں تا کہ اس کے روزانہ لیٹ آنے والی شکایت سے بھی جان چھوٹ جائے اور کور کی ضرورت بھی پوری ہو جائے۔ وہ خوب خوش ہوا اور میری بات کی تائید کی۔

کسی سی ایم ایچ کے لیے ناممکن سا ہوتا ہے کہ اپنی کسی سینئر لیڈی ڈاکٹر کو کسی او پی ڈی میں جا بٹھائے۔ بہر حال میں نے اپنی ڈاکٹر کو بلایا اور بتایا کہ چوں کہ آپ کی روزانہ لیٹ آنے کی شکایت ہے، اس لیے سزا کے طور پر آپ کو ۵ کور گیریژن میڈیکل سینٹر بھیجا جا رہا ہے اور کل سے آپ وہیں ڈیوٹی کریں گی۔ یاد رہے کہ یہ سینٹر اس کے گھر سے تین کلو میٹر دور تھا۔ وہ حیرانی سے میری بات اس طرح سن رہی تھی جیسے اسے کچھ سمجھ نہ آ رہا ہو۔ کچھ دیر تو بالکل ہی چپ بیٹھی رہی مگر پھر اٹھ کر پیچھے ہٹی اور مجھے کیڈٹس والا اسمارٹ سیلوٹ کر کے کہنے لگی، سر میں آپ کی دی ہوئی یہ سزا یاد رکھوں گی اور آپ کی شکر گزار بھی رہوں گی۔

وہ تو ہاسپٹل سے چلی گئی مگر میں نے ہاسپٹل آڈیٹوریم کے ساتھ ایک ماہ میں ہی انتہائی خوب صورت ائیر کنڈیشنڈ ڈے کیئر سینٹر بنا کر اس میں دو عدد آیا رکھ دیں اور لیڈی آفیسرز کو اجازت دے دی کہ وہ اپنے بے بی کو ساتھ لا سکتی ہیں۔ میرا ڈپٹی انتہائی خوش تھا کہ اس کی روز روز لیٹ آنے والی لیڈی آفیسر سے جان چھوٹ گئی۔ ڈی ایم ایس ۵ کور خوش تھا کہ اس کو اپنے سینٹر کے لیے ایک سینئر لیڈی ڈاکٹر مل گئی ہے اور میں اپنی بے ایمانی پر سب سے زیادہ خوش تھا کہ چلو اب ایک ماں اپنی پروفیشنل ڈیوٹی کے ساتھ اپنے جڑواں بچوں کی بھی سکون سے پرورش کر سکے گی۔

اب وہی لیڈی ڈاکٹر بریگیڈیئر کا رینک پا کر سی ایم ایچ لاہور میں نوکری کر رہی ہے۔ مجھے نہیں معلوم، وہ اب روایتی کتابی کمانڈر بن بیٹھی ہے یا کوئی چھوٹی موٹی بے ایمانی کر کے دوسروں کے لیے آسانیوں کا سبب بھی بنتی ہے۔

مشکلیں ہزار

لڑکی عمر میں بڑی ہے

نجی یا سرکاری نوکری کسی بھی شعبے میں ہو، آپ دو کام بہت آسانی سے کر سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اپنی ڈیوٹی ایمان داری سے سرانجام دے کر اپنی تنخواہ کو حلال کرتے رہیں اور دوسرا بغیر کوئی قانون توڑے بھی خلقِ خدا کے لیے آسانیاں پیدا کرتے رہیں۔ان دونوں کاموں کا صلہ آپ کو پینشنرز کے طور پر اولاد کی خوشیوں اور صحت منداور باعزت بڑھاپے کے طور پر ضرور ملتا رہے گا۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اگر آپ بڑھاپے میں صحت مند زندگی گزار رہے ہیں تو دوسروں کے لیے بھلے کے کام مسلسل کر سکتے ہیں۔آپ کے کام کی نوعیت بدل سکتی ہے۔ہم دونوں میاں بیوی آج کل پینشنرز کی زندگی گزار رہے ہیں اور ہمیں جب بھی وقت ملتا ہے، ہم ایسے بچوں کے ساتھ ضرور بات کرتے ہیں جو زندگی کے مختلف مسئلوں میں رہنمائی چاہتے ہیں۔بعض اوقات آپ کا ایک اچھا مشورہ کسی بچے کی پوری زندگی ہی بدل دیتا ہے۔

میری ایک نظم ''تم فوجی ہو'' بہت پسند کی گئی تو اس پر ویڈیو بنانے کے سلسلے میں میری ملاقات ایک سوفٹ ویئر انجینئر لڑکی سے ہوئی۔ وہ بچی اپنے کام کی اتنی ماہر لگی کہ میں نے اس کو اپنا فیصلہ فوراً سنا دیا کہ ویڈیو ریلیز کے قابل بنے یا نہ بنے، اس کے کام کا معاوضہ میں ایڈوانس دے رہا ہوں۔ جانے لگی تو میں نے ازراہِ محبت پوچھ لیا کہ بیٹا آپ شادی شدہ ہو یا نہیں۔ افسردہ سے لہجے میں کہنے لگی، سر میں تیس سال کی ہوگئی ہوں اور کل ہی ایک فیملی نے مجھے پسند کرنے کے باوجود اپنے بیٹے کی عمر دو سال کم ہونے پر رشتے سے منع کر دیا ہے۔ میں نے اسے واپس بیٹھنے کو کہا اور اس کے لیے چائے منگوائی۔

میں نے بچی سے کہا کہ اگر اجازت دو تو میں اس لڑکے یا فیملی سے بات کروں۔ اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔ تفصیل پوچھ کر فون نمبر لے لیا۔ دوسرے دن اس لڑکے کو آفس میں ملنے کی دعوت دے دی۔ شام کو میرے دفتر بند ہونے سے پہلے ایک خوب رو بینکر لڑکا مجھے ملنے آ گیا۔ میں نے ذرا سی تمہید کے بعد چائے آنے پر بات شروع کر دی کہ بیٹا اتنی خوش شکل اور پڑھی لکھی لڑکی کو آپ نے کیوں منع کر دیا ہے۔ میں ایک بزرگ کی حیثیت سے آپ کو بیٹا سمجھ کر یہ سوال کر رہا ہوں۔ اس نے کھلے دل سے اعتراف کیا کہ میری ماں اور بہنوں نے لڑکی کی عمر پر اعتراض کیا اور کہا کہ اگر لڑکی تین چار سال چھوٹی ہو تو ٹھیک رہتا ہے۔

میں نے پوچھا کہ اگر کوئی بچی ڈاکٹر، انجینئر، سی ایس ایس آفیسر یا ماسٹر تک تعلیم یافتہ ہو تو وہ تئیس چوبیس سال کی کیسے ہو سکتی ہے۔ ہم مسلمان ہیں تو اپنے نبی ﷺ کو یاد کیوں نہیں رکھتے۔ جنھوں نے خود پندرہ سال بڑی عورت حضرت خدیجہؓ سے شادی کی تھی۔ یہ بچی تو صرف دو سال بڑی ہے اور تم سے بڑی دکھائی بھی نہیں دیتی۔ وہ چپ چاپ میری باتیں سنتا رہا مگر کوئی جواب نہ دیا۔ مجھ سے اجازت چاہی تو میں نے خود دروازے تک جا کر رخصت کرتے دعا دی کہ جو بھی ہو بس اللہ تعالیٰ آپ کے لیے بہتر کرے۔

پندرہ سے زیادہ دن گزر گئے ہوں گے اس بات کو کہ ایک اتوار میرے لیے بہت خوشی کی خبر آئی۔ ہم میاں بیوی شام کو لان میں چائے پینے بیٹھے تھے کہ اسی بچی کا فون آیا۔ نام بتا کر کہنے لگی، سر میں آپ کو یاد ہوں؟ میں نے کہا، بیٹا تم سے ویڈیو بنوانی ہے تو تمھارا نمبر نام کے ساتھ محفوظ کیا ہوا ہے۔ کہنے لگی، سر آپ ۱۸/اپریل اتوار کی شام میری شادی میں آ کر مجھے دعا دیں گے۔ میرا رشتہ وہیں پکا ہو گیا ہے۔ نہ جانے آپ نے اس سے کیا کہا ہوگا کہ اس شخص نے اپنی فیملی کے ساتھ خود ہمارے گھر آ کر ہاں کی اور تاریخ بھی پکی کر گیا۔ سر ہم دونوں آپ کو تو کبھی نہیں بھول سکتے۔

مجھے سمجھ ہی نہ آیا کہ میں بچی سے کیا کہتا۔ بس اتنا کہا کہ بیٹا چھوڑو میری نظم کی ویڈیو بنانے کو۔ وہ بعد میں دیکھیں گے، بس تم اپنی خوشیاں سمیٹنا شروع کرو۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ کم عمر بچیوں کے رشتے ڈھونڈتی سب ماؤں اور بہنوں سے میرا ایک سوال

ہے کہ کم عمر بچیاں اعلیٰ تعلیم یافتہ کیسے ہوسکتی ہیں۔ ہمیں کیوں اپنے لیے بہو ڈاکٹر اور انجینئر چاہیے مگر عمر صرف بائیس سال ہو۔ یاد رکھنے کی صرف ایک بات ہے کہ کیا پتا اس طرح کی بچی تلاش کرتے ہوئے کوئی آپ کے گھر بھی آ پہنچے۔

اب مشکل ہے مسلماں ہونا

ایک دوپہر ایک بچی کا فون آیا کہ سر بشیر، میں کچھ مشورہ اور مدد لینے کے سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ پوچھا کہ بیٹا پہلے کام بتائیے۔ کہنے لگی، مل کر ہی بتاؤں گی، فون پر سن کر کہیں آپ انکار نہ کر دیں۔ آفس آنے کی اجازت دے دیں۔ میرا آفس اب میرے بزنس آفس سے زیادہ مشورہ گاہ بن چکا ہے۔ وہ بچی شام کو ایک سادہ سے دیہاتی لڑکے کے ساتھ میرے آفس پہنچ گئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ مجھے کیسے جانتی ہو۔ بچی نے بغیر تمہید کے بتایا کہ پچھلے سال کووڈ میں مبتلا تھی تو دوائی لینے آئی تھی۔

کہنے لگی، سر ہم پنجاب لیاقت پور کے رہنے والے ہیں۔ مزدوری کرنے کراچی آئے۔ چوں کہ میں ماں باپ کی اکیلی اولاد تھی تو انھوں نے آٹھویں کلاس تک پڑھایا مگر غربت سے تنگ آ کر میری جلدی شادی کر دی اور تین سال پہلے دونوں فوت ہوگئے۔ میری شادی کے چار سال جہنم میں گزرے۔ شوہر نشہ کرتا تھا، میں گھروں میں کام کرتی مگر کووڈ نے لوگوں کے کاروبار ہی تباہ نہیں کیے گھر بھی اجاڑ دیے۔ مجھے کووڈ ہوا تو کام چھوٹ گیا۔ میں بے روزگار ہوگئی۔ میاں کو نشے کے پیسے ملنے بند ہوئے تو مجھ سے لڑتا رہتا کہ کما کر لاؤ۔ تنگ آ کر دسمبر ۲۰۲۰ء میں مجھے طلاق دے کر کہیں غائب ہوگیا۔ اب میری عمر اکیس سال ہے اور مجھے اپنے کسی رشتہ دار کا پتا ہی نہیں۔ دھکے کھاتی رہی۔ گلستانِ جوہر میں ماں کے جاننے والے ایک گھر میں کام اور رہائش میسر ہوگئی مگر مجھے اس گھر میں مسئلے ہونے لگے۔ سر اگر کسی لڑکی کا کوئی والی وارث نہ ہو تو ہر شخص اسے بری نظر سے دیکھتا ہے۔ پچھلے دنوں مجھے صبح کے وقت ایک سکیورٹی کمپنی کے آفس کی صفائی کا کام بھی مل گیا جو میں نمٹا کر دو گھنٹے میں گھر واپس آ جاتی تھی۔ میں عزت کی زندگی ڈھونڈ رہی تھی

کہ کہیں کسی کے نکاح میں آ کر خود کو ہر شخص کی نظروں کی وحشت سے محفوظ کرلوں۔ اسی سکیورٹی کمپنی میں دلیپ کمار صبح آفس کھولتا تھا۔ پندرہ دن تک ہم سارا کام اکٹھے کرتے کرتے ذاتی باتیں بھی کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ میں دنیا میں اکیلی ہوں۔ اللہ کے سوا کوئی سہارا نہیں۔ دلیپ کمار نے کہا کہ میں بھی ایسا ہی ہوں۔ بچپن میں کوئی فیملی مجھے تھر سے کراچی لائی تھی۔ دس سال تک مجھے واپس نہ جانے دیا اور پھر وہ امریکا چلے گئے۔ میں قیوم آباد میں ایک کمرے میں رہتا ہوں۔ اگر تم راضی ہو تو میں مسلمان ہو کر تم سے شادی کر سکتا ہوں۔ مگر میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ غریب آدمی ہوں۔

سر ہم تین مسجدوں میں گئے کہ دلیپ کمار کسی سے کلمہ پڑھے اور مسلمان ہو جائے۔ ہر مولوی نے ہمیں ڈانٹ کر نکال دیا کہ شاید ہم کوئی غلط کام کرنے لگے ہیں۔ ایک مولوی نے تو مجھ سے کہا کہ بی بی کس بدشکلے کی باتوں میں آ گئی ہو، میرے پاس رہ لو۔ آخر ہمارے ایک سکیورٹی گارڈ نے دلیپ کمار کو کلمہ پڑھا کر مسلم نام احمد علی رکھ دیا اور اپنے محلے کے ایک شخص کے ذریعے ہمارا نکاح پڑھوا دیا۔ ہم نے یہ بات جب اپنی کمپنی میں بتائی تو ہم دونوں کو کمپنی سے نکال دیا گیا کہ کمپنی میں نوکری کرنے والوں کو ایسے تماشوں کی اجازت نہیں ہے کیوں کہ اس طرح کمپنی کا ماحول خراب ہوتا ہے۔

سر اب ہم دونوں میاں بیوی تو بن گئے ہیں مگر بے روزگار ہو گئے ہیں۔ ہمارے دو مسئلے حل کر دیں۔ ہم آپ کو زندگی بھر دعائیں دیں گے۔

۱۔ ہمیں کمرے کا دو ماہ کا کرایہ اور ایک ماہ کا راشن دے دیں تب تک ہم نوکری ڈھونڈ لیں گے۔

۲۔ احمد علی کی ختنہ کروا دیں کیوں کہ ہم جس ہاسپٹل میں جاتے ہیں، وہ ہماری یہ بات سن کر ہمارا مذاق اڑاتے ہیں اور ہنستے ہیں۔

آپ معاشرے کے رویے دیکھیے۔ جائز نکاح کی دشواریاں دیکھیے۔ کسی کے مسلمان ہونے پر اس کی مدد کرنے کے بجائے اس کی زندگی اجیرن ہوتے دیکھیے۔ دلیپ کمار، احمد علی کے روپ میں مجھے زیادہ پریشان لگ رہا تھا۔ بات کرتے مجھ سے بھی ڈر رہا تھا۔ ساری بات بچی کو کرنی پڑ رہی

تھی اور ابھی ان کو نکاح نامہ بھی بنوانا تھا۔ رجسٹر کرانے کو نادرا کے دفتر کے دھکے بھی کھانے تھے۔

میں ان کی باتیں چپ چاپ سنتا رہا۔ انھیں چائے پلائی۔ محلّہ محمود آباد میں اعظم میڈیکل سینٹر میں بات کی۔ ڈاکٹر اعظم اور ان کے سرجن نے بغیر فیس کے احمد علی کے ختنہ کر دینے کی حامی بھر لی۔ میں نے دو لوگوں کی ضرورتوں کا ایک ماہ کا راشن منگوایا۔ دو ماہ کا کمرے کا کرایہ لفافے میں ڈال کر دے دیا۔ تحفہ میں ترجمے والا قرآنِ کریم دے کر ایک شادی شدہ جوڑے کو خوشی خوشی اپنے دفتر سے روانہ کر دیا کہ جب تک ضرورتیں پوری کرنے کو نوکری کا بندوبست نہ ہو جائے، آپ کو زندگی سے ناامید نہیں ہونے دوں گا۔

یہ کہانی لکھتے ہوئے میں اپنے آنسو نہیں روک پا رہا کیوں کہ میں نے ایک فون کر کے اور صرف تیس ہزار روپے خرچ کر کے ایک جوان نومسلم لڑکے کو یقین دلا دیا ہے کہ مسلمان ہونا اتنا بھی مشکل نہیں ہے جتنا پچھلے ایک ہفتے میں اس نے دیکھا ہے۔

میں نے کہا، دو ماہ تک اطمینان سے اپنے لیے نوکری ڈھونڈ لو ورنہ مجھ سے رابطہ تو رہے گا ہی۔

ہمارے بچے ناراض ہیں

میں نے جب سی ایم ایچ کی کمانڈ سنبھالی تو ہم عسکری ۴ راشد منہاس روڈ پر کرائے کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ کمانڈ سنبھالتے ہی کمانڈنٹ ہاؤس لاہور لائنیز ملیر شفٹ ہو گئے۔ یہ دو ایکڑ پر گھنے لمبے قد آور درختوں کے بیچ خوب صورت گھر ہے۔ اس گھر کو دیکھ کر انسان خوابوں کی دنیا میں چلا جاتا ہے لیکن سب عارضی ہے۔ پوسٹنگ ہو گئی تو آپ کو گھنٹوں میں اپنی اوقات یاد آ جاتی ہے مگر شکر ہے کہ اس جادوئی گھر نے بھی میرا یا میرے گھر والوں کا کچھ نہ بگاڑا۔

ملیر کینٹ میں اکثر لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ کمانڈنٹ سی ایم ایچ سے اچھے مراسم رہیں کیوں کہ بیوی بچوں یا والدین کی بیماری اور ایمرجنسی کی حالت میں یہ واحد ہاسپٹل ہے جو آپ کی مدد کرتا ہے۔ میں نے سوچا، میرا گھرانا اس بات سے کہیں کوئی فائدہ نہ اٹھائے، اس لیے

اپنے بچوں کی تربیت اس زاویے سے بھی ضروری سمجھی۔

چوں کہ میرا بیس سالہ بیٹا خود گاڑی چلا کر یونی ورسٹی جاتا تھا تو میں نے اسے بٹھا کر محبت سے سمجھا دیا کہ اگر غلط ڈرائیونگ پر یا کسی بھی غلط رویے پر ملٹری پولیس یا سول پولیس نے اسے چیک کر لیا تو میں اس کی کوئی سفارش نہیں کروں گا اور اسے قانون کے مطابق سزا بھگتنی پڑے گی۔ میں سمجھتا تھا کہ اس طرح میرا بیٹا قاعدے اور قانون کے مطابق زندگی گزارنا سیکھے گا اور اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے کبھی شکایت کا موقع بھی نہ دیا۔

ایک شام میں اپنے گھر کے لان میں چائے کا انتظار کر رہا تھا کہ میرا بیٹا یونی ورسٹی سے واپس آتے ہی سیدھا میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور اکھڑے اور غیر معمولی اور بلند لب و لہجے میں کہنے لگا کہ بابا مجھے آپ کے اصولوں سے اختلاف ہے اور میں اس پر آپ سے سنجیدگی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس کو اپنی بات کہنے کی اجازت دے دی۔ کہنے لگا کہ پچھلی رات گھر میں فیملیز کے ڈنر کی وجہ سے آج صبح مجھے یونی ورسٹی جانے میں دیر ہو گئی۔ شاہراہِ فیصل پر میری ڈرائیونگ رفتار مقررہ حد سے زیادہ ہو گئی، اس لیے مجھے ٹریفک سارجنٹ نے اشارہ کیا اور میں رک گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ میری اسپیڈ زیادہ تھی۔ میں نے معذرت کی کہ میرا پیپر ہے، اس لیے مجھ سے غیر ارادی طور پر یہ غلطی سرزد ہوئی ہے۔ مجھے معاف کر دیں، آئندہ خیال رکھوں گا۔

کہنے لگا، بابا وہ ٹریفک سارجنٹ آپ کی عمر کا تھا۔ کندھے پر انسپکٹر کا رینک تھا مگر مجھے معاف کرنے سے پہلے ایک ہزار روپے اور پھر آہستہ آہستہ پانچ سو روپے مانگتا رہا۔ بابا میں نے تو اسے یہ بھی نہیں بتایا کہ میرا باپ بریگیڈیئر ہے اور ٹریفک پولیس کے بہت سے سینئر آفیسرز بھی ان کے دوست ہیں اور ہمارے گھر بھی آتے ہیں۔ میں نے تو اپنی غلطی پر شرمندگی کا اظہار بھی کیا تھا مگر وہ رشوت مانگتا رہا۔ میں اپنا چالان کروانے پر بھی راضی ہو گیا تھا مگر اس کے رشوت کے تقاضے کی وجہ سے میرے سمسٹر کے پیپر کا وقت بھی نکل گیا۔

یہ کیسا ملک ہے، یہاں ہم سے ہمارے باپ کی عمر کے باوردی لوگ ہماری غلطی پر ہمیں غیر قانونی راستہ دکھاتے ہیں۔ اس قوم و ملک کا یہ حال کرنے میں آپ کا قصور ہے۔ بابا، ہم نے تو ابھی اپنے کیریئر کا آغاز بھی نہیں کیا۔ ہم اس وقت کیا کریں جب ہم سے عمر میں تین دہائیاں

بڑے آفیسرز سڑک پر کھڑے ہو کر دن دہاڑے ہم سے رشوت مانگتے ہیں۔

میں اپنے بیٹے کی باتوں سے پریشان تو ہوا ہی تھا مگر اسے کچھ سمجھا نہ سکا کیوں کہ بعد میں یہی بات اس کے دوست بھی مجھ سے آ کر کرتے رہے کہ ان کے ساتھ بھی اکثر ایسا ہوتا ہے۔

تین سال پہلے وہ سٹی یونی ورسٹی لندن سے انٹرنیشنل پولیٹکس اینڈ فارن پالیسی ڈیولپمنٹ میں ماسٹر کر کے آیا تو ہمارے ملک پر پچھلے ستر سال سے باری باری حکومت کرنے والے صاحبِ اختیار لوگ ایک دوسرے کے پول کھول رہے تھے اور ایک دوسرے کو چور لٹیرا غدار اور ڈکٹیٹر کہہ رہے تھے۔ بیٹا مجھ سے پوچھتا رہا کہ بابا یہ چور اچکے غدار اور بے ایمانیوں میں گرفتار سب لوگ آپ کی عمر کے کیوں ہیں؟ کیا ملک کو تباہ آپ کی پرانی نسل نے نہیں کیا؟ ہم کیوں بھگتیں یہ سب؟ اس کی سزا ہمیں کیوں ملے؟ ان کو اپنی پگڑیاں اب خود ہی اچھالنے دیں۔ ہم اس کھیل کا حصہ نہیں بنیں گے۔ نہ یہ ہمیں کام کرنے دیتے ہیں نہ ہمیں آگے بڑھنے کا کوئی راستہ دیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے ہم پڑھ لکھ کر بھی صرف ان کی تقریریں سنتے رہیں گے اور ملک و قوم کے لیے کچھ نہ کر پائیں گے۔

میں اس طرح کی باتیں اپنے بیٹے اور اپنے گھر آنے والے اس کے دوستوں سے روز سنتا تھا۔ پھر ایک دن اچانک ایک انٹرنیشنل کمپنی نے اس کی ڈگری کو بنیاد بنا کر اپنے ریسرچ پروجیکٹ میں کام کرنے کو اسے ٹورنٹو بلا لیا۔ میں اسے کیسے روکتا۔ میرے پاس اسے روکنے کے سارے جواز بے معنی تھے۔

میں اب اس امید پر زندہ ہوں کہ ملک میں روز چور چور اور غدار غدار کی پریس کانفرنس کرنے والے ملک و قوم کے معززین جلد اللہ کو پیارے ہوں تو میں اپنی نئی نسل کے پڑھے لکھے بچوں کو منانے کے لیے کام کروں کہ بیٹا اپنے ملک واپس آ جاؤ۔ قوم کو آپ کی بہت ضرورت ہے۔

ظہرانہ ملتوی

کراچی میں غیر معمولی سردی نے اچھے بھلے لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے تو سوچیں عام آدمی کا کیا حال ہوگا اور اصل وجہ پریشانی کی یہ ہے کہ کراچی میں یہ موسم غیر معمولی ہے اور اسی

لیے کسی کے پاس سردی سے بچنے کا کوئی انتظام ہی نہیں۔ نہ گھر میں کمبل رضائیاں ہیں نہ باہر جانے کو گرم کپڑے۔

سب سے زیادہ پریشانی ان لوگوں کو ہے جو فجر کی نماز کے بعد مزدوری کے لیے نکلتے ہیں اور صبح صبح ان کو سردی اور ٹھنڈی ہواؤں سے بچنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ جب آپ ان مزدوروں کو سڑک کے کنارے بیٹھے کسی آجر کے انتظار میں ٹھٹھرتے دیکھتے ہیں تو ان کے لیے کچھ کیے بغیر آگے بڑھ جانے کے لیے پتھر کا دل چاہیے۔ مجھ سے تو آگے بڑھا نہیں جاتا کیوں کہ اب اس عمر میں پتھر کا دل کہاں سے لاؤں۔

اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ حالات سے میں کل رات گزرا۔ میرے ایک دوست شہزاد چودھری کا ماربل کٹنگ کا کام ہے اور وہ مجھے رات کے دس بجے اپنی فیکٹری میں چیکنگ کا کہہ کر منگھوپیر لے گیا۔ وہاں لوگ رات کو ماربل کی کٹائی، رگڑائی اور پالش کی مشین چلاتے ہیں اور اس سارے عمل کے لیے پانی کا کھلا استعمال ہوتا ہے۔ او میرے خدایا سردی، ٹھنڈی ہوائیں، ننگے پاؤں، گیلے کپڑے اور ماربل کی سلیبیں اٹھا کر باہر ٹرکوں میں لوڈ کرنا۔ کوئی ایسے روزی کمائی جاتی ہے بھلا۔ یہ سوچ کر ہی کلیجا منہ کو آتا ہے اور میں تو بذاتِ خود ان لوگوں کے درمیان کھڑا سردی سے پریشان ہو رہا تھا۔

آپ اگر آج کل رات کو ناظم آباد، لسبیلہ، گولیمار اور منگھوپیر کی طرف جائیں تو جگہ جگہ اُبلے ہوئے انڈے اور گرم دودھ پی لو کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ میں چپ چاپ واپس چورنگی پر آ کر دو درجن گرم اُبلے انڈے اور تین لیٹر گرم دودھ اور کچھ پلاسٹک کے گلاس لے کر واپس آ گیا۔ چھ سات مزدوروں کو کچھ دیر کے لیے سردی سے بچنے کا یہ معمولی سا انتظام کر دیا۔

آج صبح لائٹ ہاؤس گیا جو لنڈا بازار بھی کہلاتا ہے اور آٹھ لوگوں کے لیے واٹر پروف دستانے، ربڑ کے بوٹ، گرم ٹوپیاں اور موٹی جیکٹس خریدیں اور ابھی ابھی منگھوپیر ماربل کی فیکٹری میں ان مزدوروں کو دے آیا ہوں۔

اب اس ساری کہانی کا خرچہ بھی سن لیں۔ اگلے اتوار کو میں نے اپنے جن نو دوستوں کو کریک کلب میں برنچ پر بلایا تھا، اُن کو Sunday Brunch Cancelled کا میسج کر

دیا ہے۔ اس طرح میری جیب سے تو کچھ نہیں گیا۔ آپ بھی آج کل اپنے دوستوں یا رشتہ داروں کی کوئی پلان کی ہوئی دعوت منسوخ کر کے ان پیسوں سے سردی میں کسی ٹھٹھرتے مزدور کو ڈھانپ کر دیکھیں، دعوت سے زیادہ مزہ آئے گا۔

اسپیچ لیس

آپ بہت سے نیکی کے کام کرتے ہیں اور پھر اکیلے بیٹھ کر خوش ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے ایک بہت اچھا کام لے لیا۔ یقین کیجیے، اچھے کام ہم خود نہیں کر سکتے اللہ تعالیٰ چاہے تو ہی ممکن ہوتا ہے۔ آج میں بھی خوش ہو رہا ہوں اور اس کی وجہ بہت مزے دار بات ہے۔ میں نے آج تک انگریزی کے لفظ اسپیچ لیس ہونے کو عملی طور پر نہیں دیکھا تھا۔ آج دیکھا اور ابھی تک اسے محسوس کر رہا ہوں اور اللہ کا شکر گزار ہوں کہ ذاتِ باری تعالیٰ نے مجھے یہ موقع فراہم کیا۔

میرے ایک دوست جو سکیورٹی کمپنی کے مالک ہیں، قد کاٹھ سے چھ فٹ کے اور دل کانچ کا نازک سا۔ لوگوں کے دکھ سکھ میں ضرور شرکت کرتے ہیں۔ آج فون کر کے کہنے لگے، میری کمپنی میں ایک گارڈ ہے جس کی تنخواہ سترہ ہزار ہے۔ اس کا پانچ سال کا بیٹا بہرہ ہے اور دونوں کانوں پر لگانے والی مشین کی قیمت چالیس ہزار ہے۔ وہ کہتا ہے، مجھے یہ رقم ایڈوانس دے دیں اور ہر ماہ میری تنخواہ سے پانچ ہزار کاٹ لیا کریں۔ سوچ رہا ہوں اس کا بارہ ہزار میں گھر کیسے چلے گا۔ پھر آپ کا خیال آیا کہ ہم مل کر اس کی کس طرح مدد کر سکتے ہیں؟ میں نے کہا، اسے میرے پاس بھیج دیں۔ ڈاکٹر نے آواز سننے کا جو آلہ لکھا ہے اسے چیک کر لوں تو بتاؤں گا کیا کرنا چاہیے۔

ایک لمبا تڑنگا نوجوان کمپنی گارڈ کی وردی میں میرے آفس آیا۔ ہاتھ میں بیٹے کے بہرے پن کی بیماری کی تشخیص اور اس کے لیے ہلال اِحمر ہاسپٹل تین تلوار کراچی کے ڈاکٹر کے لکھے گئے آلے کی پرچی تھی۔ میں نے یہ سب دیکھ کر اس سے کوئی سوال کیے بغیر خاموشی سے چیک بک نکالی اور چالیس ہزار کا چیک لکھ کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور کہا کہ جا کر بینک سے پیسے لے لو اور آلۂ سماعت خرید کر اپنے بیٹے کو لگا لو۔

وہ کبھی چیک کو دیکھتا کبھی مجھے۔ چھ فٹ کے وردی میں ملبوس مضبوط جُثے کے مرد کی آنکھوں سے آنسو ایسے گر رہے تھے جیسے مدتوں سے رویا نہ ہو اور آج سارے ہی آنسو بہانے کا موقع مل گیا ہو۔ تیس سیکنڈ اور پھر ایک منٹ گزر گیا۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بولا اور کھڑا آنسو بہاتا رہا۔ میں نے ہنس کر کہا، اپنی بیوی سے کہنا نماز پڑھ کر بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن کے لیے بھی دعا کر دیا کرے۔ وہ پھر بھی چپ رہا۔ چیک کو دیکھتا دیکھتا چپ چاپ میرے آفس سے باہر نکل گیا۔ سوچیے اس کے بہتے آنسوؤں کی زباں ہوتی تو کیا کہہ رہے ہوتے۔

مجھے اس چھ فٹ کے مضبوط جُثے والے مرد کے بہتے آنسوؤں نے زندگی میں پہلی دفعہ اسپیچ لیس ہونے کا مطلب سمجھا دیا۔ مجھے پہلی دفعہ الفاظ کی کمی کا مطلب بھی سمجھ آ گیا تھا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ مجھے یہ موقع فراہم کیا گیا کہ آج میں ایک اسپیچ لیس انسان کے بہتے آنسوؤں والی دعاؤں کو محسوس کر سکا۔

استادِ محترم

میری ایک نظم پڑھ کر نواب شاہ سے میرے ساتویں کلاس کے استادِ محترم جناب محمد بشیر بٹ صاحب نے تعریفی جملوں کے ساتھ میرے بچپن کی شرارتوں کا بھی ذکر لکھ کر میری خوب حوصلہ افزائی کی۔ کیا کمال کے انسان ہیں کہ پچاس سال بعد بھی اپنے شاگردوں کی خبر رکھتے ہیں۔ ان کی یہ محبت دیکھ کر میں بہت دیر مسکراتا رہا اور ان کی ڈانٹ ڈپٹ یاد کرتا رہا جو آج تک رہنمائی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کبھی میں بھی اپنے کسی استاد کی مسکراہٹ کا باعث بنا ہوں کہ نہیں۔

مجھے ایک موقع تو اچھی طرح یاد ہے۔ میں مارچ ۱۹۸۳ء میں سرجیکل وارڈ میں ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ ایک ضعیف بزرگ مثانے کے غدود کے آپریشن کے لیے وارڈ میں داخل ہوئے۔ صحت کوئی زیادہ اچھی نہیں تھی مگر دیکھ کر چند لمحوں میں ہی میں ان کو پہچان گیا۔ وہ اردو پرائمری مین اسکول نواب شاہ میں پانچویں کلاس میں میرے استاد سیّد امیر علی تھے، سخت طبیعت

اور اصول پرست انسان جانے جاتے تھے۔ ہماری ان سے جان نکلتی تھی اور ان کی سختیاں ہمیں بچپنے میں بھی راتوں کو جاگ کر ہوم ورک مکمل کرنے پر مجبور کر دیتی تھیں۔

آج تقریباً سولہ سال بعد اللہ نے مجھے موقع دیا تھا تو میں نے بھی ان کو اپنا تعارف کرائے بغیر دل سے ان کی خدمت کرنے کی ٹھانی۔ میں نے ان کے ساتھ جو رویہ اپنایا، وہ کچھ غیر معمولی سا تھا جو انھوں نے دو دن میں ہی محسوس کر لیا۔ دوائی تو الگ بات تھی، جب وہ کھانے سے بھی انکار کرتے تو میں خود ان کے پاس اس وقت تک کھڑا رہتا جب تک وہ کچھ کھا نہ لیتے۔ ایک شام جب میں ان کا پیشاب والی نالی نکال کر فارغ ہوا تو انھوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہا، ڈاکٹر صاحب ایک بات پوچھوں۔ میں خوب توجہ سے سننے کے انداز میں ان کے قریب ہو گیا۔ بہت محبت سے کہنے لگے آپ سب کے ساتھ ایسے ہی شفقت سے پیش آتے ہو یا یہ مہربانیاں صرف مجھ پر زیادہ ہیں۔ میں نے سوچا، اب تعارف کروانا چاہیے۔ میں نے کہا، سر آپ پانچویں کلاس میں میرے استاد تھے، اب سولہ سال بعد کوشش کر رہا ہوں کہ آپ کا کوئی احسان تو خدمت کر کے لوٹا سکوں۔

وہ اپنی بیماری بھول کر پورا زور لگا کر خود ہی اٹھ بیٹھے۔ کہنے لگے، میں بہت سخت طبیعت استاد تھا سب نالاں رہتے تھے پھر تم ایسے کیوں کہہ رہے ہو۔ میں نے نہایت ادب سے کہا کہ سر آپ کی انھی سختیوں نے تو بنیاد رکھی تھی جو آج میں ڈاکٹر کی صورت میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں۔

میری بات سننے کے بعد ان کے ہونٹوں پر آئی وہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں نمی میں آج تک نہیں بھولا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر ہلکے سے دبایا اور کہا تم بھی خوش رہو بیٹا تم نے آج میرا دل خوش کر دیا ہے کہ میں اپنے پیچھے ایسے شاگرد چھوڑ کر مروں گا۔

بابا علم دین تجھے سلام

کورونا کی وبا نے مہینوں سے ایسا مصروف رکھا کہ کبھی خیال ہی نہ آیا کہ چلو کہیں گھومنے ہی چلے جائیں۔ لوگوں کی پریشانیوں نے سب کچھ بھلا دیا۔ ہر طرف بیماری اور بے روزگاری

نے غریبوں کی مت ماردی ہے۔ دو وقت کی روٹی کو بھی لوگ ترستے نظر آتے ہیں۔ اگر آپ کے اردگرد یہ حالات ہوں تو اپنا دل بھی نہیں کرتا کہ پیٹ بھر کے کھانا کھایا جائے۔ پہلا لقمہ لیتے ہی بھوک سے مارے لوگ سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس سارے ماحول سے اتنا دل گھبرا گیا تھا کہ ہم کراچی سے نکل آئے۔ پہلا پڑاؤ ملتان میں ہوا۔ میں ملتان میں سی ایم ایچ میں ڈپٹی کمانڈنٹ رہا تھا۔ اب بھی یہاں اپنائیت سی محسوس ہوتی ہے۔ اپنے پرانے ویٹر بابا علم دین سے بھی ملاقات ہوئی جس کی میں ہمیشہ ایک بزرگ کی طرح عزت کرتا تھا۔ بڑا ہی درویش صفت آدمی ہے۔ میس میں غصہ کرنے والے آفیسرز کو ضرور کہتا رہتا کہ صاحب جی غصے پر قابو پایا کریں یہ جہاد ہے اور آپ تو جہاد کی علامت بھی ہیں۔ کسی میس ویٹر سے کوئی غلطی ہوتی تو اسے فوراً سمجھاتا کہ بیٹا اپنی غلطی مان کر فوراً آفیسر سے معافی مانگ لیا کرو تا کہ مسئلہ ختم ہو جائے۔

میں شام کو لان میں آ بیٹھا تو میرے پاس آ کر کھڑا باتیں کرنے لگا۔ بہت ہی افسردہ لہجے میں مخاطب ہوا کہ صاحب جی ہمارے فوجیوں اور سیاست دانوں کو کیا ہو گیا ہے۔ لڑلڑ کے مر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے دشمن بن گئے ہیں۔ پہلے تو گھر کے بچے ناسمجھ ہوتے تھے، اب تو گھر کے بڑے زیادہ ناسمجھ ہو گئے ہیں۔ صاحب جی ان کو کون سمجھائے گا، قوم ہار رہی ہے، ملک ڈوب رہا ہے، غریب بھوکا مر رہا ہے۔

میرے قریب ہی گھاس پر بیٹھ کر کہنے لگا، صاحب جی کوئی آپ میں سے آرمی چیف کو کہے کہ ٹی وی پر آ کر اعلان کر دے کہ بھئی آج کے بعد ہمارا سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ بس ہم ملک و قوم کے رکھوالے ہیں اور ہمیں قوم سے ویسی ہی محبتوں کی ضرورت ہے جو ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء میں ملتی تھیں۔

کوئی عمران صاحب سے جا کہے کہ غصہ کرنا چھوڑ دے۔ سب کو بے ایمان سمجھنا چھوڑ دے۔ لوگوں سے نفرت کی باتیں نہ کرے۔ ہر وقت غدار غدار نہ چیخے۔ عمران صاحب بھی تو ملک کے بڑے ہیں پھر اتنے ناسمجھ کیسے ہیں؟

کوئی نواز شریف، مریم نواز اور بلاول سے کہے کہ گلے شکوے مل بیٹھ کے کر لیں۔ اپنی فوج کی عزت رہنے دیں۔

کوئی مولانا سے کہہ دے کہ اسلام کی اصل روح تو درگزر اور بھائی چارہ ہے۔تحمل کا دامن نہ چھوڑیں۔

میں بابا علم دین کی باتیں سن کر حیران ہوا جا رہا تھا کہ اگر ایک بزرگ میس ویٹر کو فوج اور ملک وقوم کی اتنی فکر ہے تو فوجی اور سول لیڈرشپ کی انا کیوں کوہِ ہمالیہ پر ڈیرے ڈالے بیٹھی ہے جن کے تکبر اور خود پسندی نے ہمیں بند گلی میں لا کھڑا کیا ہے۔ میں نے دل بڑا کر کے بابا علم دین سے فوجی اور سول قیادت کی طرف سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آپ کی یہ فکر پریشانی سب تک ضرور پہنچاؤں گا تاکہ وہ ہارتی قوم کو سہارا دینے کو مل بیٹھیں اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی روش ترک کر کے قومی یک جہتی کی راہ ہموار کریں۔شاید بابا علم دین کی بات کسی کے دل میں اُتر ہی جائے۔

جا قدیر جا—— اللہ دے حوالے

مجھ جیسے لوگ سارا دن نئی نسل کو درس دیتے ہیں کہ اپنے ملک میں رہو۔ملک کے لیے کام کرو۔فوج میں رہے تو ملک وقوم پر مرمٹنے کا درس دیتے رہے۔

انڈیا سے کبھی ٹینشن کے حالات ہوتے تو سویلین دوست پوچھتے کہ جنگ لگے گی کہ نہیں تو سینہ تان کر کہتے، ہم ایٹمی طاقت ہیں، دشمن کی کیا مجال ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ پھر بارڈر ایریا کا ان پڑھ سا پینڈو بابا بھی کہتا پتر ڈاکٹر قدیر نوں دعا دِتا کرو۔

اس قدیر کو جس نے بارہ چودہ سال قید جیسی زندگی گزاری۔میڈیا خاموش رہا۔پچھلے سال سے بچیوں اور دوستوں سے ملنے کی اجازت لینے عدلیہ کا دروازہ بجاتا رہا مگر عدل کا گھڑیال نہ بجا۔

مر گیا تو جنازے میں نہ کوئی صدر نامدار، نہ ریاستِ مدینہ کا وزیرِاعظم، نہ تین صوبوں کے چیف منسٹرز، نہ ملک کی باگ ڈور چلاتی کابینہ کا کوئی شیر، نہ قومی اور صوبائی اسمبلی کا کوئی شہد والا ممبر، نہ اپوزیشن کے نونی نہ پیپلے نہ مولانے۔جس وردی کو ناقابلِ تسخیر طاقت بخشی، وہ بھی کہیں

نظر نہ آئی۔

پتا نہیں سندھ کے چیف منسٹر کو کیا دورہ پڑ گیا اور وہ کیسے جنازے میں جا پہنچا، پگلا۔

میں آج اپنی عسکری کالونی میں شام کی واک پر نکلا تو آٹھ دس پڑھے لکھے نوجوان لڑکوں نے سڑک پر گھیر لیا۔ کہنے لگے، انکل کیا ہم اب بھی امریکا، کینیڈا کی ایمیگریشن کے لیے درخواست نہ دیں۔ آپ لوگ تین تین تمغے اور محسنِ پاکستان کا خطاب دے کر جنازہ پڑھنے تو آتے نہیں ہیں اور ملک وقوم سے محبت کی تبلیغ کیے جا رہے ہیں۔

انکل خود ہی بنائیں ریاستِ مدینہ، ایسی محبت سے ہم باز آئے۔

ای او بی آئی کی یادیں

میں نے ریٹائرمنٹ کے بعد کاروبار کے ساتھ ساتھ خلقِ خدا کے بھلے کے لیے بھی کچھ کام کاج کرنے شروع کیے تو ایک دن جناب اقبال حیدر زیدی سے ملاقات میں معذور ورکرز کی بات چل نکلی۔ وہ ان دنوں ڈی جی، ای او بی آئی تھے اور عوامی مرکز شاہراہِ فیصل میں بیٹھتے تھے اور معذوروں کی پنشن کے معاملات سے سخت پریشان رہتے تھے۔ کہنے لگے کہ ای او بی آئی کے نظام میں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ جو لوگ معذور نہیں ہیں، وہ ڈاکٹر سے ملاپ کر کے پنشن کروا لیتے ہیں۔ ایک ماہ کی پنشن کے پیسے ڈاکٹر لیتا ہے اور پنشن شروع۔ دوسری طرف جو اصل معذور ہیں، وہ بے چارے دفتر کے دھکے کھاتے رہتے ہیں۔ ان کی کوئی بات نہیں سنتا۔ کچھ نام نہاد مزدور لیڈر بنے پھرتے ہیں اور ہمارے اسٹاف کو ڈراتے اور دھمکیاں دیتے ہیں کہ ہمارے بندے کی پنشن کی منظوری نہ ہوئی تو اپنا بندوبست کر لینا۔

میں نے سب سنا اور گزارش کی کہ میں بھی تو ڈاکٹر ہوں، اگر آپ چاہیں تو میں یہ پنشن والا نظام سیدھا کر دیتا ہوں مگر میں اپنے ساتھ لیڈی ڈاکٹر بھی کوئی ریٹائرڈ فوجی ہی رکھوں گا تا کہ وہ بھی نہ کسی مزدور لیڈر سے ڈرے نہ کسی معذور کی پنشن کرنے کے لیے اس سے ایک ماہ کی پنشن کی رقم مانگے۔ وہ تو تیار بیٹھے تھے۔ کہنے لگے، منظور ہے۔ مجھے دوسرے دن ہیڈ آفس چائے پر بلوایا

اور اپنے ایک ڈائریکٹر جناب اقبال قادری صاحب سے ملوایا۔ قادری صاحب نے کہا کہ شکر ہے کہ دونوں فوجی ڈاکٹر آرہے ہیں اور ہم لوگ اب ان لوگوں کی دھمکیوں سے بچ جائیں گے۔

چوں کہ ہیڈ آفس میں میڈیکل بورڈ منعقد کرنے کے لیے کوئی مخصوص آفس نہ تھا اس لیے قادری صاحب نے اپنا آفس مہیا کرنے کا وعدہ کرلیا اور طے ہوا کہ ہر منگل کو ہم ان کے آفس میں بیٹھ کر معذور ورکرز کی پنشن کے بارے میں فیصلے کیا کریں گے۔ میں نے اپنی ایک جونیئر میڈیکل اسپیشلسٹ میجر نوشین کو ساتھ ملایا جو تازہ تازہ سی ایم ایچ ملیر سے ہی ریٹائر ہوئی تھی اور منگل کو میڈیکل بورڈ کرنے ای او بی آئی کے آفس عوامی مرکز پہنچ گئے۔

یہاں کام کرکے اور معذور لوگوں کی مشکلات دیکھ کر اپنی قسمت پر باری تعالیٰ کی مزید شکر گزاری سیکھی۔ ہر منگل کو ان لوگوں سے مل کر حقوق العباد ادا کرنے کی طرف راغب ہوتے گئے۔ آج انھی دنوں کے دو واقعے یاد آرہے ہیں۔

اللہ دن پھیرتا ہے:

ایک دن میں نمازِ فجر کے بعد چہل قدمی پر تھا کہ مجھے سعودی عرب کے ایک نمبر سے فون آیا اور ایک خاتون نے کہا کہ انکل بشیر میں خانۂ کعبہ کے بالکل سامنے بیٹھی ہوں اور آپ کے لیے دعا کر رہی ہوں۔ میں نے خوشی سے کہا بیٹا، شکریہ، مگر آپ ہو کون؟ جب اس بچی نے اپنا تعارف کروایا تو مجھے چار سالہ پرانی میری منگل کی کہانیاں یاد آگئیں۔

۲۴ر جنوری ۲۰۱۷ء بروز منگل عوامی مرکز کراچی کے دفتر میں فرسٹ فلور پر بیٹھا میں معذوری پنشن بورڈ کے پریزیڈنٹ کی حیثیت سے معذوروں کو چیک کررہا تھا کہ دو بچیاں نقاب لگائے کالے عبایوں میں میرے آفس میں داخل ہوئیں اور کہا کہ سر ہمارے ابو بھی معذور ہیں، آپ ان کی پنشن کی منظوری دے دیجیے۔ میں نے کہا کہ اپنے ابو کو اندر لائیے تو دونوں انتہائی مغموم لہجے میں کہنے لگیں کہ وہ تو مکمل معذور ہیں اور نیچے امتیاز اسٹور کے سامنے سڑک پر رکشے میں پڑے ہیں۔ آپ مہربانی کرکے ان کو وہیں دیکھ لیں، ہم اٹھا کر اوپر نہیں لا سکتے۔ میں چپ چاپ اٹھا اور ان کے ساتھ باہر چل پڑا۔ رکشے میں انسان کے روپ میں ہڈیوں کا ایک ڈھانچا رکھا دیکھا جو سننے بولنے یا ہلنے سے بھی عاری تھا۔ میں اللہ سے توبہ کرتا ہوا واپس آ گیا۔

میں نے سیڑھیاں چڑھتے سوچا کہ معذوری پنشن تو ہو ہی جائے گی مگر خود بھی ان کی مدد کروں گا۔ میں نے اس کی معذوری پنشن کر کے کتابچہ پر دستخط کر دیے اور مٹھی میں لیے کچھ رقم بڑی بچی کو پیش کی۔ وہ بچی تڑپ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور کہنے لگی، سر ایسا نہ کریں۔ بس آپ نے ہمارے ابو کا حق ان کو دے دیا، ہمارے لیے یہی کافی ہے۔

اب میری اور اس بیس سالہ غیرت مند بچی مائرہ کی گفتگو پڑھیے:

نہیں بیٹا، یہ پیسے لے لو اور اپنے ابو کے لیے دوائی اور اچھی خوراک کا بندوبست کروتا کہ وہ جلد اچھے ہو جائیں۔

مائرہ: نہیں، سر ہم خیرات نہیں لیتے، ہم تو خود کماتے ہیں۔

کون کماتا ہے؟

مائرہ: سر میں رابعہ سیکنڈری اسکول بابا ولایت علی شاہ کالونی میں پڑھاتی ہوں اور میرا چھوٹا بھائی ایک فیکٹری میں نوکری کرتا ہے۔

بیٹا مہینے میں کتنا کما لیتے ہو؟

مائرہ: سر میں (۲۵۰۰) اڑھائی ہزار اور میرا بھائی (۷۰۰۰) سات ہزار۔ مکان کا کرایہ اور ابو کی دوائی کا ہو جاتا ہے۔ بس ہم کھانا ایک ہی وقت پیٹ بھر کر کھا لیتے ہیں۔ اب ابو کی پانچ ہزار پنشن ملنے لگے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چھوٹی بہن بھی دوبارہ پڑھنے جایا کرے گی۔ سر، ابو جب بول سکتے تھے تو سمجھاتے تھے کہ بیٹا بھوکے مر جانا مگر اللہ کے سوا کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا۔ سر، ہمارا پکا یقین ہے، ابو ایک دن اٹھ بیٹھیں گے اور اللہ ہمارے دن بھی پھیر دے گا۔

میں چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا۔ میں نے اپنے آنسو چھپاتے ہوئے پنشن بک اسے تھما دی۔ اتنی غربت میں گھری اتنی غیرت مند اور اللہ پر اتنے پکے یقین والی بچی میں بھی پہلی دفعہ دیکھ رہا تھا۔

چوں کہ میں تہیہ کر چکا تھا کہ ان کی مدد کرنی ہے، اس لیے جب بچیاں کلرک کے پاس بک کے اندراج کے انتظار میں تھیں تو میں دوبارہ سڑک پر کھڑے رکشے تک گیا اور ان کے ابو کی جیب میں حسبِ توفیق کچھ ڈال کر واپس اپنے آفس میں آ بیٹھا۔

میں نے بچیوں کو دوبارہ بلوایا۔ ان کی اجازت سے یادگار کے طور پر ان کی اور تمام کاغذات کی تصویر لی اور وہ خدا حافظ کہہ کر چلی گئیں۔ پھر ایک آدھ دفعہ اس بچی نے اپنے کسی مسئلے کے لیے رابطہ کیا اور آج چار سال بعد اس کے فون نے مجھے حیران کر دیا۔

اس نے بتایا کہ ابو اسی سال فوت ہو گئے تھے۔ دو سال پہلے کسی کے توسط سے سعودی عرب میں کام کرتے ایک پاکستانی سے اس کی شادی ہو گئی تو اس کے میاں نے اس کے بھائی کو بھی ویزا دلوا کر جدہ بلوا لیا۔ اس کی ماں اور بہن بھی عمرہ کر چکی ہیں۔ کہنے لگی، بشیر انکل اللہ نے ہمارے دن پھیر دیے۔ ابو کی باتیں سچ ہو گئیں۔ اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ چوں کہ آپ نے ہمارے ابو کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا، اس لیے آپ ہمیشہ ہماری دعاؤں میں رہتے ہیں۔ میرے ابو کی جیب میں ڈالی ہوئی آپ کی وہ رقم اب بھی ہم پر قرض ہے۔ میں اس سال رمضان کے بعد بہن کی شادی کرنے پاکستان آؤں گی۔ بتائیں آپ کے لیے کیا لاؤں؟

سوچا کیا مانگوں۔

میں نے کہا، بیٹا آپ اللہ کے گھر میں بیٹھی ہیں۔ ہمارے لیے ربِ کریم سے اپنے جیسی مزید بیٹیاں مانگ دو کیوں کہ ہمیں ہر گھر میں آپ جیسی بیٹیاں چاہییں۔

دوسرا واقعہ:

ایک منگل کو پہنچا تو پہلے سے ہی چھ سات معذور محنت کش اپنی پنشن کروانے کے لیے انتظار کر رہے تھے۔ میں نے ان کو اپنی ساتھی ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی بلوانا شروع کر دیا تا کہ ان کو مزید انتظار نہ کرنا پڑے۔

دو بچیاں جن کی عمریں تقریباً چھ اور آٹھ سال ہوں گی میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس دونوں آنکھوں سے نابینا ایک شخص کا ہاتھ پکڑے رہنمائی کرتی میرے آفس میں لائیں۔ میں نے اس شخص کی میڈیکل رپورٹ دیکھی تو پتا چلا کہ فیکٹری میں کیمیکل گرنے سے اس کی دونوں آنکھیں ضائع ہو گئی تھیں۔ میں نے کوئی سوال کیے بغیر ہی اس کی پنشن کر دی اور بڑی بچی سے کہا کہ ابو کو باہر بٹھاؤ۔

خوش ہو کر کہنے لگی، انکل ابو کو پنشن والے پیسے تو دو۔ میں نے کہا، بیٹا آٹھ دس دن میں

پیسے ابو کے بینک میں آ جائیں گے۔ وہ یک دم رونے لگ گئی۔ میں نے پیار سے کہا کہ بیٹا رو کیوں رہی ہو؟ پنشن تو ہوگئی ہے، پیسے بھی مل جائیں گے۔ کہنے لگی، انکل امی نے کہا تھا آج ابو کے پیسے مل جائیں گے۔ ہم نے تو نہاری اور نان لینے تھے۔ انکل بہت بھوک لگی ہے۔ امی نے ناشتا بھی نہیں دیا آج۔ ہمارے گھر میں کچھ تھا ہی نہیں۔ بچی کے باپ نے اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا اور بولا، سر اس کی بات معاف کرنا۔ ناسمجھ بچی ہے۔

اسی وقت آفس بوائے میرے کمرے میں داخل ہوا اور کہنے لگا، سر زونل ڈائریکٹر صاحب ٹی بریک پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں کبھی نابینا باپ اور بھوکی بچیوں کو دیکھ رہا تھا اور کبھی آفس بوائے کو۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں بچی کو کھینچ کر گلے لگاؤں اور اس کے ساتھ روتا رہوں یا زونل ڈائریکٹر کے آفس جا کر اس کے ساتھ گرما گرم چائے پی لوں۔

نان نہاری کے بندوست کے ساتھ بچیوں کو رخصت کر کے اس دن میں نے اللہ تعالیٰ سے بہت دعائیں مانگیں تھیں کہ پروردگار ہمیں ایسی آزمائشوں سے بچا کے رکھ۔ پھر میں نے ۲۰۱۷ء کے آخر میں ای او بی آئی جانا نئے زونل ڈائریکٹر کے غیر انسانی رویوں کی وجہ سے چھوڑ دیا کیوں کہ معذوروں سے ہوتی زیادتیاں دیکھتا رہتا تو اب تک ہارٹ اٹیک سے مر چکا ہوتا۔

عیدِ قرباں

اس دفعہ جو دو بکرے میں نے قربانی کے لیے خریدے، وہ کسی طرح بھی نمائش کے قابل نہ تھے کہ دوستوں یا عزیزوں پر رعب ڈال سکتا کہ ہم سا ہو تو سامنے آئے۔ بہر حال قربانی تو ہو ہی گئی عین سنتِ ابراہیمی کے مطابق۔

دراصل دل چاہ رہا تھا کہ عیدِ قرباں پر سنتِ ابراہیمی تو پوری کروں مگر قربانی کی اصل روح کو کسی طرح سمجھ پاؤں اور اس پر عمل بھی کروں۔

ہوا ایسے کہ چار دن پہلے نواب شاہ گیا تو اپنے آبائی گاؤں ڈھولے والی گوٹھ اپنے پرانے چودھری دوستوں سے بھی ملنے چلا گیا۔ ان کے قربانی کے جانور دیکھ کر اور ان کی قیمت سن کر

گھبراہٹ ہونے لگی۔ کوئی جانور سات آٹھ لاکھ سے کم نہ تھا اور ہر دوست دو دو تین تین جانور دکھا کر رعب جھاڑ رہا تھا۔ مجھے زیادہ گھبراہٹ اس وقت ہوئی جب ایک بچے نے مجھے چائے پلاتے ہوئے اپنی بپتا سنائی۔

یہ بچہ اور اس کی بیوہ ماں میرے خدا ترس چودھری دوست کے گھر میں کام کرتے ہیں۔ بچے نے پچھلے سال ستمبر میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان ستاسی فی صد نمبروں سے پاس کیا۔ میڈیکل کالج کا انٹری ٹیسٹ بھی پاس کیا۔ لسٹ میں نام بھی آیا مگر ستر ہزار روپے نہ ہونے کی وجہ سے فارم نہ بھر سکا۔ چودھری صاحب سے ماں نے التجا کی کہ ساری زندگی خدمت کروں گی، بس بچے کی پڑھائی کے لیے یہ رقم ادھار دے دیں۔ چودھری صاحب کی دی گئی کوٹھڑی خالی کرنے کی دھمکی کام کر گئی اور پھر بچے کو بھی نصیحت کی گئی کہ اچھے بھلے ماں کے ساتھ کام پر لگے ہو، کیوں پانچ سال کی خواری میں کود رہے ہو۔ ڈاکٹر بن کر نوکری ڈھونڈتے پھرو گے۔ اس طرح چودھری صاحب نے بچے کی بھلائی کے لیے اس کو اپنے مہمانوں کی دیکھ بھال کی ڈیوٹی پر لگا لیا۔

بچے کی بات سنتے سنتے میری چائے ٹھنڈی ہوگئی اور اتنے میں چودھری صاحب بھی پوری شان وشوکت سے نمودار ہوئے۔ میری ان سے دوستی برسوں سے ہے مگر ان کی خدا ترسی اور قربانیوں پر آنکھیں آج کھلیں۔ دل چاہا کہ اپنے اس دوست کی چودھراہٹ کو اس کے پچیس تیس لاکھ کے جانور کے ساتھ ہی ذبح کر دوں تاکہ اصل قربانی ہو جائے اور ایک نوالہ ضرورت مندوں کے پیٹ میں بھی چلا جائے۔ کاش میں ایسا کر سکتا۔

میں نے اب اپنے اس دوست سے تو کیا باتیں کرنی تھیں، بس دل تھا کہ اٹھوں اور چیخ چیخ کر لوگوں سے پوچھوں کہ کیا قربانی صرف آٹھ دس لاکھ کی گائے کاٹنے کا نام ہے۔ معزز طریقے کے مطابق اپنے دوست کو میں شاید ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ کر اٹھ آیا۔

نواب شاہ سے دو مناسب قیمت کے بکرے خریدے اور اپنی استطاعت کے مطابق کچھ رقم بچا کر الگ کر لی۔ کراچی روانگی سے پہلے اس بچے کے نام ایک خط چھوڑ آیا ہوں اس امید پر کہ شاید وہ بچہ میرا خط پڑھ کر اپنی ماں کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ میرے کم قیمت بکروں کی قربانی بھی قبول کر لے۔

توکّل

۲۰۱۲ء میں ریٹائر ہوا تو ایک دم ایسا لگا جیسے بے روزگار ہو گیا ہوں، حالاں کہ زندگی کے تیس سال بھرپور نوکری کر کے فارغ ہوا تھا۔ شاید یہ ہمارے ایمان کی کم زوری ہوتی ہے کہ آنے والے کل کی فکر نہیں چھوڑتی۔ یقیناً یہی وہ فکر تھی کہ کوئی کاروبار کرنے کا سوچا اور کاروبار شروع بھی کر دیا۔ اب تو بچوں کی شادیاں بھی کر چکا ہوں۔ وہ دونوں خود کفیل ہیں۔ خوشی خوشی اپنی زندگی گزار رہے ہیں مگر ان کی فکر سے پھر بھی جان نہیں چھوٹتی کہ ہم نہ رہے تو بچوں کو کسی ضرورت کے وقت کمک کہاں سے ملے گی۔ حالاں کہ رازق تو موجود ہے ہر جگہ ہر لمحے اور بعض اوقات وہ اپنے ہونے کا یقین آپ کو ایسے دلاتا ہے کہ آپ ہکا بکا رہ جاتے ہیں۔

چند دن پہلے کوئٹہ جانے کا اتفاق ہوا۔ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ براستہ حب، اوتھل، خضدار اور قلات سے ہوتے ہوئے کوئٹہ پہنچنا تھا۔ راستے میں لنچ کرنے کے لیے ایک ہوٹل پر رکے اور بلوچی ہوٹل پر مٹن کڑھائی بنوائی۔ کھانا خوب سیر ہو کر کھایا لیکن پھر بھی کچھ کھانا بچ گیا۔ میں نے کڑھائی گوشت ایک پلاسٹک کے کنٹینر میں ڈلوایا۔ ساتھ تازہ نان منگوائے اور ایک چودہ پندرہ سالہ بچے کو جو لوگوں کی گاڑیاں صاف کر رہا تھا، تھما کر کہا کہ بیٹا لو کھانا کھا لو۔ بچہ قریب ہی بیٹھ کر کھانا کھانے لگا اور ہم چائے پینے لگے۔

اس بچے نے خود کھا کر بچا ہوا کھانا قریب بیٹھے دو کتوں کے سامنے رکھا اور ہماری میز پر پانی پینے آ گیا۔ میں نے اس کی یہ حرکت دیکھ کر غصے میں کہا کہ اتنا اچھا اور مہنگا کھانا تم نے کتوں کو کیوں ڈال دیا، بچا تھا تو رات کو کھا لیتے۔

میری بات سن کر وہ لڑکا عجیب بے پروائی سے بولا، صاحب کتے بھی صبح سے بھوکے تھے اور رہا میرے رات کے کھانے کا سوال تو جس رب نے ابھی کڑھائی گوشت کھلایا ہے وہ رات کو کیسے بھوکا سونے دے گا۔ میں اس کی بات سن کر دس منٹ تک کچھ کہے بغیر ہکا بکا لاجواب بیٹھا رہا۔ اپنے غصے اور اس سے کہے گئے الفاظ پر انتہائی شرمندگی سے کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ ایک ان پڑھ سے دیہاتی بچے کے ایک جملے نے میری ساری زندگی کی سوچ اور فکر کو ہوا میں اڑا دیا۔ بچے نے مجھے

توکّل اوراصل رازق کے معنی بغیر کسی تفصیل بغیر کسی حوالوں کے ایک منٹ میں سمجھا دیے۔

میں کراچی واپس آ گیا۔ اپنے کل کی فکر سے تو جان چھوٹ ہی گئی ہے مگر ساتھ ساتھ توکل پر زندگی گزارنے کا سلیقہ اپنانے کی راہ پر بھی چل پڑا ہوں۔ میں اس لڑکے کی سوچ کی بلندی کو تو نہیں پہنچ سکتا کہ جو اردگرد کے کتوں کی بھوک کا بھی خیال رکھتا ہے مگر اپنے ربِ کریم سے دعا مانگتا رہتا ہوں کہ مجھے ایسا بنا دے کہ کم از کم کسی انسان کو بھوکا دیکھوں تو اس سے اپنا کھانا ضرور بانٹ لیا کروں۔ ان شاء اللہ اس بچے کی طرح اگلے وقت کے کھانے کی فکر سے بھی جلد آزاد ہونے کی کوشش کروں گا۔

نوکری کرنے کی اجازت نہیں ہے

ایک دن کسی دوست نے تجویز دی کہ نیشنل ہائی وے پر اسٹیل مل سے آگے گلشنِ حدید کے بعد بائیں جانب بہت غریب سی بستی ہے، ان کے لیے بھی کچھ کریں۔ ہم نے حسبِ توفیق کچھ راشن، بستر اور جوتے خریدے اور پوری ٹیم کے ساتھ اتوار کی صبح اس بستی میں جا پہنچے۔ سو سے زیادہ کچے پکے مکان اور جھگیوں پر مشتمل اس بستی کے مرد حضرات چارپائیوں پر بیٹھے چائے، سگریٹ پینے یا خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ عورتیں اور نوجوان بچیاں اِدھر اُدھر بیٹھی تھیں۔ ہم پہنچے تو یہ سب ہماری گاڑیوں پر ایسے حملہ آور ہوئے جیسے سامان ہم سے لیں گے نہیں بلکہ چھینیں گے۔

میں نے سوچا سامان بانٹنے سے پہلے ان سے بات کرنی چاہیے، ان کے مسائل پوچھنے چاہییں۔ خیال تھا کہ اگر ان لوگوں کو کام پر لگایا جائے تو ان کی غربت بھی ختم ہوگی اور اس بستی میں خوش حالی بھی نظر آئے گی کیوں کہ ہر گھر میں دو دو تین تین بچیاں اور اسی طرح لڑکے اور مرد نظر آ رہے تھے۔

میں عسکری ۴ کراچی میں رہتا ہوں۔ اس کالونی میں بہت سارے بزرگ اکیلے رہتے ہیں اور ان کے بچے روزگار کے لیے کراچی سے باہر ہیں یا کچھ تو ملک سے ہی باہر ہیں۔ بہت ساری نوکری پیشہ خواتین ہیں اور ان سب کو گھر کے لیے آیا، میڈ، مالی اور ڈرائیور کی تلاش رہتی ہے۔

میں نے سامان بانٹنے سے پہلے جیپ پر چڑھ کر تقریر کر ڈالی کہ ہم آپ کی مدد کرنے بھی آئے ہیں اور نوکری کا بندوبست بھی کر رہے ہیں۔ آج ہی بچیوں اور عورتوں کو گھروں میں نوکری دیں گے اور اگر کوئی ڈرائیونگ جانتا یا مالی کا کام جانتا ہے تو تیار ہو جائے نوکری پکی۔

آپ یقین کیجیے کہ اندازاً سو نفوس کی اس بستی سے میں کسی ایک مرد، کسی ایک لڑکے، کسی عورت یا ایک بچی کو نوکری یا کام کرنے پر راضی نہ کر سکا۔ اکثر مردوں کا جواب تھا کہ طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ عورتوں اور بچیوں کا جواب تھا کہ ہمارے خاندان میں باہر نوکری یا کام کرنے کی اجازت نہیں ہے اور نوجوان لڑکے کہہ رہے تھے کہ ہم گھروں کے لیے پانی بھر کر لاتے ہیں اس لیے کام پر نہیں جا سکتے۔ یہ سب بظاہر انتہائی غربت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ سب فارغ ہیں۔ شہر جاتے ہیں۔ گھومتے ہیں، امداد لیتے ہیں، شہر کے دسترخوانوں پر مفت کھانا کھاتے ہیں۔ سڑک پر کھڑے ہو کر آتی جاتی گاڑیوں میں چڑھ کر مانگتے ہیں۔ یہ سب اب ان کا اصل پیشہ ہے۔ میں نے اس صورتِ حال میں سامان کس دل سے بانٹا تھا، یہ خدا جانتا ہے۔

دوسری طرف بہت سے سفید پوش ضرورت مند لوگ کبھی میرے آفس آ جائیں اور میں کوئی مدد کرنا چاہوں تو وہ انکار کر دیتے ہیں کیوں کہ ان کے آنے کا مقصد کچھ مانگنا نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں، کسی جاب پر لگوا دیں گے تو مہربانی ہوگی۔ ہمارے اردگرد اصل ضرورت مند اور امداد کے حق دار یہی لوگ ہیں۔

میری عمر اب چھیاسٹھ سال ہے اور میں دن میں بارہ گھنٹے کام کرتا ہوں۔ میرا بیٹا، بہو، بیٹی اور بیوی سب کام کرتے ہیں۔ جب ہم سڑکوں، چوراہوں اور شاپنگ سینٹر کے باہر کھڑے پیشہ ور فقیروں کو ثواب اور جنت کے لالچ میں پیسے دیتے ہیں تو کوئی کیوں کام کرے گا۔ ہمارے یہی رویے بڑے شہروں کے اردگرد نکمے، کام چور اور ہڈ حرام لوگوں کی بستیاں بسانے کا سبب بن رہے ہیں۔ ہم مزدور کی مزدوری دیتے ہوئے کنجوس ہو جاتے ہیں مگر گلی کوچوں میں بھیک مانگتے ہٹے کٹے مردوں، بچوں اور نکمی عورتوں کے لیے سخی بن جاتے ہیں اور یہی سخاوت ہمیں لے ڈوبی ہے۔

قرآن کی قسمیں

چند دن پہلے ایک شخص کو ہاتھ میں تسبیح لیے مسجد سے نکلتے دیکھا تو میں نے بڑھ کر سلام کیا۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ تسبیح کے دانے تیزی سے گرانے لگا اور مجھ سے پوچھا کہ آپ کون ہو؟ مجھے کچھ حیرانی تو ہوئی مگر جب وہ بغیر کچھ کہے آگے بڑھ گیا تو میں ہکا بکا کھڑا اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

میں سن ۲۰۰۰ء میں ترقی پا کر لیفٹیننٹ کرنل بنا تو سی ایم ایچ میں اسٹاف سرجن پوسٹ ہوگیا۔ جنرل پرویز مشرف کے مارشل لا کے ابتدائی دن تھے اور مختلف محکموں کی نگرانی پر کوئی نہ کوئی کرنل براجمان تھا، جیسے پوری فوج انڈیا فتح کرنے کے بعد اب پاکستان سنوارو کی ڈیوٹی پر مامور ہوگئی ہو۔ لاگ ایریا کراچی سے ایک حکم صادر ہوا اور میں کراچی میں پریذیڈنٹ ہیلتھ مانیٹرنگ ٹیم نامزد ہوگیا۔ مجھے فارما سیوٹیکل کمپنیز اور کراچی کے تمام ہاسپٹل اور ہیلتھ انسٹی ٹیوشنز کی مانیٹرنگ کر کے کرپشن کا سدِ باب کرنا تھا۔

مجھے پہلا کیس پولیس سرجن کراچی کا ملا اور الزام تھا کہ وہاں کھلے عام میڈیکولیگل کیسز میں رشوت لی جاتی ہے اور جھوٹے اور غلط سرٹیفکیٹ بنا کر دیے جاتے ہیں۔ میں نے غیر روایتی طریقہ اپنایا اور ایک دوپہر سول کپڑوں میں اپنے ایک دوست ڈاکٹر آغا فریدون کے ساتھ پولیس سرجن کراچی کے دفتر میں ایک وزیٹر کی حیثیت سے ملنے کے بہانے جا بیٹھا۔ ڈاکٹر آغا نے پولیس سرجن سے میرا اصل تعارف نہ کروایا کہ میں کون ہوں اور یہاں آنے کا میرا مقصد کیا ہے۔ میرے ہی سامنے ایک میڈیکولیگل آفیسر نے لفافے میں کچھ رقم لا کر پولیس سرجن کو دی۔ انھوں نے رقم گن کر اپنے اس جونیئر کو خوب ڈانٹا کہ اتنی کم رقم میں کیوں رپورٹ بنا کر دی ہے۔ پولیس سرجن صاحب نے رقم دراز میں ڈالی اور ظہر کی نماز کے لیے جائے نماز بچھا لیا۔ ڈاکٹر آغا زور سے ہنسا کہ یہ کیا ڈراما ہے، ایک طرف رشوت اور فوراً جائے نماز پر۔ پولیس سرجن نے ہنستے ہوئے کہا کہ سائیں، مولا جھولی بھر بھر کر دیتا ہے تو اس کا شکریہ تو ادا کروں گا ناں۔

پولیس سرجن نے نماز کے بعد کراچی کی مشہور صابر نہاری سے کھانا منگوا کر ہماری تواضع کی اور ہم ان کا شکریہ ادا کر کے واپس آ گئے۔ کراچی کا پولیس سرجن بیس گریڈ کا ڈاکٹر ہوتا ہے جس کی ایک غلط رپورٹ پر لوگ سالوں جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند ہو جاتے ہیں یا پھانسی پر بھی چڑھ جاتے ہیں۔

میں نے دوسرے ہی دن پولیس سرجن کراچی کے نام نوٹس نکال دیا اور ایک سال کے میڈیکولیگل ریکارڈ کے ساتھ ایک ہفتے بعد لاگ ایریا بلوا لیا۔ ان دنوں ہمارے پاس موبائل فون نہیں ہوتے تھے۔ کراچی میں میرا کون سا دوست اور جاننے والا نہ تھا جس کا مجھے لاگ ایریا یا گھر پر فون نہ آیا ہو۔ کچھ دوستوں نے تو خود قسمیں کھا کر پولیس سرجن کی پارسائی کا یقین دلایا۔ میں انھیں کہتا رہا کہ معمولی سی چھان بین ہے، آپ فکر نہ کریں۔

مارشل لا ہو تو ۵ کور ہیڈ کوارٹر اور کراچی لاگ ایریا کی پراسرار بیرکوں کے کاریڈور مزید خوف ناک لگنے لگتے ہیں۔ دیے گئے دن اور وقت پر پولیس سرجن صاحب باقاعدہ سوٹ بوٹ میں میرے دفتر میں داخل ہوئے تو ان کے کانپتے ہاتھوں میں قرآنِ کریم کا چھوٹا سا نسخہ تھا اور شکل وصورت پر عاجزی اور انکساری نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ میں یونی فارم میں تھا اور اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ میں اس کے دفتر میں اس کے ساتھ صابر کی نہاری بھی کھا چکا ہوں۔ میں نے اپنی کرسی سے اٹھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔ عزت سے بیٹھنے کو کہا مگر ان کے ہاتھ کانپتے رہے۔ میں نے ان کے خلاف پاکستان رینجرز سندھ کی تیار کردہ فائل کھولی تو وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ہاتھوں میں لیے قرآن کو آگے کر کے کہنے لگے، سر میری چار بیٹیاں ہیں اور بیٹا نہیں ہے۔ مجھے اس قرآن کی اور اپنی بیٹیوں کی قسم ہے، میں نے زندگی میں کبھی رشوت نہیں لی۔ اپنی بیانیوں کو ہمیشہ حلال کھلایا ہے۔ کیوں کہ میں حلال روزی پر یقین رکھتا ہوں۔ آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے کیوں کہ لوگ میرے عہدے سے جلتے ہیں اور مجھے اس سے ہٹانا چاہتے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ یاد کریں کہ کبھی کوئی غلط کام کیا ہو یا رشوت لی ہو تو اقرار کر لیں تاکہ ہم مزید تفتیش اور گواہوں کے جھمیلے میں نہ پڑیں۔ وہ مسلسل انکار کرتا رہا تو میں نے کہا کہ میرے ایک دوست ڈاکٹر آغا نے بتایا تھا کہ آپ کے دفتر کے قریب مشہور صابر کی نہاری ملتی ہے اور

لوگ دور دور سے کھانے آتے ہیں۔ ایک دن میں نے بھی آپ کے ساتھ کھائی تھی مگر آپ کو شاید یاد نہیں رہا۔ اسے تو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ مجھے غور سے دیکھتے رہے اور رنگ پھیکا پڑتا گیا۔ قرآنِ کریم کا نسخہ میز پر ہی رکھا رہ گیا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور میرے پاؤں چھونے کو میری طرف بڑھا مگر میں کرسی سے اٹھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے اس کے لیے چائے منگوئی۔ وہ کانپتے ہاتھوں چائے کا کپ پکڑے مسلسل منت سماجت کرتا رہا کہ ایک موقع دے دیں مگر میں خاموشی سے رپورٹ لکھتا رہا۔ رپورٹ پرنٹ ہو کر آئی تو پولیس سرجن صاحب کے سامنے دستخط کے لیے رکھ دی۔

پھر ہماری کوئی بات نہ ہوئی۔ جانے سے پہلے میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب جو مرضی کریں، یہ سب آپ نے خود ہی بھگتنا ہے جیتے جی یا مرنے کے بعد مگر قرآن اور بیٹیوں کی جھوٹی قسمیں کھانا بند کر دیں۔ وہ چپ چاپ میرے آفس سے نکل گیا۔ پھر مجھے بہت سفارشیں آتی رہیں۔ دوست ناراض بھی ہوئے مگر پولیس سرجن کی نوکری نہ بچ پائی۔ مجھے ذاتی تجربہ یہ ہوا کہ جو جتنا بدعنوان ہے ہمارے معاشرے میں اس کے اتنے ہی زیادہ سفارشیں کرنے والے بھی ہیں۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ دو سال بعد کورٹ سے آرڈر لے کر نوکری پر بحال ہو گیا تھا۔ میں نے ریٹائرمنٹ کے بعد میڈیسن سپلائی کا کاروبار شروع کیا تو ایک جگہ ان سے ملاقات ہوگئی، کہنے لگے، سر آپ سے ایک شکوہ ہے کہ آپ جتنی عزت سے پیش آئے تھے، اتنا میرا خیال نہیں کیا گیا اور کوٹ میں بحالی کے لیے مجھے بہت رقم دینی پڑ گئی تھی۔ اچھا ہوتا وہ آپ ہی لے لیتے۔ میں چپ رہا اور اس کی بات ٹال دی۔

اب مسجد کے باہر اس سے ملاقات ہوئی تو یہ سب دوبارہ یاد آ گیا۔ دوستوں سے بات ہوئی تو پتا چلا کہ اس کی یادداشت متاثر ہو چکی ہے۔ بچیاں اپنے اپنے گھروں کی ہوگئی ہیں اور بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ڈیفنس کراچی میں ہزار گز کے بنگلے میں اکیلا رہتا ہے۔ زندگی کی کُل مصروفیات مسجد جانا اور سڑکوں کے چکر لگانا رہ گیا ہے۔ راستہ بھول جائے تو گلے میں ڈالا ایڈریس کارڈ دیکھ کر اسے لوگ اس کے چھوڑ جاتے ہیں۔ نہ کسی دوست کو پہچانتا ہے نہ بیٹیوں

کے گھر جاتا ہے۔

دعا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی مشکلیں آسان کرے اور ہمیں قرآن کی جھوٹی قسمیں کھانے کی بجائے اس کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ہزار روپے کا کمال

چھ مہینے پہلے ایک خاتون کورنگی سے اپنی گیارہ سالہ لاغر سی بھتیجی کے ساتھ میرے دفتر آئی اور بتایا کہ اس کا بھائی اور اس بچی کا باپ نفسیاتی مریض ہے اور گھر میں سب سے لڑتا ہے اور بیوی بچوں کو مارتا ہے۔ سنا تھا آپ غریب مریضوں کو فری میڈیسن دے دیتے ہیں۔ بچی سے اس کے والد کے بارے میں تفصیل پوچھ لیں اور مدد کر دیں، ہم آپ کو دعائیں دیں گے۔ میں نے بچی سے تفصیل پوچھنی شروع کی تو بچی متاثر کن سمجھ داری سے اپنے والد کی بیماری کے بارے میں بتانے لگی۔ تفصیل سننے کے بعد میں نے پوچھا، بیٹا تم کس کلاس میں پڑھتی ہو تو کہنے لگی، سر چھٹی کلاس میں پڑھتی تھی، اب اسکول نہیں جاتی۔ باپ ذہنی مریض ہونے کی وجہ سے دو سال سے کام نہیں کرتا اور ماں دوسروں کے گھروں میں کام کر کے صرف ہمیں پال رہی ہے۔ اسکول کی کتابوں اور فیس کے لیے پیسے نہیں ہوتے، اس لیے اسکول جانا چھوڑ دیا ہے۔

میں نے کہا، چلو اگر کتابیں اور فیس کا بندوبست ہو جائے تو اسکول جانا شروع کر دو گی؟ سن کر رونے لگی کہ انکل چھوٹے دونوں بہن بھائی بھی اسکول نہیں جاتے۔ اکیلے میں کیسے جاؤں گی۔ میں نے فیس پوچھی تو کہنے لگی کہ سب کی ایک ایک ہزار روپے ماہوار فیس ہے۔ میں نے تینوں کی فیس اور کتابیں لے کر دینے کا وعدہ کیا۔ روتے روتے کہنے لگی، انکل ہم نے کبھی کسی سے پیسے نہیں مانگے۔ شرم آتی ہے۔ آپ سے کیسے مانگا کریں گے ہر مہینے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا، بٹیا، بنا مانگے ہی مل جایا کریں گے۔ وہ خوش ہوگئی مگر آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

اس کے والد کی دوائی تو دینا ہی تھی۔ ان تینوں بچوں کی کتابوں اور ایک ماہ کی فیس کا بندوبست بھی کر دیا اور بچی سے وعدہ لیا کہ کل سے ہی چھوٹے دونوں بہن بھائیوں کے ساتھ

دوبارہ اسکول جانا شروع کرے۔ انھوں نے دو چار دن بعد اسکول جانا شروع کر دیا۔ میں نے بریگیڈئیر بشیر فاؤنڈیشن کے عملے کو ہدایات دے دیں اور بچوں کو اسکول کی فیس اور مریض کو دوائی بن مانگے ہی پہنچنے لگی۔ پچھلے چھ مہینوں میں بچی نے صرف ایک آدھ دفعہ ہی کتابیں کاپیاں خریدنے کے لیے مزید کچھ پیسے مانگے ہوں گے۔

آج اپنے چھوٹے ماموں کے ساتھ یہ بچی دوبارہ میرے دفتر آئی۔ صاف ستھرے کپڑوں میں بہت خوش لگ رہی تھی۔ مٹھائی کا ایک چھوٹا سا پیکٹ اور ایک لفافے سے مارکس شیٹ اور میڈل نکال کر میرے سامنے میز پر رکھ کر کہنے لگی، انکل یہ سب آپ کی مہربانی سے ہوا ہے۔ میں نے چھٹی کلاس میں فرسٹ پوزیشن لی ہے اور ساتویں کلاس میں چلی گئی ہوں۔ میں کبھی بچی کو دیکھ رہا تھا، کبھی میڈل اور مارکس شیٹ کو۔ کہنے لگی، انکل اب ابو بھی بہت بہتر ہیں اور ہمیں مارتے بھی نہیں ہیں۔

میں نے اپنی آنکھیں خشک کر کے میڈل اس کے گلے میں ڈالا اور مارکس شیٹ ہاتھ میں دے کر اس کی تصویر بنائی۔ کہنے لگی، انکل آپ کا بہت شکریہ اور اگر آپ آئندہ فیس دیتے رہے تو میں بھی آپ کی طرح ڈاکٹر بن کر لوگوں کی خدمت کیا کروں گی۔

میں نے بچی کو محبت سے اس وعدے کے ساتھ رخصت کیا کہ اسے فیس مسلسل ملتی رہے گی۔ بہت دل چاہتا ہے، جا کر اس اسکول کے مالک کا بھی شکریہ ادا کروں جو بچوں کو صرف ایک ہزار روپے ماہوار فیس پر اچھی تعلیم و تربیت دے رہا ہے اور بچے ڈاکٹر بننے کے خواب بھی دیکھ رہے ہیں۔

اللہ کرے میرے جیتے جی اس بچی کے سارے خواب سچ ہو جائیں۔

رمضان

آج تیسواں روزہ ہے اور کل عید منا کر ہم دوبارہ اپنی پرانی ڈگر پر لوٹ جائیں گے۔ جعلی پرہیزگاری ختم، مسجدیں دوبارہ ویران، روایتی ریاکاری اور جھوٹ کی دنیا میں واپس۔ البتہ کچھ

چیزیں ضرور سستی ہو جائیں گی جن کا استعمال رمضان میں زیادہ ہونے کی وجہ مسلمان مہنگی کر دیتے ہیں۔ کسی جاپانی نے اپنے مسلمان دوست سے حسرت سے کہا کہ جن چیزوں سے آپ ایک ماہ کے لیے پرہیز کرتے ہیں، ہمیں ان سے پورا سال ممانعت ہے مگر اب مسلمان اس طرح کی باتوں کی کاٹ بھی سمجھنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔

ہم ناشکرے لوگوں سے کوئی پوچھے کہ روزے کیسے گزرے تو جواب ہوتا ہے، مزے کے رہے۔ پتا ہی نہیں چلا اور گزر گئے۔ ٹھنڈے گھر، ٹھنڈی گاڑیاں اور ٹھنڈے آفس۔ یہ ہے روزہ رکھنے کا ہمارا احوال اور پھر بھی ناشکرے مجمعے میں سے کوئی نہیں کہتا، شکر الحمدللہ پروردگار کے کرم سے روزے اچھے گزرے۔

دوسری طرف میں روزانہ جب دس بجے اپنی گاڑی میں دفتر کے لیے نکلتا ہوں تو ڈالمیا روڈ پر ایک زیرِ تعمیر عمارت کے باہر تپتی دھوپ میں پسینے میں شرابور روزے دار مزدوروں کو ریت، سیمنٹ اور اینٹوں کے ڈھیر سے اٹکھلیاں کرتے دیکھتا ہوں۔ وہ اسی شاہانہ کھیل سے اپنے بچوں کے لیے پیسے کماتے ہیں۔ آپ گاڑی روک کر ذرا ان کا حال بھی پوچھیں تو خوش دلی سے چہرے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے جواب دیتے ہیں، صاحب اللہ کا شکر ہے آج ہوا چل رہی ہے، گرمی کم ہے۔ روزہ اچھا گزر رہا ہے۔ ان کے ستانے کی جگہ بھی کسی دیوار کا سایہ ہوتا ہے۔ دھوپ کی شدت کم کرنے کو سر پر بار بار پانی ڈالتے ان کو عمارت کا ٹھیکے دار دیکھ لے تو ڈانٹ دیتا ہے کہ پانی ضائع مت کرو۔

ہمیں غریب مزدور کے سر پر پڑتا پانی بھی ضیاع لگتا ہے، مگر ہوٹلوں میں تین ہزار پر ہیڈ والی افطاری کروانے کو زندگی کا اہم فریضہ سمجھتے ہیں۔ اپنے پیارے پاکستان میں گیارہ مہینے ریاکاری کے بعد رمضان شریف میں مکہ مدینہ میں رہائش کی سیلفیاں سوشل میڈیا پر ڈال کر جنت میں جانے کے خواب دیکھتے ہیں۔ اللہ جانے ان خوابوں سے ہم جیسے مسلمان کب جاگیں گے۔

یقین رکھیں اس دفعہ بھی پورا مہینہ بھوکے اور پیاسے رہنے والے مسلمانوں کا ان روزوں نے کچھ نہیں بگاڑا۔ ہم ایک ماہ پہلے جیسے تھے ویسے ہی عید کرنے جا رہے ہیں۔

ہم قصوروار ہیں

ایک ہفتے میں کراچی سے دو بچیاں لاپتا ہوئیں۔ دونوں کے والدین نے شکایت درج کروائی کہ بچیاں اغوا ہوئیں، مگر بعد میں پتا چلا کہ دونوں اپنی مرضی سے گھر سے گئیں۔ ہوش و حواس میں نکاح کرلیا اور سوشل میڈیا پر اعلان بھی کردیا کہ ہمیں کسی نے اغوا نہیں کیا۔ لمحۂ فکریہ ہے ہمارے لیے۔ کیا واقعی یہ سب اب والدین کو پتا نہیں چلتا کہ بچی کیا کرنے جارہی ہے۔

خدا کے واسطے خاندانی روایات کو واپس لائیے۔ دادی کہاں ہے، پھوپھی کہاں ہے، جن کے ساتھ بچیاں سوتی تھیں اور کہانیاں سنتی تھیں۔ ماں سے ڈرتیں تو دادی اور پھوپھی ان کی رازداں ہوتی تھیں۔ ماں سے بھی پہلے وہی بتاتی تھیں کہ اچھا کیا ہے، برا کیا ہے۔ کس سے ملنا ہے، کس سے نہیں ملنا۔ سر پہ دوپٹا کب رکھنا شروع کرنا ہے۔ کس عمر میں سینہ ڈھانپنا ہے۔ یہ وہ کردار تھے جو بچیوں کی تربیت میں حصہ ڈالتے تھے، اچھے برے کی تمیز سکھاتے تھے، مگر اب بچے اکیلے بھٹک رہے ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ بچوں سے بڑوں کی شفقتوں اور محبتوں میں کمی آ گئی ہے۔ دادی، نانی، پھوپھی، چاچی کی بچیوں سے دوستی ختم ہوگئی ہے اور وہ اب باہر دوستیاں اور ہم دردیاں ڈھونڈ رہی ہیں۔

اسکول جانے کے لیے محلے کے تانگے اور رکشے لگائے جاتے۔ محلے داری کی بھی روایات تھیں کہ بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ ذرا سی دیر ہوجاتی تو ماں سے پہلے دادی بھاگی پھرتیں کہ بچی کا پتا کرو، دیر کیسے ہوگئی اور اب شادی سے پہلے پوچھا جاتا ہے کہ گھر میں کون کون ہے۔ دادی دادے کو چھوڑیں، بیٹی والوں کو گھر میں ساس سسر بھی گوارا نہیں۔

آج تو ٹین ایج بچوں کا بھی الگ کمرہ ہے۔ ہاتھ میں چوبیس گھنٹے واٹس ایپ اور انٹرنیٹ پیکیج کے ساتھ فون۔ پرائیویسی کے نام پر مادر پدر آزادی کے ساتھ ساری ساری رات کون جانے بچے بچیاں سوتے ہیں یا موبائل پر ہوتے ہیں۔ پتا نہیں ماں باپ اپنے گریبان میں کیوں نہیں جھانکتے کہ ان کی کتنی توجہ ہے بچوں پر۔ بچے سارا دن ساری رات کیا کرتے ہیں، پوچھا

جاتا ہے کہ نہیں۔ ماں کو اپنے موبائل سے فرصت ہوگی تو بیٹی پر توجہ دے گی۔ اکثر گھروں میں معاشرے کی برائیاں گنوائی جاتی ہیں۔ معاشرے میں آپ خود کتنے حصہ دار ہیں، یہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔

اگر کسی گھر کے بالغ و نابالغ بچے بچیاں غلط قدم اٹھا رہے ہیں تو سزا والدین کو ملنی چاہیے نہ کہ بچوں کو۔ ہر شخص، ہر ماں اور ہر باپ اکیلا بیٹھ کر ضرور سوچے کہ کہاں غلط ہے، کیا غلط ہے۔ اور اگر آپ اصل بات سمجھ گئے تو ان شاء اللہ بچے کوئی بھی غلط قدم اٹھانے سے بچ جائیں گے۔ بچوں کے غلط رویوں کے ذمہ دار ہم ہیں، صرف ہم۔

چلیں سب والدین خود سے سچ بولنا شروع کریں اور کل سے اس سچ پر عمل پیرا ہو جائیں کہ بچوں کو کیسے پالنا ہے اور کیسے تربیت دینی ہے۔

باپو کی لاڈلی

اکثر لوگ کہتے ہیں، آپ کا لکھا لگتا ہے، ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور میں بھی یہی کہتا ہوں کہ وہی تو لکھتا ہوں جو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوتا ہے۔ آج مالدیپ سے دبئ ہوتے کراچی والی فلائٹ میں ہوں اور ایک چوبیس پچیس سال کی انڈین بچی کے بارے میں لکھنے کو دل چاہا جو ہم دونوں میاں بیوی کو مالدیپ کے ایک جزیرے مادھو میں اوزین لائف ساؤتھ انڈین ریستوران پر رات کا کھانا کھلانے پر مامور تھی۔ یہ ریستوران تین سو میٹر سمندر کے اندر بنا ہوا ہے۔ آپ واک وے سے چلتے ہوئے اس تک پہنچتے ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے پانی پر تختے رکھ کر قالین بچھایا ہوا اور میز کرسیوں کے ساتھ کینڈل لائٹ جلا کر آپ کو بٹھا دیں کہ چلیں اپنی پسند کا ڈنر کریں۔ وہاں کھلے سمندر میں ہوا خوب چلتی ہے اور ہم جیسے بزرگوں کے سر پر جو دو چار بال بچے ہوتے ہیں وہ اڑنے لگتے ہیں، بکھرتے رہتے ہیں۔

ایک ویٹرس بچی میری بیگم کو کھانوں کے بارے میں بہت سلیس انگلش میں تفصیل بتا رہی تھی تاکہ ہم آرڈر دے سکیں۔ اس دوران میں نے اپنی پینٹ کی پچھلی جیب سے چھوٹا سا کنگھا

نکال کر بالوں میں پھیرنا شروع کر دیا تو وہ بچی حیران سی ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کنگھا جیب میں ڈال لیا تو وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ سوپ لے آئی اور میری بیگم سے اردو میں پوچھا میڈم آپ کہاں سے آئے ہو؟ بیگم نے کہا، پاکستان سے۔ کہنے لگی، واہ جی واہ مگر یہاں تو انڈین اور پاکستانی بہت کم آتے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ کہنے لگی، آج بہت ہوا چل رہی ہے اس لیے انکل کے سر کے بال بکھر رہے ہیں۔ میں نے پھر جیب سے کنگھا نکالا اور بالوں کو سنوار لیا۔ اب کے وہ بچی مسکرائی نہیں بلکہ غمگین سی ہو گئی۔ میری بیگم نے کہا، بیٹا جیسے جیسے ان کے بال کم ہو رہے ہیں یہ سارا دن سر میں کنگھا پھیرتے رہتے ہیں۔ وہ بچی ایک دم بولی میرے باپو وانگر (میرے والد کی طرح)۔ میں نے ہنس کر کہا، اچھا تم اپنے والد صاحب کو باپو کہتی ہو۔ کہاں کی رہنے والی ہو۔ فوراً جواب دیا، انڈیا کی، انبالہ کی۔ پھر اپنے ہاتھوں سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہنے لگی، میڈم سر کو کنگھا کرتے دیکھ کر مجھے میرے باپو یاد آ گئے۔ وہ بھی اسی طرح جیب میں کنگھا رکھتے تھے اور بار بار نکال کر بالوں میں پھیرا کرتے تھے مگر اب تو ان کو دیکھے پانچ سال ہو گئے۔

پھر وہ کھانا لینے چلی گئی۔ اس نے ہمیں اتنی محبت سے کھانا کھلایا کہ مزہ آ گیا۔ ہم دونوں میاں بیوی سمجھ گئے کہ وہ اپنے گھر والوں کو مِس کر رہی ہے۔ کھلے سمندر میں ہم بھی ریستوران بند ہونے تک بیٹھے رہے۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ ریستوران میں سامان سمیٹنے والا عملہ آیا تو سارے ویٹرز بھی ہمارے ساتھ ہی باہر کو چل دیے۔ وہ بچی پھر ہم سے آ ملی۔ میں نے پوچھا، بیٹا آپ کے باپو کیا کرتے ہیں انبالہ میں؟ کہنے لگی، سر باپو زندہ ہوتے تو میں یہاں دھکے کھاتی۔ باپو جی پانچ سال ہوئے گزر گئے۔ ہم غریب سے لوگ ہیں۔ باپو انبالہ میں ٹریفک پولیس میں تھے۔ ایک ٹرک نے ٹکر ماردی اور ہم بے سہارا ہو گئے۔ بھائی ہے نہیں۔ میں گھر میں بڑی ہوں۔ میٹرک کر کے سینٹرل گورنمنٹ ہوٹل مینجمنٹ انبالہ سے تین سال کا کورس کیا اور کچھ دوستوں کے ساتھ دو سال پہلے یہاں آ گئی۔ گھر کے خرچے کے علاوہ چھوٹی دو بہنوں کو پڑھا بھی رہی ہوں۔ باپو کی لاڈلی تھی۔ اب باپو جی کے لاڈوں کو روتی رہتی ہوں۔ سر آپ بے شک پاکستانی ہیں مگر میرے باپو جیسے لگتے ہیں۔ آپ کو تو پتا ہی ہے کسی کا باپو نہ ہو تو کوئی بیٹی لاڈلی نہیں

رہتی۔ مسکرا کر کہنے لگی، سر آپ کے بال پھر بکھر گئے ہیں کنگھی کر لیں اور میرے سر پر باپو جی کی طرح ہاتھ بھی پھیر جائیں تا کہ اگلے آٹھ دس دن باپو کو یاد کر کے نہ روؤں۔

میری بیگم بھی اس کی باتوں سے رنجیدہ سی تھیں۔ مجھے اس کے سر پر پیار کرنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اسے گلے لگا کر دعا دی۔ مجھے پنجاب کی وہ کہاوت شدت سے یاد آرہی تھی کہ بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں چاہے وہ بیٹی کسی انڈین باپو کی ہو یا پاکستانی میاں جی کی۔ اب فلائٹ میں بیٹھا دعا کر رہا ہوں کہ یا پروردگار ہر باپو اور میاں جی کو اتنی تو زندگی دیا کر کہ اس کی بیٹی کو گھر چلانے اور چھوٹے بہن بھائیوں کو پڑھانے کی لیے پردیس جا کر ویٹرس کی نوکری نہ کرنی پڑے۔

دیارِ غیر میں

بوسنین بہن

۱۹۹۴ء میں یونائیٹڈ نیشنز نے بوسنیا پروٹیکشن فورس اتاری تو پاکستان آرمی بھی اس کا حصہ تھی۔ ہمارے آفیسرز اور جوانوں نے جس طرح فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس کے بدلے بوسنیا کے لوگوں کی پاک فوج سے محبتیں آج بھی زندہ ہیں اور رہتی دنیا تک یہ تذکرے ہوتے رہیں گے۔ میں ۱۵؍جولائی ۱۹۹۵ء کو وسچا کیمپ تزلا پہنچا اور پاک بٹالین کے فیلڈ ہاسپٹل کی کمانڈ سنبھالی۔ اب تک بوسنیا کے شہروں کے شہر اجڑ چکے تھے۔ جگہ جگہ بے گھر لوگ سڑک کے کنارے شامیانے لگائے بیٹھے، یونیسیف اور یونائیٹڈ نیشنز کے رحم وکرم پر تھے۔ کسی بھی شامیانے یا ٹینٹ میں جا کر پوچھتے تو اس میں چھوٹے بچوں کے ساتھ بیٹی، بہو اور خود ماں یا تو بیوہ ہوتیں یا ان کے خاوند باپ یا بیٹے بوسنین آرمی میں قومی بقا کی جنگ لڑنے جا چکے ہوتے۔ کسی کیمپ میں بارہ سال سے بڑے لڑکے نظر نہیں آرہے تھے۔ بڑے لڑکوں کو یا تو قتل کر دیا گیا تھا یا وہ اپنی فوج میں شامل ہو گئے تھے۔ ان خوب صورت بچیوں اور بچوں کی حالتِ زار دیکھ کر ایسے لگتا جیسے پھول کلیوں کو کیچڑ میں پھینک دیا گیا ہو۔

میرے ہاسپٹل میں جو لڑکیاں کام کر رہی تھیں، وہ سب تعلیم یافتہ اور زیادہ تر میڈیکل کی طالبات تھیں جو پچھلے دو سال سے تعلیمی ادارے بند ہونے کی وجہ سے رل گئی تھیں۔ ہم پاکستانی لوگ یورپین لڑکیوں کو ان کے لباس اور کلچر کی وجہ سے اچھا نہیں سمجھتے مگر یہاں تو سب مسلمان تھیں اور

اکثر نماز بھی پڑھتیں۔ میں نے ایک آدھ دفعہ کہا تو انھوں نے اپنے لباس بھی بہتر کر لیے۔

پانچ فٹ آٹھ انچ لمبی میڈیکل کی طالبہ لیلیٰ کسی بھی کام سے میرے آفس آتی تو بات کرتے کرتے اس کی آنکھیں نم ہو جاتیں اور وہ بات ختم کرتے ہی فوراً اٹھ کر چلی جاتی۔ میں نے اپنی ترجمان لڑکی سے پوچھا تو پتا چلا کہ لیلیٰ کا باپ اور واحد بڑا بھائی جنگ میں شہید ہو چکے ہیں اور اب یہ اکیلی اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کا منگیتر بھی میڈیکل کا طالب علم تھا مگر اب یونیسیف میں الیکٹریشن کا کام کرتا ہے۔ میں نے لیلیٰ سے اس کی فیملی کے بارے میں خود بھی پوچھا تو روتے ہوئے یہی سب کچھ بتایا۔ کہنے لگی، آپ ہم سب سے بہت محبت اور شفقت سے کام لیتے ہیں۔ بس ایک اجازت دے دیں کہ میں آپ کو سر کی بجائے مائی برادر کہہ لیا کروں تاکہ اپنے شہید بھائی کی یاد کم آیا کرے اور میں خود کو تنہا محسوس نہ کروں۔ میں نے اجازت دے دی کہ ٹھیک ہے، آج سے تم مجھے بگ برادر کہہ کر پکار سکتی ہو مگر ایک شرط میری طرف سے بھی ہے کہ مجھے اپنے منگیتر سے جلد از جلد ملواؤ۔

اب لیلیٰ کی آنکھوں میں آنسو ذرا کم نظر آتے تھے۔ ایک دن اس کا منگیتر مجھے ملنے آ گیا۔ المیر بہت اسمارٹ، قدآور اور نفیس نوجوان تھا۔ دونوں کو اکٹھا دیکھ کر لگا جیسے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک دوسرے کے لیے ہی بنایا ہے۔ میں نے المیر سے کہا کہ آپ اب شادی کر لو، ماں بیٹی کو سہارا مل جائے گا۔

المیر نے کہا، نہیں ابھی نہیں، کیوں کہ میرے پاس نہ تو شادی کے اخراجات کے لیے رقم ہے نہ میں کوئی دعوت کرنے کا انتظام کر سکتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں ذرا حالات بہتر ہو جائیں تو یہ تقریب کروں گا۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے بڑے بھائی کی طرح سب انتظامات کرنے کی پیش کش کر دی۔ دونوں کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ لیلیٰ کہنے لگی میں شہید فوجی کی بیٹی اور شہید فوجی کی بہن ہوں، اگر آپ پاکستان آرمی کی خاکی یونی فارم میں اور پاک بٹالین ۱۸ پنجاب رجمنٹ کے بینڈ کے ساتھ شریک ہوں تو مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے ہوگا، نہ کوئی دعوت نہ کوئی فنکشن۔

ہمارے ہاسپٹل میں ڈھیروں وافر راشن تھا۔ دو چار سو لوگوں کے کھانے کا بندوبست کرنا بھی کوئی مشکل کام نہ تھا۔ کسی ہوٹل یا کلب میں جگہ مجھے بلا معاوضہ مل سکتی تھی کیوں کہ سب خالی

دلھن لیلیٰ بریتووچ زیمبق ، مورس علی جیوچ ،میجر سرفراز جنجوعہ اور میجر بشیر آ رائیں۔

Bride Lejla Bratovic Dzambic, Muris Alijevic,
Major Sarfaraz Janjua, Major Bashir Arain

دلھن لیلیٰ بریتووچ زیمبق ، میجر بشیر آ رائیں ، دولھا عامر زیمبق اور میورس علی جیوچ۔

Bride Lejla Bratovic Dzambic, Major Bashir Arain,
Groom: Amir Dzambic, Muris Alijevic

بیٹھے ہوئے: آمنہ سیبر ووچ، عامرہ سمائیل ہاوٗزچ، میجر بشیر آرائیں، لیلیٰ بریتووچ زیمبق، علیسہ زون وچ۔
پچھلی قطار میں: میجر منصب امین، میجر محمد زبیر، میجر طارق شکور اور میجر محمد افضال۔

Sitting: Amna Sabrovic, Amra Smailhodzic, Major Bashir Arain, Lejla Bratovic Dzambic, Alisa Zonvic

Standing: Major Mansib Amin, Major Muhammad Zubair, Major Tariq Shakoor, Major Muhammad Afzaal

پاک بیٹ ۲ فیلڈ ہاسپٹل وسچا کیمپ میں اپنے اسٹاف کے ساتھ۔

پڑے تھے مگر لیلیٰ کے دونوں مطالبے خاصے مشکل تھے۔ یونائیٹڈ نیشن مشن میں ہوتے ہوئے پاک آرمی کی یونی فارم پہن کر بوسنین لڑکی کی شادی میں شرکت اور پنجاب رجمنٹ کے بینڈ کا تزلا شہر کی سڑکوں پر کسی کی شادی پر پرفارم کرنا پاک بٹالین کے گروپ کمانڈر کرنل سیّد قاسم عباس کی اجازت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ کرنل قاسم عباس انتہائی دین دار اور نفیس افسر تھے جو بعد میں بریگیڈیئر رینک میں ریٹائر ہوئے۔ میں دوسرے دن دوردا کیمپ میں ان سے جا ملا اور انھیں ساری بپتا سنائی۔ انھوں نے کہا، جاؤ تمھیں ہر چیز کی اجازت دی۔ اس بچی کی شادی میں دوسرے افسر بھی شریک ہو سکتے ہیں مگر خاکی یونی فارم صرف تم پہنو گے۔ باقی سب افسر یو این مشن والی یونی فارم میں ہوں گے۔ آرمی بینڈ کی بھی اجازت مل گئی۔

میں نے صبح ہاسپٹل کے کاریڈور میں لیلیٰ کو باقی لڑکیوں کے سامنے بتایا کہ جب چاہو اپنی شادی کی تاریخ رکھ لو۔ انتظام ہم کریں گے۔ پاکستانی بینڈ اور ہاسپٹل کے باقی تمام افسر بھی شریک ہوں گے اور میں خاکی وردی میں بگ برادر بن کر ساتھ بھی رہوں گا۔ تمام لڑکیاں خوشی اور حیرانگی سے سب کچھ سن اور دیکھ رہی تھیں۔ لیلیٰ پہلے تو چہک چہک کر سب لڑکیوں سے گلے ملتی رہی اور پھر اچانک کاریڈور میں ہی زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔ میں چپ چاپ اپنے آفس میں واپس آ کر بیٹھ گیا۔

آفس میں دیر تک بیٹھا سوچتا رہا کہ ربِ کریم نے عورت ذات کو شاید ایک ہی مٹی سے گوندھا ہے۔ وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں جنم لے، جو بھی زبان بولے، رنگ روپ جیسا بھی ہو، شکل وصورت کیسی بھی ہو—دل ایک جیسا ہی پاتی ہے۔ ماں ہو، بیٹی ہو، بہن ہو یا بیوی، مرد سے ہر رشتے سے محبت اور وفا کا پیکر۔ مجھے اندازہ تھا کہ خوشی کے اس موقعے پر لیلیٰ اپنے شہید بھائی اور باپ کو یاد کر کے رونے بیٹھ گئی تھی۔ پندرہ منٹ بعد میں دوبارہ باہر آیا تو وہ وہیں کاریڈور میں میری سرکاری ترجمان لڑکی عامرہ کے ساتھ کھڑی تھی۔ مجھے دیکھا تو آنسو صاف کر کے مسکراتی ہوئی صرف تھینک یو کہہ کر وارڈ کی طرف چلی گئی۔

دوسرے دن اس نے بتایا کہ نکاح اور شادی کے لیے پندرہ دن بعد کی تاریخ رکھی ہے۔ میں نے اپنے ہیڈ کلرک کو بتا دیا کہ لیلیٰ کو بیس دن کی چھٹی کا لیٹر دے دو۔ میں نے میجر سرفراز جنجوعہ

(اب بریگیڈیئر ہے) کے ساتھ تزلا جا کر دعوت کی جگہ کا انتخاب کیا۔ ہاسپٹل کے راشن اسٹور سے ضرورت کے سامان کا حساب بنایا۔ بینڈ ماسٹر کو سارے راستے اور دعوت کی جگہ دیکھنے کو بھجوا دیا۔شرکت کرنے والے پاک آرمی کے افسروں کی لسٹ تیار ہوئی تو میں کرنل سیّد قاسم عباس سے اجازت لینے پہنچا۔میری خوشی اس وقت دوبالا ہوگئی جب انھوں نے کہا کہ بشیر تم لسٹ میں میرا نام بھی شامل کرلو۔میں بھی اپنے کسی اسٹاف آفیسر کے ساتھ شرکت کرنے آؤں گا۔

میری جیپ پر دو جھنڈے لہراتے تھے۔ایک یونائیٹڈ نیشنز کا اور دوسرا ریڈ کراس کا۔شادی والے دن میں نے ریڈ کراس کے جھنڈے کی جگہ پاکستان کا جھنڈا لہرایا اور خاکی یونی فارم پہنی۔ باقی سب آفیسرز یو این مشن کی یونی فارم میں رہے۔سب لوگ تین جیپوں میں ڈھیروں پھول لیے تزلا کینٹ میونسپل آفس پہنچے۔ بلڈنگ کے باہر بن بلائے لوگوں کا جمِ غفیر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ۱۸ پنجاب رجمنٹ کا بینڈ پاکستانی دھنیں بجا رہا تھا اور لوگ پاکستان دوبھرو، پاکستان دوبھرو (پاکستان زندہ باد) کے نعرے لگا رہے تھے۔ ہم جیپوں سے اترے تو ہمارا استقبال تالیوں سے ہوا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جن کا اس شادی سے کوئی تعلق نہ تھا۔بس پاکستانی فوج کو خراجِ تحسین کے لیے جمع ہوئے تھے۔میں بلڈنگ کے اندر پہنچ کر دلھن بنی لیلیٰ کے قریب گیا اور آہستہ سے کہا کہ دیکھو لوبگ برادر نے خاکی وردی بھی پہنی ہے اور باہر دولھا دلھن کے استقبال کے لیے پاکستانی بینڈ بھی بج رہا ہے۔آج رونا نہیں ہے ورنہ خیر نہیں تمھاری۔

دعوت کی جگہ اس بلڈنگ سے صرف دو فرلانگ دور تھی۔نکاح کے رجسٹر پر دستخط ہو چکے تو ہم سب مبارک باد دیتے نئے شادی شدہ جوڑے کے ساتھ باہر نکلے۔ دولھا دلھن کی کار کے آگے پیچھے ہماری فوجی جیپیں تھیں اور سب سے آگے فوجی بینڈ چل رہا تھا۔ رات کے وقت بھی جنگ سے تنگ لٹے پٹے افسردہ چہروں پر خوشیاں واضح نظر آ رہی تھیں۔ہم نے یہ دو فرلانگ کا فاصلہ ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا۔ پورا بازار روشن تھا۔ دلھن کے قافلے کے علاوہ تمام ٹریفک رک چکی تھی۔لوگ دکانوں اور ہوٹلوں سے باہر نکل کر تالیاں بجا رہے تھے اور جگہ جگہ گاڑیوں پر پھول پھینکے جا رہے تھے۔ بلند و بالا عمارتوں کی بالکونیوں سے پاکستان دوبھرو، پاکستان دوبھرو کی آوازیں ہمیں حیران کر رہی تھیں۔

دعوت کی جگہ جا کر رکے۔ میں جیپ سے اتر کر سب کے ساتھ دولھا دلھن کے ہال میں داخل ہونے کا انتظار کر رہا تھا تو میرے ہاسپٹل میں کام کرنے والی تین چار لڑکیوں نے آ گھیرا۔ آنکھوں میں آنسو لیے سب نے یک زبان کہا، تھینک یو سر۔ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا کہ اب کیا ہوا، رونا کس بات کا ہے؟ کہنے لگیں، سر لیلیٰ جیسی ہماری قسمت کہاں۔ جب ہماری شادیاں ہوں گی تو نہ کوئی خاکی وردی والا بگ برادر ہوگا اور نہ یہ دھنیں بجیں گی۔ یہ سب سوچ کر روئیں نہ تو کیا کریں۔ اب میں ان کو کیسے سمجھاتا کہ لیلیٰ تو شہید فوجی کی بیٹی اور بہن ہے اور ہم خاکی وردی والے اپنے شہیدوں کی بیٹیوں کو اسی شان سے رخصت کرتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو پاکستان آ کر دیکھ لو۔

ہم دولھا دلھن کے ساتھ ہال میں داخل ہوئے۔ میجر سرفراز جنجوعہ اور کیپٹن لطیف خٹک نے بہت خوب صورتی سے ہال میں ایک ہی لمبی ٹیبل پر سو لوگوں کے بیٹھنے کا بندوبست کیا تھا۔ ایک طرف نئے جوڑے اور دولھا کے خاندان اور دوست احباب کو بٹھایا۔ میز کی دوسری طرف لیلیٰ کی ماں کے ساتھ ان کے کچھ رشتے دار۔ ہمارے ہاسپٹل میں کام کرنے والی بوسنین لڑکیاں اور ہم پاک آرمی کے آفیسرز دلھن کا میکا بن کر بیٹھ گئے۔ مجھے لیلیٰ بار بار اشارے سے ٹیبل کی دوسری طرف بلاتی اور اپنے نئے آنے والے دوستوں اور سسرالیوں سے ایسے فخر سے مائی بگ برادر کہہ کر تعارف کرواتی جیسے اس کا شہید بھائی قبر سے اٹھ کر اسے رخصت کرنے آ گیا ہو۔

باہر بینڈ کی دُھن تیز ہوئی تو میرا اردلی بھاگتا ہوا اندر آیا اور اطلاع دی کہ گروپ کمانڈر کرنل سیّد قاسم عباس بھی پہنچ گئے ہیں۔ میں نے باہر جا کر ان کا استقبال کیا اور ہال تک رہنمائی کی۔ فوجی زندگی میں اچھے کمانڈر کے زیرِ سایہ نوکری کرنا ہمیشہ خوش قسمتی سمجھا جاتا ہے۔ کمانڈر ایس ایس جی کا تربیت یافتہ جنگجو افسر ہو مگر آپ کے لیے شفقت کا مینار۔ آپ پردیس میں جنگی محاذ پر ہوں مگر آپ کو گھر جیسا ماحول مہیا رہے۔ اس تصور کو آپ نے سچ ہوتے دیکھنا ہو تو آپ کو کرنل سیّد قاسم عباس کے ساتھ بوسنیا میں نوکری کرنی چاہیے تھی۔ مجھے ان سے ملے اٹھائیس سال گزر گئے ہیں مگر ان کا اپنے اسٹاف آفیسرز کے ساتھ ہال میں داخل ہونا، بوسنین جوڑے کو پھول اور پاکستانی شال دے کر دعائیہ کلمات کہنا اور بوسنین قوم کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرنے کا طلسماتی انداز آج بھی کل کی بات لگتی ہے۔ ان کی انگریزی میں کی گئی باتیں شاید ہال

میں موجود تمام بوسنین مہمانوں کی سمجھ میں نہ آئی ہوں مگر ان کے پُراثر جادوئی انداز کی وجہ سے سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں، آنکھوں میں آنسو اور چہروں پر شکرانے کے تأثرات صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اصل میں خاکی وردی والے پاکستانی کمانڈر ایسے ہی ہوتے تھے۔ آئے، چند الفاظ بولے، لوگوں کے دل جیتے اور آگے نکل گئے۔ اب مجھے ریٹائر ہوئے گیارہ سال ہوگئے ہیں۔ نہیں پتا، اب ہماری قوم کی مائیں ایسے بیٹے پال پوس کر خاکی وردی پہننے کو قوم کے حوالے کر رہی ہیں یا نہیں۔

بوسنیا کے لوگ پچھلے چار پانچ سالوں سے ہنسنا مسکرانا بھول گئے تھے۔ ہم بھی چھ مہینوں سے ان کے خوب صورت چہروں پر صرف افسردگی دیکھ رہے تھے۔ بازاروں سے گزرتے تو جنگی اثرات کے تحت تباہ شدہ بلند و بالا عمارتوں کو دیکھ کر لگتا کہ وہ اپنے جواں سال بیٹوں کی لاشوں اور معصوم بچیوں کی عزتوں کی پامالی پر بین کر رہی ہوتیں۔ میں آج بھی اکیلا بیٹھ کر اس چھوٹی سی تقریب کے بارے میں سوچ کر خوش ہوتا رہتا ہوں کہ کیسے میں نے خاکی وردی پہن کر اور ۱۸ پنجاب رجمنٹ کے بینڈ نے پاکستانی دھنیں بجا کر دعوت والے ہال تو کیا باہر سڑک پر گزرتے ہوئے لوگوں کو بھی خوشی سے جھومنے اور ایک دوسرے کو گلے لگا کر اپنے غموں اور دکھوں سے باہر نکلنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔ اس وقت میں فوجی آفیسر ہونے کے ناتے اپنے جذبات پر بہت قابو پاتا رہا مگر پھر بھی کوئی نیا مہمان آ کر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بغیر کسی تمہید کے تھینک یو کہتا تو میں دوسری طرف منہ کر کے ٹشو سے اپنی آنکھیں صاف کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

سوچتا ہوں، یہ کیسی شادی تھی جس میں ہر شخص آنکھوں میں آنسو اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے دولھا دلھن کو مبارک باد دے رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم، اس دعوت میں کس نے کیا کھایا تھا یا میرے ساتھی آفیسرز نے مہمانوں کی کیسے مہمان نوازی کی ہوگی مگر آنے والا ہر شخص حیران تھا کہ یہ خاکی وردی والے کیسے پیس کیپرز ہیں جو ہماری بیٹی کو اپنی بیٹی کی طرح رخصت کر رہے ہیں۔

رات کے نو بج رہے تھے۔ باہر گاڑیاں فوجی طریقے سے قطار میں لگ چکی تھیں۔ بینڈ پر پاکستانی دھنیں بج رہی تھیں اور ہم دولھا دلھن کو لے کر باہر نکل آئے۔ لیلیٰ اپنے دولھا المیر کا ہاتھ پکڑے مجھے تشکر بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی مگر میں اسے بڑے بھائی کی رعب دار آنکھیں

دکھا رہا تھا کہ خبردار جو کوئی رونے والا سین بنایا۔ وہ میرے ڈر سے مسلسل مسکراتی رہی مگر آنکھوں سے گرتے آنسو اس کا میک اپ بھی خراب کرتے رہے۔ کار میں بٹھانے کے لیے میں نے دروازہ کھولا تو کہنے لگی:

> Big Bro, I believe Shaheeds never die. Today I felt my father and brother are alive. Thank you for being my big brother and thank you Pak Army.

دولھا دلھن کی کار روانہ ہوئی تو ہم پاک فیلڈ ہاسپٹل کے آفیسرز اور ہمارے ساتھ کام کرنے والی تمام بوسنین لڑکیاں بہت دیر تک اکٹھے کھڑے رہے۔ دلھن کی روانگی کے بعد کوئی کسی سے بات ہی نہیں کر رہا تھا۔ ہال کے باہر کم روشنی نے سب ہی کے چہروں پر خوشی یا غم کے تأثرات کو مکمل چھپا رکھا تھا۔ میں نے بلاوجہ تالی بجانی شروع کر دی اور پھر ہر طرف پوری طاقت سے تالیاں بج رہی تھیں۔ موقع غنیمت جان کر میں نے بوسنین مہمانوں کو ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا اور اپنے آفیسرز کو جیپوں میں بیٹھنے کا اشارہ کر کے وسچا کیمپ کی طرف چل نکلا۔

قومی جذبہ

ایک دن میں نے تجویز لکھی کہ اگر ہم امپورٹیڈ چیزوں کا شوقیہ استعمال بند کر دیں تو ملک میں معاشی بدحالی کو سنبھالنے کے لیے زرِمبادلہ بچایا جا سکتا ہے۔ لوگوں نے اس پر الٹا میرا خوب مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ ماشاءاللہ پڑھے لکھے لوگ بھی اب کسی سنجیدہ بات کو مذاق میں اڑانے یا سیاست کی نظر کرنے کی بھرپور تربیت پا چکے ہیں اور پوری قوم شغل میلے اور مردہ باد، زندہ باد کے نعروں پر زندگی گزار رہی ہے۔

قوم و ملک پر مشکل وقت میں اپنی اپنی ذمہ داری نبھانے کا گُر میں نے بوسنیا میں سیکھا تھا۔ ۹۵-۱۹۹۴ء میں جب پاکستانی فوج یونائٹیڈ نیشن پروٹیکشن فورس کے جھنڈے تلے بوسنیا ہرزیگوینا پہنچی تو پورا ملک جنگ کی تباہ کاریوں کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ انفراسٹرکچر تباہ، کاروبار بند، تعلیمی ادارے ختم، ملکی سرحدوں پر آمد و رفت ختم اور بیروزگاری عروج پر تھی۔ میں وسچا کیمپ میں

پاک بٹالین ۲ کا فیلڈ ہاسپیل کمانڈ کر رہا تھا۔ چوں کہ ہاسپٹل میں بوسنین فیملیز کا علاج بھی ہوتا تھا اس لیے ہم نے مقامی نرسز اور میڈیکل کی طالبات کو بھرتی کرلیا۔ دو چار لڑکیاں ایسی بھی تھیں جو ترجمانی کے فرائض انجام دیتیں اور ہمارے ڈاکٹرز کا کام آسان ہو جاتا۔ ہمارے کام سے متاثر ہو کر انٹرنیشنل این جی اوز ہمیں کھانے پینے کا سامان۔ دوائیاں اور کپڑے بھی دے جاتیں کہ ہم واقعی ضرورت مندوں تک یہ سب پہنچا رہے تھے۔ ہمارے بوسنین اسٹاف کی تنخواہ بہت کم تھی اس لیے ہم ان کو راشن اور دوسری چیزیں بھی مہیا کر دیتے تا کہ ان کا بھی بہتر گزارہ ہو سکے۔

بوسنین لوگ مجھے سر کی بجائے چیف کہہ کر پکارتے تھے۔ ہاسپٹل میں میڈیکل کی طالبہ عامرہ سمالوہازچ میری ترجمان تھی اور ہر جگہ میٹنگ یا کانفرنس میں میرے ساتھ جاتی تھی۔ اس کا باپ بوسنین آرمی میں میجر اور بڑا بھائی سولجر تھا۔ گھر میں صرف ماں اور دادی دادا تھے۔ وہ اکثر کہتی کہ چیف میرے دادا دادی اور ماں پاکستان آرمی کی باتیں سن کر آپ لوگوں سے بہت محبت کرتے ہیں اور آپ کو گھر چائے پر بلانا چاہتے ہیں۔ اصولاً ہمیں اس طرح کسی کے گھر جانا منع تھا مگر ایک دن عامرہ کا بھائی مرزا مجھے لینے ہاسپٹل آ گیا۔ ہم کیمپ سے باہر صرف یونی فارم میں ہی جا سکتے تھے۔ ان کا فلیٹ تزلا یونی ورسٹی کے ساتھ ایک بمباری سے متاثرہ خستہ حال عمارت میں تھا۔ شام کے وقت جلد ہی ہر طرف اندھیرا چھیل رہا تھا۔ دروازے پر پہنچ کر پتا چلا کہ وہ جوتے گھر کے اندر نہیں لے جاتے۔ میں بوٹ اتارنے لگا تو عامرہ نے مجھے لانگ بوٹ اتارنے سے منع کیا اور جوتوں پر چڑھانے کو شو کور دے دیے۔ گھر کے اندر داخل ہوا تو اندھیرا تھا اور صرف ایک کمرے میں روشنی تھی۔ میں حیران تھا کہ مجھے گھر بلا کر یہ اندھیرے میں بیٹھے ہیں۔

کمرے سے دادا دادی باہر آئے تو کمرے کا بلب بند اور لاؤنج کا روشن ہو گیا۔ اس کے دادی اور دادا بہت محبت سے ملے مگر بات چیت عامرہ کے توسط سے ہو رہی تھی۔ وہ لوگ صرف پاکستانی سولجرز کا شکریہ ادا کرنے کو مجھ سے مل رہے تھے کہ ہم کیمپوں میں بوسنین لوگوں کی مدد اور ہاسپٹل میں بیماروں کا علاج کر رہے ہیں۔ عامرہ نے مجھ سے معذرت کی کہ کچھ وقت مجھے اندھیرے میں بیٹھنا پڑے گا کیوں کہ وہ کچن میں روشنی کر کے چائے بنائے گی۔ لاؤنج کی لائیٹ بجھ گئی اور کچن میں روشنی ہو گئی۔ چائے بن کر آ گئی تو لاؤنج کا بلب دوبارہ روشن ہو گیا۔

میں اس سارے قصے سے حیران سا بیٹھا تھا۔

چائے پیتے ہوئے میں نے عامرہ سے اس جلتے بجھتے بلب کا راز پوچھا تو کہنے لگی، پچھلے ایک سال سے شہر کے میئر نے اعلان کر رکھا ہے کہ ملک میں لوڈ شیڈنگ ہے اس لیے ہر گھر میں ایک وقت میں صرف ایک بلب ہی روشن ہوگا تو ہم ایک وقت میں دوسرا بلب نہیں جلاتے۔ میں آپ سے معذرت کرتی ہوں کہ آپ کو کچھ وقت اندھیرے میں بیٹھنا پڑا اور میں اس کا منہ دیکھتا ہی رہ گیا اور دل چاہا کہ باہر بازار میں نکلوں اور پاکستانیوں کو آواز دوں کہ کسی کا قومی کردار دیکھنا ہے تو آؤ جنگ میں لٹی پٹی اس قوم کا کردار دیکھو۔

ایک اور واقعہ

تزلا کی اسلامی یوتھ آرگنائزیشن بوسنیا کا ایک رکن لڑکا المیر ظاہروچ صبح صبح کسی مریض کے لیے مدد لینے میرے پاس آیا۔ میں میس میں ناشتا کر رہا تھا۔ اسے وہیں بلوا لیا اور ناشتے کا پوچھا۔ اس نے دعوت خوشی سے قبول کر لی۔ ناشتا بن کر آیا تو انڈا آملیٹ دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا اور کہنے لگا، چیف میں آج ایک سال بعد انڈا کھاؤں گا۔ میں اس بات پر دل ہی دل میں بہت پریشان ہوا کہ جنگ کسی قوم کو اس حالت تک پہنچا دیتی ہے اور دوسری طرف دیکھیں تو ہمارے کچن میں سیکڑوں درجن انڈے موجود تھے۔ میں اس کے ساتھ تزلا ہاسپٹل کے لیے نکلا تو جیپ میں ایک پیٹی انڈوں کی رکھوا لی۔ مریض کا مسئلہ حل کر کے اسے گھر اتارا تو گارڈ نے وہ انڈوں کی پیٹی بھی اتاری وہ تڑپ کے بولا کہ یہ کیوں۔ میں نے کہا المیر یہ آپ کے گھر کے لیے ہے۔ کہنے لگا، چیف ہم تو صرف تین لوگ ہیں میں اور میرے والدین۔ اس نے شکریہ کہتے ہوئے پیٹی کھولی۔ اس میں سے تین انڈے لیے اور ہمیں سڑک پر کھڑے چھوڑ کر سامنے والے ٹوٹی پھوٹی عمارت میں چلا گیا۔ میں وسچا کیمپ کی طرف دوڑتی جیپ میں بیٹھا مسلسل سوچ رہا تھا کہ اگر آج اس کی جگہ میں ہوتا تو کیا میں بھی ایسا ہی کرتا۔ شکر کیا کہ میرے چہرے کے تأثرات میرا ڈرائیور اور گارڈ نہ دیکھ پایا تھا ورنہ میری کیا عزت رہتی کہ میرا ایسا کردار کہاں۔ میں تو اس قوم کا باشندہ ہوں کہ اگر اب کے جنگ لگی تو ہم ایک دوسرے کی روٹی بھی چھینیں گے۔

حج میڈیکل مشن ۲۰۰۶ء

۲۰۰۵ء میں میری پوسٹنگ سی ایم ایچ ملیر میں ہوئی تو پہنچتے ہی پہلی اچھی خبر یہ ملی کہ میں اس سال حج میڈیکل مشن میں ڈپٹی ڈائریکٹر بن کر ڈیوٹی پر مکہ مکرمہ جا رہا ہوں۔ دل باغ باغ ہو گیا۔ یہ ایسی ڈیوٹی ہے جس کا روزانہ اضافی الاؤنس بھی ملتا ہے اور حج بھی نصیب ہوتا ہے مگر شرط ہے کہ آپ کا بلاوا آ جائے۔ اس حج میڈیکل مشن میں میرے پچاس دن زندگی کا یادگار دور ہے۔ چوں کہ میں حج میڈیکل مشن میں پہلے بھی ممبر کی حیثیت سے کام کر چکا تھا، اس لیے مجھے اب مزید ذمہ داریوں کے ساتھ مشن کا ڈپٹی ڈائریکٹر بنا کر بھیجا جا رہا تھا۔ آرمی میڈیکل کالج فرسٹ بیچ کے آفیسر بریگیڈیئر ندیم احمد مشن کے ڈائریکٹر تھے۔ ان دنوں بہت ہی اچھی شہرت کے آفیسر وکیل احمد خان فیڈرل سیکریٹری اور جناب اعجاز الحق وفاقی وزیر مذہبی امور تھے۔ میری شہرت کبھی بھی ایک تابع دار آفیسر والی نہیں رہی تھی، اس لیے بریگیڈیئر ندیم احمد کچھ فکرمند تھے اور یہی بات جناب اعجاز الحق تک بھی پہنچ چکی تھی۔

حج میڈیکل مشن کی تمام تیاریاں راول پنڈی میں ہوتی تھیں۔ حاجیوں کے لیے دوائیوں کی خریداری سے لے کر مشن میں جانے والے سیویلین اور فوجی ڈاکٹرز اور میڈیکل اسٹاف کے پاسپورٹ اور ویزوں کا بندوبست، حاجیوں کی فلائٹس کے ساتھ ساتھ ہر میڈیکل ٹیم کا جدہ مکہ اور مدینہ وقت پر پہنچنے کی پلاننگ ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ پچھلے تجربوں اور حاجیوں کے مطالبے کو مدِنظر رکھ کر اس سال حکیم اور طبیب بھی شامل کیے گئے تھے۔ خدا خدا کر کے تیاریاں مکمل ہوئیں اور بریگیڈیئر ندیم احمد حاجیوں کی فرسٹ فلائٹ کے ساتھ میڈیکل مشن کی ایڈوانس پارٹی لے کر مکہ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں حاجیوں کی فلائٹس میں ان کی تعداد کے مطابق نئی میڈیکل ٹیم تیار کر کے روانہ کرتا رہا۔

ریال کی طاقت

آخری فلائٹ کے ساتھ میں بھی جدہ اترا اور پاکستان ہاؤس مکہ پہنچ گیا۔ پاکستان ہاؤس اس وقت خانہ کعبہ سے صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر النور ہاسپٹل کے سامنے والی بلڈنگ میں

تھا۔ گراؤنڈ فلور پر مذہبی امور کی منسٹری اور ڈائریکٹر حج کا دفتر تھا اور فرسٹ فلور پر ہاسپٹل، او پی ڈی اور وارڈ۔ اسی فلور پر میڈیکل مشن کے عملے کے آفس اور رہائش کا انتظام تھا۔ میں نے دوسرے دن ہی عجیب تماشا دیکھا، جب اذان ہوتی تو سب ڈاکٹر اور اسٹاف تمام مریضوں کو چھوڑ کر باجماعت نماز کے لیے حرم چلے جاتے اور مریض ان کے انتظار میں بیٹھے رہتے۔

جب بریگیڈیئر ندیم نے ایڈمنسٹریشن کی ذمہ داری مجھے سونپ دی تو میں نے تمام ڈاکٹرز اور اسٹاف کے ساتھ میٹنگ کی اور ان کو بتایا کہ ہماری بنیادی ذمہ داری حاجیوں کی دیکھ بھال اور علاج ہے، لیکن ہمیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ڈیوٹی کرتے ہوئے ہمیں حج کی سعادت بھی میسر ہوگی۔ چوں کہ اس ذمہ اری کے لیے ہمیں ڈیلی الاؤنس ملتا ہے، اس لیے ڈیوٹی چھوڑ کر حرم کے اندر جا کر ہر نماز باجماعت نہیں پڑھی جاسکتی۔ ویسے بھی پاکستان ہاؤس حرم کی حدود میں ہے، اس لیے امام کعبہ کی آواز یہاں تک سنائی دیتی ہے آپ سڑک پر بھی باجماعت نماز پڑھ سکتے ہیں۔ میری باتیں لوگوں کو ناگوار گزر رہی تھیں کیوں کہ عبادت کا ثواب سب ذمہ داریوں پر حاوی ہو چکا تھا۔

میں ہاسپٹل اور مختلف کلینکس کا دورہ کرتا تو لوگ ڈیوٹی سے غائب ہوتے اور پوچھنے پر وہی حرم میں باجماعت نماز کا بتایا جاتا۔ اس دوران ہر جگہ مریضوں کا رش لگ جاتا اور بعض اوقات ایمرجنسی کے لیے بھی ڈاکٹر موجود نہ ہوتا۔ میں نے ہاسپٹل اور تمام کلینکس میں لکھ کر بھی لگایا کہ عبادت کرنا ذاتی فعل ہے اور اس کے لیے ڈیوٹی کی جگہ نہیں چھوڑی جاسکتی۔ اس کا بھی اثر نہ ہوا اور لوگ مجھ پر عبادت سے روکنے کا الزام لگانے لگے۔ مجھے بتانے لگے کہ سرحرم کے اندر جا کر نماز پڑھنے کا زیادہ ثواب ہے۔ میرا کہنا تھا کہ ڈیوٹی چھوڑنے کا گناہ بھی تو ہے اور کسی کی جان چلی گئی تو اس کی ذمہ داری کس کے سر ہوگی۔ مجھ سے وفاقی وزیرِ مذہبی امور اعجاز الحق صاحب نے بھی شکایت کی کہ لوگ ڈیوٹی چھوڑ کر نماز پر چلے جاتے ہیں اور دور ہونے کی وجہ سے کچھ کلینکس پر تو ڈاکٹر دو دو گھنٹے میسر نہیں ہوتے۔ اب مجھے آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔

حج میڈیکل مشن کے ہر ڈاکٹر کو الاؤنس کی مد میں ایک سو دس ریال روزانہ ملتے تھے اور ادائیگی، اکاؤنٹ آفیسر ہونے کے ناطے میں نے کرنی تھی۔ میں نے ہر کلینک پر نوٹس لگا دیا کہ

اسٹاف میں سے جو بھی شخص ڈیوٹی سے غیر حاضر پایا گیا، اس کا ڈیلی الاؤنس کاٹ لیا جائے گا۔ شور مچ گیا کہ ایسا نہیں ہوسکتا اور لوگ نماز کے وقت ڈیوٹی چھوڑ کر حرم جاتے رہے۔ میری کسی نصیحت اور تقریر کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے بریگیڈیئر ندیم احمد اور اعجاز الحق صاحب نے بھی کہا کہ الاؤنس کاٹنے کا نہ کہو، مسئلہ بن جائے گا۔ میں نے حفظِ ماتقدم سیکریٹری مذہبی امور وکیل احمد سے بات کی تو انھوں نے کہا کہ قانوناً جو شخص ڈیوٹی سے غیر حاضر ہو، آپ اس کا الاؤنس کاٹ سکتے ہیں۔

میں نے نماز کے وقت چیکنگ شروع کی اور ڈیوٹی سے غیر حاضر اسٹاف کی فہرست بنانی شروع کر دی۔ سب کا خیال تھا کہ یہ صرف دھمکی ہے اور اس پر عمل نہیں ہوسکتا۔ پہلے دس دن کی ادائیگی شروع ہوئی تو لوگوں پر بم سا گرا۔ الاؤنس کی ادائیگی میں کٹوتی ہو چکی تھی۔ ڈاکٹرز اور عملے نے مجھ سے احتجاجاً کہا تو میں نے پیشگی اطلاع والے نوٹس کا حوالہ دیا اور غیر حاضری والی فہرست بورڈ پر لگا دی۔

ڈاکٹرز اور اسٹاف خاموشی سے اپنے الاؤنسز لینے لگے اور پیغام آنے لگے کہ سر معاف کر دیں ہم اب ڈیوٹی کی جگہ بالکل نہیں چھوڑیں گے۔ میں نے سب سے پھر کہا کہ حاجیوں کی دیکھ بھال کے لیے آئے ہیں، حج کی سعادت بھی مل رہی ہے، اس لیے کچھ بھی ہو جائے ڈیوٹی کی جگہ نہیں چھوڑی جاسکتی۔ میری نصیحتوں سے زیادہ اثر ایک سو دس ریال کی کٹوتی نے کر دکھایا اور سب نے ریال کی محبت میں اپنی اپنی ڈیوٹی کی جگہ پر جماعت کرانی شروع کر دی۔ میں بھی فجر کے علاوہ ان سب کے ساتھ مختلف جگہوں پر باجماعت نماز پڑھتا اور اللہ کا شکر ادا کرتا کہ اب ہاسپٹل اور تمام کلینکس سے آنے والی شکایات ختم ہوگئی تھیں اور ڈاکٹرز اور باقی تمام عملے نے خوب دل جمعی سے حاجیوں کی دیکھ بھال شروع کر دی۔ ریال کی طاقت کے کرشمے آج تک یاد ہیں۔ اس دن کے بعد کسی نے بھی دوبارہ اپنے ایک سو دس ریال ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور میری جان بھی روز روز کے دوروں سے چھوٹ گئی۔ اللہ کا شکر گزار رہا کہ بعد میں ۶/فروری ۲۰۰۶ء تک میرا کام انتہائی آسان ہوگیا۔

وی آئی پی حاجی

عاجزی انسان کی وہ وصفت ہے جو اللہ کے چنے ہوئے لوگوں کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ اگر یہ صفت کسی میں نہیں تو وہ چاہے دس حج کر چکا ہو اور گیارہویں دفعہ احرام باندھے حرم میں بیٹھا ہو، اس کی انا اور تکبر اور وی آئی پی ہونے کا احساس اسے اپنے پروردگار کی عبادت بھی صحیح طرح نہیں کرنے دیتا۔

میں حج میڈیکل مشن میں سب ڈاکٹرز اور اسٹاف سے کہتا تھا کہ حج پر آئے لوگ اللہ کے مہمان ہوتے ہیں اور ان کی دیکھ بھال بہت نیک کام ہے، اس لیے ہمیں اسے بہت خوش دلی سے انجام دینا چاہیے۔ دوسری طرف میں کچھ حاجیوں کا رویہ دیکھتا تو سوچتا کہ حج ان کا کیا بگاڑ لے گا۔ انا اور تکبر نے انھیں حج کی عبادت کو سمجھنے ہی نہیں دیا تھا۔

ہر نماز کے بعد ہمارے ہاسپٹل اور کلینکس میں بے تحاشا رش لگتا اور حاجی بے صبرے ہو کر ڈاکٹرز اور اسٹاف سے لڑتے رہتے۔ کوئی قطار بنانے کو تیار نہ ہوتا۔ میں نے ہر جگہ لکھ کر نوٹس لگا دیے تھے کہ جو لوگ قطار میں اپنی باری کا انتظار نہیں کریں گے، کوئی ڈاکٹر ان کا معائنہ نہیں کرے گا۔ ایک دن باہر اتنا شور مچا کہ مجھے آفس سے باہر آنا پڑا۔ دیکھا تو ایک شخص اعلان کر رہا تھا کہ میں پاکستان میں فلاں قومی اخبار کا نمائندہ ہوں اور حج میڈیکل مشن کے خلاف لکھوں گا کہ یہ لوگ مفت کے الاؤنس کھاتے ہیں، کام کچھ نہیں کرتے۔ اس سے شکایت کا سبب پوچھا تو مسئلہ وہی نکلا کہ صحافی وی آئی پی ہوتے ہیں، قطار میں کیوں لگوں— مطالبہ تھا کہ مجھے فوراً دیکھا جائے۔

میں نے اس سے معذرت کی اور اپنے آفس سے میگا فون منگوایا۔ تمام عملے اور قطاروں میں لگے حاجیوں کو متوجہ کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ہمارے یہاں ایک وی آئی پی حاجی تشریف لائے ہیں۔ وہ نہ قطار میں لگ سکتے ہیں نہ اپنی باری کا انتظار کر سکتے ہیں، اس لیے آج ہم اپنے تمام اصول توڑ کر ان کا معائنہ سب سے پہلے کریں گے ورنہ وہ پاکستان میڈیکل مشن کے خلاف اخباروں میں لکھ کر ہماری نوکریوں کو خطرے میں ڈال دیں گے۔ پھر میں نے اس وی آئی پی صحافی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ حاجی صاحب آپ سب سے آگے تشریف لے آیئے۔ ہر شخص اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ خود حیران پریشان کھڑا مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرے دوبارہ

پکارنے پر نہ جانے کیوں وہ بڑبڑاتا ہوا تیزی سے ہمارے ہاسپٹل سے باہر نکل گیا۔

باوردی حاجی

حج پر ایک گروپ آرمی سے بھی جاتا ہے جس میں اخراجات تو ہر شخص خود برداشت کرتا ہے مگر اس کے سارے انتظامات جی ایچ کیو کے زیرِ اہتمام ہوتے ہیں۔ حج پر اس گروپ کا فرق بھی دوسرے گروپس سے اسی طرح ہوتا ہے جس طرح ہمارے نئے یا پرانے پاکستان میں ہم وردی والوں کا عوام سے دیکھنے میں آتا ہے۔ سب تو نہیں مگر اکثر احرام پہن کر بھی خاکی رہتے ہیں۔ ان کے علاج معالجے کی ذمہ داری بھی حج میڈیکل مشن کی ہی ہوتی ہے۔ بس ڈیوٹی دینے والا ڈاکٹر اور اسٹاف اگر آرمی میڈیکل کور سے نہ ہو تو اسے مکمل ادب و آداب سکھا کر بھیجا جاتا ہے۔

رمی ہو جائے تو آپ منیٰ میں کہیں اونچائی پر کھڑے ہو کر نظر دوڑائیں، آپ کو ہر طرف قطار در قطار دور تک گنجے انسان نظر آتے ہیں اور سب ایک جیسے ہی لگتے ہیں۔ شکل وصورت سے بندہ اور بندہ نواز کا فرق مٹ جاتا ہے۔ اگر کوئی سینئر آفیسر بھی ماتڑ سی شکل وصورت کا ہو تو ٹنڈ کرا کر وردی میں نہ ہونے کی وجہ سے سپاہی نتھو خان جیسا ہی لگتا ہے۔

رمی کے بعد حاجی مدینہ روانہ ہونے لگیں تو ان کے ساتھ میڈیکل ٹیمیں بھی روانہ کرنی پڑتی ہیں اور اس طرح منیٰ اور مکہ میں کہیں کہیں عملے کی کمی کا سامنا ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں ہم مشن میں ایڈمنسٹریشن والے لوگ بھی مریض دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں نے ایک دن سوچا کہ آرمی حج گروپ کو نمازِ فجر کے بعد میں خود دیکھنے چلا جایا کروں گا۔ میں چوں کہ خود بھی گنجا ہو چکا تھا اور سر پر سفید ٹوپی اور منہ پر ماسک کے ساتھ افسری سے جان چھڑا کر ایک عام سا انسان ہی دکھائی دیتا تھا۔ میں پہلے دن مریض دیکھنے بیٹھا تو ہر آنے والے سے کہتا، جی حاجی صاحب تشریف رکھیے، جی حاجی صاحب تکلیف بتائیے۔ انھی حاجیوں میں ایک شخص کو میں نے حاجی صاحب کہہ کر تشریف رکھنے کو کہا تو اس نے بہت برا منایا اور کہا کہ ڈاکٹر تمھیں بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ کیا نام ہے تمھارا اور یہ ماسک اتارو تا کہ تمھاری شکل نظر آئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ حاجی ابھی تک وردی میں ہے اور کوئی سینئر آفیسر ہے۔ میں نے ماسک اتار دیا اور پھر کہا کہ حاجی صاحب تکلیف بتائیے۔ صاحب نے اپنے قد کاٹھ اور شکل وصورت سے بھی زیادہ رعب

دار آواز میں کہا کہ میں لیفٹیننٹ جنرل اے بی سی ہوں۔ میں فوراً بیماری سمجھ کر کھڑا ہو گیا اور عرض کی کہ سر میں لیفٹیننٹ کرنل بشیر آرائیں ہوں، آپ تشریف رکھیے۔ کہنے لگے، کیا تم ہی ڈپٹی میڈیکل مشن ہو؟ میں نے ادب سے جی کہا تو کہنے لگا، تم نے یہ کیا حاجی صاحب حاجی صاحب کی گردان لگا رکھی ہے۔ کیا مکہ پہنچ کر تم سارے قواعد بھی بھول گئے ہو۔ میں نے ادباً کہا کہ سر اللہ کے مہمانوں کو اسی طرح مخاطب کرتا ہوں مگر آئندہ خیال رکھوں گا۔ میرے مؤدبانہ ادب اور لہجے پر وہ خوش ہوئے اور کچھ میڈیسن لے کر باوردی حاجی کی چال چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

میں واپس پاکستان ہاؤس پہنچا تو مجھے بریگیڈیئر ندیم احمد نے اپنے آفس بلا کر کہا کہ آرمی حج گروپ میں کسی جونیئر کو بھیجا کرو، خود جانے کی ضرورت نہیں۔ میں ان کی ان کہی بات بھی سمجھ گیا اور سوچا کہ پوسٹ مشن رپورٹ میں لکھوں گا کہ وردی میں بھی حج کرنے کی اجازت ہونی چاہیے یا سینئر حاجی احرام پر رینک لگا لیا کریں تا کہ مکہ پہنچ کر بھی ان کی شان وشوکت پر کوئی آنچ نہ آنے پائے مگر کیا کرتا مذہبی طور پر احرام تو ضروری ہے، مگر دنیاوی طور پر اپنی نوکری زیادہ پیاری تھی، اس لیے رپورٹ میں ایسا کچھ بھی نہ لکھ پایا۔

پاک فوج زندہ باد

حاجیوں کو ثواب کمانے کا ایسا چسکا پڑ جاتا ہے کہ انھیں باجماعت نماز، طوافِ کعبہ اور تسبیح کے علاوہ کچھ سنائی یا دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اردگرد اپنے ساتھ حج پر آئے انسانوں کی کسی تکلیف میں مدد اس لیے نہیں کر پاتے کہ کہیں ان کی باجماعت نماز نہ چھوٹ جائے۔ عبادت کا وقت ضائع نہ ہو جائے۔ وہ کسی گرے پڑے بیمار حاجی کو دیکھ کر بھی چپ چاپ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ حج پر آئے ہیں تو صرف عبادت کریں گے اور اللہ راضی ہو جائے گا۔

ایک دن نمازِ عشا کے بعد میں حسبِ معمول وارڈ میں بیٹھا تھا کہ مجھے ایک پاکستانی موبائل نمبر سے فون آیا۔ سلام کے بعد فون کرنے والے نے میرا نام پوچھنے کے بعد کہا کہ ہم سبی بلوچستان سے بول رہا ہوں۔ ہمارا بوڑھا ماں باپ حج پر مکہ میں ہے مگر تین دن سے ان کے فون بند ہیں اور ہم سے کوئی رابطہ نہیں۔ ہم بہت پریشان ہوں۔ ہمارا مدد کرو۔ میں نے اس سے پوری تفصیل لے کر اس کے فون نمبر کے ساتھ لکھ لی اور ان سے دوبارہ خود رابطہ کرنے کا وعدہ

کیا۔تمام تفصیل ڈائریکٹر حج اور خدام حجاج کے اسٹاف کو دے کر ان کے والدین کو ڈھونڈنے کا کہہ دیا۔تمام کلینکس پر بھی بتا دیا کہ اس نام کے کوئی حاجی بیمار ہوں تو فوراً مجھے اطلاع دی جائے۔

پاکستان آرمی کے خدام حجاج (سولجرز) واقعی حاجیوں کی خدمت کو اصل عبادت سمجھ کر یہ ڈیوٹی انجام دیتے ہیں۔ دوسرے دن ظہر کی نماز کے بعد دو بلوچ بزرگ میاں بیوی بیماری کی حالت میں پاکستان ہاؤس ہاسپٹل میں لائے گئے۔ ان کے موبائل چارج نہیں تھے۔ ان کے گروپ کے تمام حاجی زیادہ ثواب کمانے کے لیے اپنی اپنی عبادتوں میں مشغول تھے اور یہ دونوں اپنے کمرے میں بیمار پڑے تھے۔ اردو بول نہیں سکتے تھے، اس لیے کسی سے مدد بھی نہیں مانگ سکے۔ ہاسپٹل میں اسٹاف نے ان کی دیکھ بھال شروع کی، اور جب دو چار گھنٹے کے بعد وہ بات کرنے کے قابل ہوئے تو میں نے شام کے وقت سبی پاکستان ان کے بیٹے کا نمبر ملا کر السلام علیکم کہنے کے بعد اپنا موبائل اس کی ماں کے ہاتھ میں دے دیا۔ ان کی کیا بات ہوتی رہی مجھے نہیں معلوم کیوں کہ میں بلوچی زبان نہیں سمجھتا مگر وہ عورت بات کرتے ہوئے بار بار میری طرف دیکھتی اور اپنے آنسو صاف کرتی۔ دونوں ماں باپ نے تسلی سے اپنے بیٹے سے بات کر کے فون مجھے واپس پکڑا دیا۔

ان کے بیٹے نے مجھ سے بغیر کسی تمہید کے کہا کہ کرنل صاحب ہم آپ کو نہیں جانتا، بس ایک بات کہتا ہوں، ہم آج تک فوج کے خلاف باتیں کرتا رہا ہوں کیوں کہ ہمارا سردار کہتا ہے، فوجی ہمیں تنگ کرتے ہیں مگر آج سے پاک فوج زندہ باد کا نعرہ لگانا شروع کروں گا۔

میرا چھوٹا سا جھوٹ

کچھ دن پہلے ایک لیڈی آفیسر لیفٹیننٹ کرنل فضیلہ یونس اپنی فیملی کے ساتھ میرے گھر آئی۔ یہ وہ افسر ہے جو دو دفعہ میرے انڈر کمانڈ رہی اور نوکری کے دوران مجھ سے خوب ڈانٹ کھاتی رہی مگر میں نے اسے اپنی بیٹی کی طرح تربیت دے کر ایک بہت اچھی آفیسر بنا دیا جس کی جھلک اس کی شخصیت میں اب نمایاں نظر آتی ہے۔ اسے جب بھی موقع ملے، وہ ہمیں اپنے سیکنڈ میکے کی طرح ملنے آتی ہے۔ کھانے پر باتیں کرتے ایک حاضر سروس میجر جنرل عادل حسنین کا ذکر نکل آیا جو کراچی کا رہائشی ہے اور آج کل راول پنڈی میں ایک میڈیکل کالج کا

کرتا دھرتا ہے۔ پندرہ سال پہلے وہ میجر تھا مگر پھر اس سے میرا کوئی رابطہ نہ رہا۔ میں نے اس جنرل آفیسر کا نمبر لیا اور اسے میجر جنرل بننے کی مبارک باد کا پیغام لکھ بھیجا کہ اگر وہ مجھے پہچان لے گا تو خوش ہوگا کہ ہم ریٹائر ہو کر بھی اپنے جونیئرز کی ترقی پر خوش ہوتے ہیں اور مبارک باد کے ساتھ دعائیں بھی بھیجتے ہیں۔ اس میجر جنرل کا فوراً ہی ایسا جواب آیا کہ مجھے ۲۰۰۶ء کے حج میڈیکل مشن کا ایک اور واقعہ یاد آ گیا۔ سوچتا ہوں میں فوج کا کیسا افسر تھا کہ حج پر اور وہ بھی مکہ مکرمہ میں بھی کیسی کیسی ہیرا پھیریاں کرتا تھا۔

ہم نے مکہ سے آ کر منیٰ میں ڈیرے ڈالے۔ کیمپ لگایا، پاکستان میڈیکل مشن کا ہاسپٹل ترتیب دیا اور اس پر پاکستان کا جھنڈا خوب بلند کر کے لہرا دیا تاکہ ہمارے حاجیوں کو اپنا ہاسپٹل دور سے بھی نظر آتا رہے اور وہ آسانی سے ہمارے پاس پہنچ سکیں۔ چوں کہ ہم سب لوگ بھی احرام میں تھے، اس لیے میڈیکل مشن کی پہچان کے لیے سب اپنے گلے میں ڈاکٹر اور میڈیکل اسٹاف کا ٹیگ لٹکاتے تھے اور میں ڈپٹی ڈائریکٹر حج میڈیکل مشن کا۔ میں نے اپنے خیمے کو ہی اپنا دفتر بنا رکھا تھا کیوں کہ یہاں سونے کا وقت تو مشکل سے ہی ملتا تھا۔ پہلی ہی رات عشا کے بعد میں وارڈ کا دورہ کر رہا تھا کہ ایک حاجی پریشانی کی حالت میں مجھ سے ملنے آیا اور تعارف کروایا کہ سر میں بھی آرمی میڈیکل کور سے میجر عادل حسنین ہوں۔ پرائیویٹ طور پر اپنی ماں اور بیوی کے ساتھ حج پر آیا ہوں مگر ہمارا ایجنٹ ہمیں منیٰ لا کر خود غائب ہو گیا ہے اور ہم دسیوں دوسرے متاثرین کے ساتھ سڑک پر بیٹھے ہیں اور بہت پریشان ہیں۔ آپ کی مدد کی ضرورت ہے تاکہ کسی طرح ہم حج کے دن امن سے گزار سکیں۔

وزارتِ مذہبی امور کی طرف سے حج میڈیکل مشن کو ہدایات ہوتی ہیں کہ مریض کے علاوہ مشن سے باہر کا کوئی شخص ہمارے خیموں میں نہیں رہ سکتا۔ میں سوچنے لگا کہ حج ایجنٹ کو ڈھونڈنا تو میرے بس کی بات نہیں مگر اس میجر اور اس کی فیملی کے لیے ایک چھوٹی سی بے ایمانی کر کے حج کے دن گزارے جا سکتے ہیں۔ میں نے میجر صاحب کو اپنے خیمے میں اور اس کی ماں اور بیوی کو اپنی ایڈمن آفیسر میجر معصومہ یوسف کے خیمے میں رہنے کی اجازت دے دی مگر ڈر تھا کہ بریگیڈیئر ندیم احمد جو ہمارے ڈائریکٹر حج میڈیکل مشن تھے، انکار کر دیں گے اور وہی ہوا۔ ان کو پتا چلا تو ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ وہ کہنے لگے، ان کو فوراً کیمپ سے باہر نکالو کیوں کہ یہ وزارتِ

مذہبی امور کی ہدایات کی خلاف ورزی ہے۔

میں نے جھوٹ بولا کہ سر یہ سب بیمار ہیں۔ان کی دیکھ بھال بہت ضروری ہے اور وارڈ میں مزید مریض رکھنے کی گنجائش نہیں۔اب وہ لاجواب ہوگئے۔میں نے تینوں کا ہاسپٹل میں ایڈمشن کر دیا مگران کو اپنے خیموں میں ہی رکھا۔پھر کیا تھا،ہم صبح اٹھ کر عرفات چلے گئے اور اس طرح میں نے ان تینوں کو حج میڈیکل مشن کے لوگوں میں رکھ کر ان کا طوافِ وداع بھی کروا دیا۔میجر عادل مجھے روز کہتے کہ سر،امی آپ کو بہت دعائیں دیتی ہیں۔آپ یہ نہ کرتے تو ہم سڑک پر رہ کر حج کیسے کر سکتے تھے مگر ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ جاتے کہ سر آپ نے ہمارے لیے جو جھوٹ بولا اور بے ایمانی کی، اللہ آپ کو اس کے لیے معاف کرے۔میں ہنس کر چپ ہو جاتا کہ یہ میرا اور اللہ کا معاملہ ہے۔ معافی مانگتا رہتا ہوں اور پروردگار میری نیت دیکھ کر فیصلہ کرنے والا رحیم وکریم ہے۔

حج ختم ہوا۔ہم حج کے بعد ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر الگ ہوگئے۔پاکستان میں کبھی ساتھ پوسٹنگ نہ ہوئی۔ایک آدھ دفعہ فون پر بات ہوئی اور پھر پندرہ سال گزر گئے۔میں گیارہ سال پہلے ریٹائر ہوگیا تھا۔کل یک دم اسی آفیسر کے میجر جنرل کے رینک پر ترقی کا پتا چلا تو محبت سے اسے مبارک باد کا پیغام لکھ بھیجا۔اس کے جواب کو دیکھ کر سب یاد آ گیا اور حد ہے کہ سترہ سال بعد اس آفیسر نے بھی حج پر پیش آنے والے واقعے کو یاد رکھا ہوا ہے اور اسی محبت سے تذکرہ بھی کر دیا۔یقیناً پڑھ کر آپ بھی حج مشن میں میری ہیرا پھیریوں اور جھوٹ کے مزے لیں گے،جیسے میں بھی سالوں بعد یاد کر کے لیتا رہتا ہوں۔

فوجی انگلش

میں نے ۱۹۹۵ء میں ۴۰۳ فیلڈ ہاسپٹل وسچا کیمپ بوسنیا ہرزیگوینا جا کر کمانڈ سنبھالی تو پہلا مسئلہ ان کی زبان تھی۔مگر میری سہولت کے لیے یواین مشن والوں نے انگلش بولنے والی ایک ترجمان لڑکی عامرہ سائلووِچ ہاسپٹل میں تعینات کر دی۔

ایک دن کہنے لگی کہ آپ کے آفیسر سے اچھے تو آپ کے سولجر ہیں جن کو کسی ترجمان کی ضرورت نہیں پڑتی۔آج آپ کے ڈرائیور نے مجھے اپنی گھڑی ٹھیک کروانے کو دی تو میں نے

کہا، آئی وِل ناٹ کم ٹو مارو۔

ڈرائیو کہنے لگا، نو پرابلم۔ یو کم ٹو مارو، تھری مارو یا فور مارو۔ پلیز برنگ۔

اپنی ترجمان کی بات سن کر میں اپنے ڈرائیور کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا اور تب سے میں نے بھی پرسوں اور اترسوں کے الفاظ فوجی انگلش میں ہی بولنا شروع کر دیے۔

ہرلے — نیو یارک میں چند دن

آج صبح آلو کے پراٹھے کا ناشتا کروانے کے بعد میرے ماموں زاد بھائی ندیم یعقوب اور اس کی بیگم نے ہمیں ہرلے کے مضافات کی سیر کروانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ ہم گھر سے نکلے تو ساری وادی کئی دنوں بعد نکلنے والی دھوپ میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ شہر سے نکلتے ہی گھنے جنگل سے گزرتے ایسا لگنے لگا جیسے گھنے درختوں کے بیچوں بیچ بل کھاتی اک موٹروے سے گزر رہے ہوں اور ندیم کی لگژری کار اس پر بھاگنے سے زیادہ ناچتی بل کھاتی فراٹے بھر رہی ہو۔ ہم میلوں تک جنگل سے گزرے مگر کہیں بھی تنہا ہو جانے کا شائبہ تک نہ ہوا۔ کہیں ڈر نہ لگا۔ کہیں بھی زندگی سے ناتہ نہ ٹوٹا۔ ہر جگہ سڑک سے تھوڑا سا ہٹ کر دونوں طرف لوگوں نے چھوٹے چھوٹے خوب صورت ہٹ بنا رکھے ہیں جہاں وہ دنیا کے ہنگاموں سے دور کچھ وقت خاموشی سے گزارنے آ بیٹھتے ہیں بلکہ بہت سے تو ان ہٹس میں مستقل رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں۔

ہم تو مسافر تھے، گزرتے ہی جا رہے تھے۔ کہیں کسی جگہ بہت دفعہ دل چاہا کہ ندیم سے کہوں یہاں اتار جاؤ مجھے۔ قدرت کے نظاروں سے باتیں کر کے میں کل خود ہی واپس آ جاؤں گا۔ مگر ایسا ممکن نہ تھا۔ جھومتے گھومتے جب گاڑی کو بریک لگی تو سامنے حدِ نظر تک پانی ہی پانی تھا جو چاروں طرف سے خوب صورت درختوں سے ڈھکے پہاڑوں کے حصار میں دو طرف سے قید تھا۔ یہ دریائے ھڈسن ہے اور اس کا کمال یہ ہے کہ اس کی اپنی مرضی ہے کہ جب اس کا دل چاہے شمال کو بہنا شروع کر دے اور دوسرے ہی لمحے رُخ بدل لے اور بہاؤ جنوب کی طرف ہو جائے۔ چوں کہ یہ جا کر سمندر میں گرتا ہے اور سمندر ہی کا فیصلہ ہوتا ہے کہ اس نے اگلے لمحے کس طرف بہنا ہے۔

امریکا کی اس خوب صورت وادی میں گھومتے مجھے مری ایبٹ آباد، گلگت اور چترال کی

بہت یاد آ رہی ہے مگر شرمندہ سا ہو کر رہ جاتا ہوں۔ دل چاہتا ہے، اپنے لوگوں کو آواز دوں کہ آؤ دیکھو، یہ سب کچھ ہماری وادیوں سے زیادہ خوب صورت تو نہیں ہے مگر ہم نے اپنا سب کچھ گندہ کر لیا ہے، اپنی وادیوں کو بھی اور اپنے ذہنوں کو بھی۔ ان کی وادیوں کو دیکھ کر لگتا ہے، یہ لوگ اپنے ہر پودے ہر درخت کو سنبھالنے میں لگے ہوئے ہیں اور میں اپنے رویے پر سوچتا ہوں تو لگتا ہے ہم اپنی وادیوں کو اجاڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہر درخت اور ہر پودے کو کاٹ دینے کا موقع ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ آج یہ بہت مزے کی سیر تھی مگر پاکستان کا سوچ کر دل گیر بھی تھا۔

شام کی چہل قدمی کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ عصر کی نماز کے بعد معمول کی چہل قدمی پر گھر سے نکل پڑا۔ یہاں اندھیرا ہو جائے تو راستہ بھولنے کا سو فی صد امکان رہتا ہے۔ ہر طرف گھپ اندھیرا ہو جاتا ہے اور لوگ باہر بتیاں اس لیے بجھا دیتے ہیں کہ کسی کے آرام میں مخل نہ ہوں۔ کسی کی آنکھوں کو برا نہ لگے۔

شہر کے قبرستان کے پاس سے گزرا تو قدم خود بخود اس شہرِ خموشاں کے اندر لے گئے۔ یہ بھی ایک خوب صورت پتھروں اور کتبوں کا شہر لگ رہا تھا۔ قبریں اس طرح قطاروں میں بنی تھیں کہ جیسے کسی نے قطار توڑی تو ہاتھ سے جنت نکل جائے گی۔ بے تحاشا دل چاہا کہ اس منظر کو کیمرے میں محفوظ کر لوں اور بعد میں اپنے ہم وطنوں کو بھی دکھاؤں۔ قبرستان میں پھولوں کی خوش بو اور ہری گھاس کے بچھے فرش کو دیکھ کر دل چاہا کہ مرنا تو ایک دن ہے ہی کیوں نہ یہیں بسیرا کر لوں، کم از کم اپنے گندے، اجڑے، کانٹے دار، جنگل جیسے قبرستانوں میں جہنم کے سے ماحول سے تو بچ جاؤں گا۔

ہرلے شہر تاریخی اعتبار سے بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اسٹون ہاؤسز (پتھر کے گھر) کے رہائشیوں کو ان گھروں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے وظائف سے نوازا جاتا ہے تاکہ شہر کا یہ تاریخی ورثہ زندہ رہے۔ جہاں جنرل واشنگٹن کا ۱۶/نومبر ۱۷۸۲ء کو ویسٹ پوائنٹ سے کنگسٹن جاتے ہوئے تاریخی استقبال ہوا تھا، میں وہاں سے بھی گزرا۔ برٹش آفیسر لیفٹیننٹ پارک ٹیلر کو جاسوسی کے الزام میں جس گارڈ ہاؤس میں قید رکھا اور پھر اسی گھر کے ایک سیب کے درخت سے لٹکا کر ۱۸/اکتوبر ۱۷۷۷ء کو پھانسی دی، میں اس مکان پر بھی جا رکا اور اس وان ڈینسن ہاؤس کو بھی دیکھا جو کنگسٹن شہر کو جلانے کے بعد دارالخلافہ کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ ان سب کو

۱۷۷۷ء میں کنگسٹن کے جلنے کے بعد ہرلے میں کیپٹل آف نیو یارک اسٹیٹ کی بلڈنگ۔

ہرلے میں برطانوی جاسوس لیفٹیننٹ ڈیوڈ ٹیلر کی قید کی جگہ۔

دریائے ہڈسن کا ایک دل فریب منظر۔

ہرلے کنگسٹن میں شہرِ خموشاں سے گزرتے ہوئے۔

کیمرے میں بھی محفوظ کرتا رہا۔

ہرلے شہر کی تاریخی لائبریری اور چرچ کی تصویر بھی لی مگر اس کے بعد سورج غروب ہونے لگا تو میں نے اپنی پوری توجہ اپنی چہل قدمی پر مرکوز کر کے گھر کا رُخ کر لیا کیوں کہ اگر میں راستہ بھول جاتا تو سوائے ندیم کو بلانے کے گھر پہنچنے کا کوئی اور وسیلہ نہ بچتا۔ گھر آتے آتے اندھیرا ہو چکا تھا اور یوں لگتا تھا کہ پورا شہر بس شہرِ خاموشاں ہے۔ عجیب ہو کا عالم تھا۔ مجال تھی، کوئی انسان دکھائی دے، کوئی آواز سنائی دیتی۔ میں سوچتا رہا کہ اگر کراچی کے ہنگاموں سے مزید اسی طرح زیادہ دن دور رہا تو بہت جلد دم گھٹنے لگے گا۔

بیٹی اک اداس سی

امریکا میں گھومتے ہوئے کچھ پاکستانی مہربانوں کے گھروں میں بھی وقت گزارنے کا موقع ملا۔ ہیوسٹن میں ایک بہت ہی خوب صورت گھر میں لمبے سفر کے بعد مغرب کے وقت پہنچے۔ دنیا جہان کی نعمتوں سے بھرا سجا گھر دیکھ کر دل سے دعائیں نکلیں کہ اللہ گھر والوں کو اس میں سکون کی زندگی سے نوازے رکھے۔ پُرتکلف کھانے پر خوب باتیں ہوئیں۔ ہر کوئی پاکستان کو یاد کر رہا تھا۔ اگلی صبح سو کر ہم کچھ دیر سے اٹھے۔ دیکھا تو تب تک گھر میں مکمل سناٹا تھا کیوں کہ تمام افراد اپنے اپنے کام پر جا چکے تھے۔

تین کنال کے محل نما گھر میں صرف ایک بائیس برس کی معصوم سی بچی تھی جو آٹھ ماہ قبل شادی ہو کر امریکا آئی تھی۔ اس کا میاں بھی اپنے کام پر جا چکا تھا۔ آج بچی ہمیں ناشتا کروانے کے لیے ہمارے انتظار میں کچن میں تنہا بیٹھی تھی۔ میں اس کے پاس کچن میں ہی جا بیٹھا اور ازراہِ مزاح کہا کہ بیٹا امریکا میں خوب مزے ہو رہے ہیں شادی کے بعد۔

نہ جانے وہ کب سے بھری بیٹھی تھی کہ جواب میں اللہ کا شکر کہتے ہی ہچکیوں سے رونے لگی۔ میں تو گھبرا ہی گیا کہ بچی کیوں رونے لگ گئی ہے۔ بہت محبت بھرے لہجے میں رونے کی وجہ پوچھی تو کہنے لگی، انکل بہت اداس ہوں۔ ہول ناک تنہائیاں ہیں امریکا میں۔ سب

لوگ صبح سویرے کام پر جاتے ہیں اور مغرب کے وقت واپس آ کر کھانا کھانے کے بعد فوراً ہی سو جاتے ہیں۔ سسرال بہت محبت کرنے والا خاندان ہے۔ میاں جان چھڑکتا ہے لیکن کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔

مجھے امی ابو کوئی بہن بھائی لا دیں، ایک لمحے کو گلے لگ جاؤں۔ یونی ورسٹی کے کسی دوست کے سامنے لے چلیں بات تو کرلوں۔ بچی ہم سے صرف پاکستان کی باتیں کرتی رہی۔

دنیا کی ہر نعمت میسر ہونے کے باوجود اس نے پچھلے گزرے چھ ماہ صبح سے شام تک گھر میں تنہائی کا ایسا ہول ناک نقشہ کھینچا کہ میری اپنی آنکھیں بھی آنسو روک نہ سکیں۔

ہم پاکستانی والدین دنیاوی سہولتوں سے متأثر ہو کر اپنی پاکستان میں نازوں پلی بچیوں کو جب بن دیکھے دیس میں بیاہتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ بڑے گھروں، بڑی گاڑیوں اور صرف بہت سارے پیسوں سے ان معصوم بچیوں کو کب تک بہلایا جاسکتا ہے۔ ان معصوموں کو بہت سارے لوگ بھی چاہییں جن سے وہ اپنی محبتیں بانٹ سکیں اور اصل خوشیاں تو صرف انسانوں سے ہی میسر ہو سکتی ہیں اور وہاں تو تنہائیاں ہیں ہر سُو، ہر طرف۔

آج چوں کہ ویک اینڈ تھا، اس لیے شام کو ہم پورے گھر والوں کے ساتھ باہر ڈنر کرنے گئے۔ بچی ایسے خوش تھی کہ جیسے عید ہو۔ اسے خوش دیکھ کر دل سے دعائیں نکلیں کہ پردیس بیاہی ہماری سب بیٹیاں ایسے ہی خوش رہیں۔ چہکتی رہیں تاکہ ہم پاکستان میں سکون سے سو سکیں۔

مٹی کی خوش بو

کورونا کی تباہ کاریوں کے بعد جیسے ہی موقع ملا میں دو دن کے لیے دبئی نکل گیا۔ مقصد صرف سیر سپاٹا تھا۔ پہلی ہی شام میرا دوست راجا ساجد مجھے ڈنر کروانے ایک چھوٹے سے انتہائی خوب صورت ریستوران پر لے گیا۔ کہنے لگا، اس ہوٹل کی مالکن ایک سکھ عورت گورمیت کور ہے اور لذیذ دیسی کھانوں کی وجہ سے پورے دبئی میں مشہور ہے۔ ہم پہنچے تو بہت محبت سے ملی۔ انڈیا کے شہر جالندھر کی روایتی پنجابی زبان بول رہی تھی۔

یاد رہے کہ میرا ننھال ۱۹۴۷ء میں ہجرت کر کے جالندھر سے گوجرہ لائل پور اور پھر نواب

شاہ سندھ آ بسا تھا۔ نانا نانی سے گھر میں ہجرت کی تکلیفیں اور قربانیوں کی اتنی داستانیں سن رکھی ہیں کہ اپنے ننہال کے گاؤں ان کی تحصیل اور شہر ازبر یاد ہیں۔ میرے پورے ننہال میں ماموں خالائیں اور میری بی بی جی جالندھر کے لب و لہجے میں پنجابی بولتے تھے اور صرف میاں جی کا لب ولہجہ لائل پوری تھا۔ چوں کہ ہم ننہال کے ساتھ سب اکٹھے ہی رہتے تھے تو مجھ سمیت بہن بھائیوں نے بھی پنجابی زبان کا وہی جالندھری لب ولہجہ اپنایا جو سب بڑے بوڑھے بولتے تھے۔ اب تو نئے دور میں مادری زبان بولنا ان پڑھوں کی نشانی ہے۔ انگلینڈ سے آیا کوئی پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور بھی منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی بولے تو ہم اسے کراچی یونی ورسٹی کا انگریزی والا پروفیسر سمجھ کر عقیدت سے ملتے ہیں۔

میں نے ایسے ہی پنجابی زبان کے مزے لینے کو گورمیت کور کے ساتھ جالندھری لب و لہجے میں بات کی تو وہ چونکی اور ہمیں ہماری ٹیبل دکھا کر وہیں رک گئی۔ آہستہ سے پوچھا، آپ کہاں سے آئے ہو۔ میں نے کہا، جالندھر سے۔ ہنس کر کہنے لگی، سچی دسو۔ میں نے کہا، میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔ بولی، اچھا پھر چلو جالندھر میں کہاں سے ہو۔ میں نے کہا، تحصیل نواں پنڈ کے ساتھ گاؤں ہے ہمارا۔ وہ حیران سی ہوکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ پنڈ داناں دسو۔ (گاؤں کا نام بتاؤ۔)

میں نے کہا، بی بی ہم ڈھولے وال کے ہیں مگر آپ کیوں پوچھ رہی ہو۔ اس نے دونوں ہاتھ زور سے ٹیبل پر مارے اور بولی جھوٹ نرا جھوٹ۔ ہوٹل میں بیٹھے باقی لوگ بھی متوجہ ہو گئے تو وہ شرمندہ سی ہوگئی۔ چوں کہ میں تو از راہِ مذاق نانا جی سے سنے یہ نام بتا رہا تھا مگر اب پریشان ہوگیا کہ وہ اتنی جذباتی کیوں ہو رہی ہے۔ عقیدت سے میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی، لے حدای ہوگئی آ، توں تے میرا وِیر نکل آیاں (لو حد ہوگئی، آپ تو میرے بھائی نکل آئے)۔ کہنے لگی، میں بھی ڈھولے وال نواں پنڈ جالندھر کی ہوں۔ میکا بھی وہیں کا، سسرال بھی وہیں سے مگر کسی وجہ سے میں پچھلے پندرہ سال سے اپنے گاؤں نہیں گئی۔ اب تو بے بے اور باپو بھی گزر گئے۔ میرے میاں کی وفات ہوگئی تو اس کا ہوٹل خود سنبھال رہی ہوں۔ جینا وی تو ہے۔ راجا ساجد یہ سب دیکھ اور سن کر مسلسل مسکرا رہا تھا۔

بہت محبت سے کھانا کھلایا۔ دسیوں دفعہ پوچھنے آئی کہ پسند کی کوئی اور ڈش بھیجوں۔ اصل مسئلہ اس وقت پیش آیا جب اس نے راجا ساجد سے بل کی رقم لینے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگی، کوئی

وِیراں کولوں (بھائیوں سے) بھی بل لیتا ہے۔آپ لوگوں نے مجھے میرے پنڈ کی گلیاں کوچے یاد کروا دیے۔ دل چاہ رہا ہے اڑ کے پہنچ جاؤں ڈھولے وال جہاں کی مٹی کی بنی ہوں۔ میرے ماپیاں دے پنڈ (میکے کے گاؤں) کی خوش بو آ رہی ہے آپ لوگوں سے۔

اب میں انتہائی رنجیدہ تھا کہ ایسا جھوٹ کیوں بولا۔ اب اسے حقیقت پتا چلے گی تو اس پر کیا گزرے گی۔ بہر حال کھانے کے بعد میں اٹھ کر منیجر آفس میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ موبائل پر اپنی وردی والی تصویر نکال کر اسے دکھائی تو اس نے موبائل پکڑ کر چوم لیا۔ ویرا تو فوجی بھی ہے۔ میں نے دل مضبوط کر کے کہا کہ میرا نِنہال آپ کے گاؤں سے ہجرت کر کے پاکستان آ گیا تھا اور میری پیدائش پاکستان کی ہے۔ میں پاک فوج سے بریگیڈیئر ریٹائر ہوا ہوں۔ وہ آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھ رہی تھی اور بڑے بڑے آنسو گرتے اس کی آنکھوں کا کاجل اس کے گالوں پر پھیلا رہے تھے۔

میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی، ویرا تیرا جھوٹ چنگا سی (بھائی تیرا جھوٹ اچھا تھا) تیرا سچ برا۔ سچ نہ ہی بتاتے۔ میں بھنگڑے ڈالتی رہتی۔ چل فیر وی شکریہ سب یاد کروانے کا۔ ملک دو ہیں، ہماری مٹی تو ایک ہی ہے۔ اگر آپ کے نانا نانی جیتے ہیں تو پاکستان پہنچ کر میری طرف سے ان کے ہاتھ ضرور چومنا۔ میں سمجھوں گی میں ڈھولے وال پہنچ گئی اپنے میکے۔ وہ بیٹھی آنسو صاف کرتی رہی اور میں اسے خدا حافظ کہے بغیر ہی اس کی طرف ہاتھ جوڑے الٹے پاؤں اس کے آفس سے باہر نکل آیا۔

کورونا کے دن

دنیا میں کورونا کی وبا پھیلی تو جہاں پوری دنیا میں تباہی مچی وہیں پاکستان بھی بہت متأثر ہوا۔ جیسے جیسے وبا پھیلتی گئی پاکستان میں عام انسانوں کی زندگی مشکل ہوتی گئی۔ ملک لاک ڈاؤن کی طرف گیا تو لوگوں کے کاروبار بند ہوئے۔نوکریاں گئیں۔سب سے زیادہ دہاڑی دار طبقہ بے روزگار ہوا۔ ریڑی لگا کر روزی کمانے والے، اسکول ٹیچرز اور فوڈ انڈسٹری میں کام کرنے والے لوگ بے روزگار ہوگئے۔ دو تین ماہ میں ہی لوگوں کی جمع پونجی ختم ہوگئی اور ان کو ایک وقت کھانے کے لالے پڑ گئے۔ بیمار پڑے تو دوائی خریدنے کی سکت نہ تھی۔اس پس منظر کی بہت سی یادیں ہیں جو میں مختلف اوقات میں قلم بند کرتا رہا۔

سستا سودا

آج کل ہم آفس سات بجے بند کر دیتے ہیں۔ میں گھر پہنچا تو ایک خاتون کا فون آیا اور پوچھنے لگی، کیا آپ بریگیڈیئر بشیر آرائیں بول رہے ہیں؟ میں نے جی کہا تو کہنے لگی، پچھلے دس دن سے ایک ڈاکٹر میرے میاں کو گھر میں رکھ کر علاج کر رہا ہے، لیکن آج سینے کا ایکسرے کروایا تو کہہ رہا ہے ان کو فوراً انجکشن ڈیکسا میتھازون صبح شام شروع کرنا ہے۔ ہم چار بجے سے ہر جگہ ڈھونڈ چکے ہیں، کہیں سے نہیں مل رہا۔ مجھے کسی نے آپ کا نمبر دیا ہے۔کیا آپ کے پاس ہے؟''

میں نے کہا، بہن آفس بند ہوگئے ہیں آپ کو انجکشن صبح مل جائے گا۔ وہ رونے لگی، پلیز میری مدد کریں، میں بہت پریشان ہوں۔ میرے میاں بہت بیمار ہیں۔ میں نے آدھے گھنٹے کی

مہلت مانگی۔ اپنے ایک اسٹاف سے کہا کہ آفس کھولو اور انجکشن اور ٹیبلٹ میرے گھر پہنچاؤ۔ جب دونوں چیزیں آ گئیں تو میں نے اس خاتون کا نمبر ملا کر پوچھا کہ بتایئے انجکشن کہاں بھجوا دوں؟ کہنے لگی آپ جگہ بتا دیں، میرے ابو لینے آ جائیں گے۔ پوچھنے لگی، اس کے کتنے پیسے ہوں گے؟ میں نے ازراہِ مزاح کہا، کتنے پیسے دے سکتی ہیں تو روتے ہوئے کہا، پلیز مناسب قیمت لگا لیں میں غریب خاندان سے ہوں بس زندگی گزار رہے ہیں۔ میں اپنے کہے الفاظ پر بہت شرمندہ ہوا اور کہا کہ بہن جی، ہم اس دوائی کے پیسے نہیں لیتے۔ کورونا کے مریضوں کو ہر چیز فی سبیل اللہ دیتے ہیں۔ میری یہ بات سنی تو مزید رونے لگی۔

میں نے اس کے موبائل پر اپنے گھر عسکری فور کا پتا بھیج دیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد ایک ستر سالہ خستہ حال بزرگ رکشے میں میرے گھر پہنچ گیا اور کہنے لگا جناب میں چار بجے سے ہر میڈیکل اسٹور پر جا رہا ہوں مگر یہ دوائی غائب ہے۔ میرا داماد بہت بیمار ہے اور میری بیٹی بہت پریشان۔ اللہ آپ کا بھلا کرے آپ نے ہمارا مسئلہ حل کر دیا۔

میں نے چپ چاپ دوائی کی تھیلی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ وہ دعائیں دیتا رکشے میں جا بیٹھا۔ رات کے دس بجے مجھے اسی خاتون کا دوبارہ فون آیا۔ وہ نہ جانے اب کیوں رو رہی تھی۔ میں ڈر گیا اور پوچھا، بہن کیا ہوا؟ کہنے لگی، میں ٹھیک ہوں۔ رو نہیں رہی، بس یوں ہی آپ سے بات کرتے رونا آ گیا ہے۔ ذرا ٹھہری اور کہا، بھیا خوش رہو ہمیشہ، ہمیشہ خوش رہو اور فون بند کر گئی۔

میں بیٹھا میڈیسن کی قیمت اور ہمیشہ خوش رہنے کی دعا کا حساب کر رہا تھا۔ جو دوائی میں نے بھجوائی تھی، وہ چھ دن کے انجکشن اور بعد میں چھ دن کی ٹیبلیٹ تھیں جس کی کل قیمت ایک سو دو روپے بنتی ہے۔

فی سبیل اللہ ایک سو دو روپے کی دوائی میں مریض اٹھ بیٹھا ہے۔ خاتون کا رونا بند ہو گیا ہے اور بھیا کو ''خوش رہو ہمیشہ'' کی دعائیں مل رہی ہیں۔

کیا یہ سستا سودا نہیں؟

وہ درویش عورت

میرے آفس کا ایڈریس بہت آسان ہے اور شاید اللہ تعالیٰ نے یہ بھی مجھے لوگوں کی آسانیوں کے لیے عطا کیا ہے۔ ملینیم مال راشد منہاس روڈ سے ڈالمیا روڈ پر مڑیں تو پی ایس او پیٹرول پمپ سے پہلے الٹے ہاتھ کو جاتی سڑک پر گلشنِ جمال میں داخل ہو جائیں۔ چار سو میٹر جانے کے بعد بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن لکھا نظر آ جائے گا۔

پہلے کورونا سے متاثر ہونے والی ایک خاتون نے مجھے فون کر کے ڈیکسا میتھازون کی گولیاں لینے کے لیے پوچھا اور دس منٹ میں میرے آفس پہنچ گئی۔ کہنے لگی، میرے میاں اور بیٹی ڈاکٹر ہیں۔ آپ کا سوشل میڈیا پر ایک پیغام پھیلا تو میں نے اپنی بیٹی کو دکھایا۔ کہنے لگی، اماں یہ میڈیسن بازار سے غائب ہوگئی ہے اور ہاسپٹل میں مریضوں کی پریشانی کی ایسی ایسی باتیں سنائیں کہ میں رو پڑی۔ آج ملینیم مال میں کچھ خریداری کے لیے آئی تو خیال آیا کہ آپ کا ایڈریس اسی علاقے کا ہے تو کیوں نہ خریداری سے کچھ پیسے بچا کر یہ میڈیسن خرید کر بیٹی کو دے دوں تاکہ وہ کسی ضرورت مند مریض کو دے سکے۔

ایک ڈبے میں گولیوں کی تعداد اور قیمت پوچھنے لگی۔ میں نے عرض کیا کہ ایک ڈبے میں سو گولیاں ہوتی ہیں مگر ہم بلا قیمت دیتے ہیں، آپ لے جایئے۔ کہنے لگیں، میں تو خریدوں گی اور پانچ پانچ ہزار کے دو نوٹ نکال کر میری میز پر رکھ دیے۔ میں نے کہا، بہن جی یہ دوائی بہت سستی ہے۔ ڈبے پر لکھی گئی قیمت چونسٹھ روپے ہے مگر ہم تیس فی صد رعایتی قیمت پر دیتے ہیں۔ میری طرف حیرت اور پریشانی سے دیکھ کر کہنے لگی تو پھر یہ غائب کیوں ہے بازار سے؟

چپ چاپ پانچ سو روپے نکال دیے۔ میرے آفس کے لڑکے نے بقایا پچاس روپے اور دس پیکٹ ٹیبلیٹ لا کر دے دیے۔ جانے لگیں تو میں باہر دروازے تک خدا حافظ کہنے گیا۔ جاتے جاتے رکیں اور بولیں کہ میں نے آج گھر کے لیے بیس ہزار کا سامان خریدا ہے۔ یہ اتنی سستی دوائی ہے اور مریض رُل گئے ہیں۔

بھرائی ہوئی آواز اور آنکھوں میں نمی لیے کہنے لگیں، بیس ہزار کی شاپنگ کے بعد اللہ کی راہ میں صرف ساڑھے چار سو روپے۔ آپ نے بہت زیادتی کی میرے ساتھ۔ دس ہزار رکھ لیتے تو میں آپ کو بہت دعائیں دیتی۔ اب اس دس ہزار کا میں کیا کروں گی۔

جاتے جاتے ایک اور تیر چلایا۔ بولیں، بریگیڈیئر صاحب بہت خود غرض ہیں آپ۔ کیا کریں گے ساری نیکیاں خود سمیٹ کر۔ ہمیں بھی شامل کرلیں۔

میں ہکا بکا کھڑا اس درویش عورت کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک اس کی کار میری آنکھوں سے اوجھل نہ ہوگئی۔ میں نے یہ بات سوشل میڈیا پر لکھ دی۔

اس درویش عورت کی کہانی کیا لکھی، میرے اپنے دوست بھی مجھے چھوڑ کر اس نیک بخت کے ساتھی بن گئے۔ ہر کوئی اس کے کہے الوداعی جملے کو دُہرانے لگا۔ دو دن سے ہر آنے والے فون پر مجھے السلام علیکم کہنے کے بعد یہی سننے کو ملا کہ ''اکیلے نیکیاں کما کر کیا کرو گے؟'' ہم لوگوں کو بھی اس مشکل گھڑی میں اپنے ساتھ شامل کر لو تا کہ مزید سفید پوش لوگوں کو بغیر مانگے ضرورت کی میڈیسن ملتی رہے۔ میں نے ہزار کہا کہ بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن کا نہ کوئی بینک اکاؤنٹ ہے، نہ میں نے اس میں کبھی کوئی ڈونیشن لی ہے۔ کیوں کہ اگر آپ کی اپنی چھت ہو، آپ بچوں کو پڑھا لکھا کر ان کی شادیاں کر چکے ہوں، آپ تینوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہوں، رب کریم تندرستی ایسی بخشے کہ زندگی کی ساتویں دہائی میں سر درد کی دوا بھی نہ کھانی پڑے، کسی کے قرض دار نہ ہوں، رات کو لمبی تان کر سوتے ہوں، دو دن کسی دوست احباب کو فون نہ کریں تو وہ آپ کی خیریت پوچھنے آپ کے گھر پہنچ جائیں۔ تو پھر بتائیے کسی غریب یا سفید پوش مریض کو میڈیسن خرید کر پہنچانے کے لیے آپ کسی ڈونیشن کا انتظار کریں گے۔

مگر کیا کرتا، اکیلے نیکیاں کمانے اور خود غرض ہونے کا اس درویش عورت کا چلایا تیر بھی دل میں چبھتا رہا اور وہ نیک بخت دریا کا پہلا قطرہ ثابت ہوئی۔

لاہور سے سردار آصف نے اتنی رقم بھجوا دی ہے کہ دو دن میں لاہور میں ہی لوگوں کو مفت میڈیسن کا بندوبست ہوگیا۔ ای فارما کے ڈائریکٹر فہد الیاس نینی تال والا نے ڈیکسا کے ڈھائی ہزار انجکشن فری بھجوا دیے۔ سیموس کے مالک تنزیل الرحمٰن نے ڈیکسا کی دو لاکھ ٹیبلیٹس نفع کے

بغیر دے دی ہیں۔ کیراوے فارما سے عمر فاروق نے ایزیتھرومائسن کی کھیپ پہنچا دی ہے۔
میں شکر گزار ہوں ان دوستوں کا جن کی وجہ سے مجھ پر سے اکیلے نیکیاں کمانے اور خود غرض ہونے کا الزام دو دن میں دھل گیا اور اب میرا کام تو صرف سہولت کار کا رہ گیا ہے۔
بلیک میں دوائیاں بیچنے والے اب مارکیٹ سے غائب ہیں اور میں اس انتظار میں ہوں کہ کب وہ چپکے سے آ کر ذخیرہ کی ہوئی دوائیاں میرے آفس کے باہر چھوڑ جائیں اور اس پر ایک چٹ لگی ہو۔

''کمانے میں وہ لذت کہاں جو خلقِ خدا کے لیے خرچ کرنے میں ہے۔''

وہ درویش عورت عاصمہ حسین ہے جواب مجھے بہنوں کی طرح ملنے آتی رہتی ہے۔

لیڈی ڈاکٹر کی بپتا

کورونا کی تباہ کاریاں ہر طرف پھیلنے لگی تو میں ینگ ڈاکٹرز کے لیے سامان لے کر جناح ہاسپٹل کراچی گیا تو مجھے ایک لیڈی ڈاکٹر پروٹیکٹو سوٹ میں لپٹی کاؤنٹر شیلڈ کے اندر بیٹھی مل گئی۔ کہنے لگی، سر میں ایک ایف سی پی ایس پارٹ II کی ٹرینی ہوں اور آج کل روٹیشن پر میری ڈیوٹی آئی سی یو میں بھی لگتی ہے۔ کورونا سے مجھے بھی اسی طرح ڈر لگتا ہے جیسے عام لڑکیوں کو لیکن ایک فرق ہے کہ میری ہم عمر ساری لڑکیاں گھروں میں بیٹھ گئی ہیں اور شاید اب وہ اپنے بچوں کو زیادہ وقت بھی دے رہی ہوں گی لیکن میرے ساتھ اور مجھ جیسی باقی لیڈی ڈاکٹرز کے ساتھ الٹا ہو گیا ہے۔
دو رات پہلے جب میرے آئی سی یو میں نرسنگ اسسٹنٹ اور ایک جوان عورت کی تیز بخار اور سانس کی تکلیف میں باوجود وینٹی لیٹر پر ہونے کے، موت ہو گئی تو میں بہت روئی۔ خوب خوب روئی جیسے میں خود مر گئی ہوں اور اپنی موت پر خود ہی رو رہی ہوں۔
میں ان دونوں پر تین دفعہ رات کی ڈیوٹی کر چکی ہوں اور سب کہتے ہیں کہ ان کو کورونا انفیکشن ہونے کا شک تھا۔ اگر یہی سچ ہے تو میں بھی کورونا کا پکا انفیکشن لے چکی ہوں۔ ٹیسٹ کروانے کا کوئی بندوبست نہیں۔ بس ڈر کے مارے گھر نہیں جا رہی کہ گھر پہنچنے پر جب میرا دو

سال کا اکلوتا بیٹا بھاگ کر مجھ سے لپٹے گا تو کیا کروں گی۔ تین دن سے ہاسپٹل میں ہوں۔ میاں سے کپڑے منگوا لیے ہیں اور وہ بھی دور سے ہی لیے تا کہ میاں اور بیٹا محفوظ رہیں۔

کبھی خیال آتا ہے کہ کیوں بنی ڈاکٹر؟ کتنے مزے میں ہیں وہ لڑکیاں جو گریجویشن کر کے شادی کرتی ہیں اور میاں کی خدمت کر کے خوش ہوتی ہیں۔ خوب فیشن کرتی ہیں۔ گھومتی پھرتی ہیں اور اپنے بچوں کو بھی محبت اور توجہ سے پالتی ہیں۔

دوسری طرف مجھ جیسی لیڈی ڈاکٹرز ہیں جن سے نہ گھر والے راضی ہوتے ہیں، نہ ہاسپٹل میں لوگ وہ عزت دیتے ہیں جس کے خواب ہم سب نے ڈاکٹر بننے سے پہلے دیکھے تھے۔ خود کے لیے وقت کہاں سے لائیں کہ ہم تو اپنے بچوں کو بھی وقت نہیں دے سکتیں۔

اب کورونا نے قیامت ڈھائی ہے تو وہ لوگ جو ہمیں قصائی ڈاکٹر کہتے تھے، ہمیں قوم کا سپاہی کہہ رہے ہیں۔ ہمیں کسی سے بھی کوئی گلا نہیں مگر جس طرح ہم اپنے فوجی سپاہیوں کو بندوق دے کر سرحد پر حفاظت کے لیے کھڑا کرتے ہیں پلیز ہمیں بھی کچھ حفاظتی چیزوں کا بندوبست تو کر دیں۔ ہم تو ایسے بے یار و مددگار سپاہی ہیں کہ جو دشمن کے وار سے خود کو بھی نہیں بچا پا رہے۔ نہ کوئی مورچہ ہے نہ کوئی بندوق۔ لگتا ہے غازی بنیں نہ بنیں شہید پکے ہوں گے۔

اللہ بھلا کرے کافروں کا جنھوں نے اسمارٹ فون اور واٹس ایپ کی سہولت مہیا کر رکھی ہے ورنہ تو تین دن سے اپنے بچے کو بھی نہ دیکھ پاتی۔ میرا بیٹا پوچھتا ہے، مما گھر کب آ ؤ گی تو دوسری طرف منہ کر لیتی ہوں کہ آنسو نہ دیکھ لے۔ بس کورونا سے بچ گئی تو پندرہ دن بعد ضرور گھر جاؤں گی۔

اس یقین کے ساتھ ڈیوٹی کر رہی ہوں کہ میرے ڈر کے بھاگ جانے سے اگر کسی مریض کو طبی امداد نہ ملی تو میری ڈاکٹری کا کیا فائدہ۔ مزید یہاں ہاسپٹل میں پڑے رہنے کا ایک ذاتی فائدہ بھی ضرور ہے کہ اگر مجھے کورونا انفیکشن ہو چکا ہے تو میرے دور رہنے سے میرا بیٹا اور میاں بھی تو محفوظ ہیں۔

بیٹے کو گلے لگانے کو بہت دل چاہتا ہے مگر آئی سی یو میں پڑے لوگوں کو بھی نہیں چھوڑ سکتی کیوں کہ اب تو آپ سب ہم ینگ ڈاکٹرز کو قوم کے سپاہی کہنے لگے ہیں۔ اب ہم سب نے لڑنا ہے یا مرنا ہے۔ نہ رہی تو فیصلہ آپ ہی کر لینا کہ میں ماں اچھی تھی یا ڈاکٹر سپاہی۔

میں نے تہیہ کیا کہ ہر دوسرے تیسرے دن اس ڈاکٹر سے رابطہ رکھوں گا۔

آج ینگ ڈاکٹرز کے آفس میں اس سے پھر ملاقات ہوگئی۔ خوش دکھائی دی۔ کہنے لگی، سر میرا کورونا ٹیسٹ نیگیٹیو ہوگیا ہے مگر سب سے اچھی بات کہ مجھے صحیح سے جینا بھی آ گیا ہے۔ سر بشیر، آپ نے کہا تھا ناں کہ "اگر جینے کی خواہش ہے تو دوسروں کے جینے کا سبب بن جاؤ۔" اور آپ کے اس فلسفے نے مجھے زندہ رکھا۔

میں یہ تو نہیں کہتی کہ میں نے موت کو دیکھا ہے مگر میں نے ان پندرہ دنوں میں چپ چاپ موت کا انتظار ضرور کیا ہے۔ اب ایمان کی حد تک یقین کرنے لگی ہوں کہ ہم انسان جتنا کورونا وائرس سے ڈر کر گھروں میں دبکے بیٹھے ہیں، اگر اس کا ہزارواں حصہ بھی اپنے رب سے ڈر کے رہیں تو کورونا کیا کرلے گا؟ کورونا نے میرا کیا کرلیا؟

صرف ایک وعدہ کیا تھا اپنے رب سے کہ زندہ بچ گئی تو تیرے لیے جیوں گی۔ اب مجھے کسی چیز سے ڈر نہیں لگتا، صرف اپنے رب سے لگتا ہے۔ اب بیٹے کے مستقبل کو محفوظ بنانے کی فکر بھی ختم ہوگئی ہے کہ وہ تو میرے رازق کی ذمہ داری ہے، میری بالکل بھی نہیں۔

جس دن میرا کورونا ٹیسٹ پازیٹیو آیا تھا ایسا لگتا تھا کہ بس ہر چیز ختم ہوگئی ہے۔ سر یقین کریں تمام رشتے، تمام رعنائیاں، تمام خواہشیں مٹی ہوگئی تھیں ایک لمحے میں۔ اگر کوئی خواہش تھی تو صرف ایک، اے ربِ کریم جینے کا ایک موقع اور دے دے۔

میں نے سوچا مرنا تو ہے ہی کیوں نہ کورونا کے مریضوں کی دیکھ بھال کرتے مروں۔ اس لیے اپنی ڈیوٹی کووڈ وارڈ میں لگوالی۔ میرے پہلے آئی سی یو میں جو دو لوگ کورونا پازیٹیو تھے، ایک اپنے رب سے جا ملا اور ایک میری طرح اپنے گھر والوں میں واپس آ گیا ہے۔

مجھے اس پورے عرصے میں دو لوگ یاد آتے تھے، ایک میرا بیٹا اور ایک میرا رب۔ میں دونوں سے دوبارہ ملنا چاہتی تھی قریب سے۔ بیٹا یاد آتا یا رب، بس وضو کر کے سجدے میں پڑ جاتی اور موبائل پر سورۂ رحمٰن لگا کر آنکھیں بند کر لیتی اور روتی رہتی کہ میں نے اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا کیوں نہ سیکھا لیکن جو پچھلے انتیس سال میں نہ سیکھ سکی، ان پندرہ دنوں میں سیکھ لیا ہے۔ اب دیکھ لیں، دونوں سے آ ملی ہوں۔ اپنے بیٹے سے بھی، اپنے رب سے بھی اور

دونوں سے اب پہلے سے زیادہ محبت کرنے لگی ہوں۔

سر مجھے آپ سب کی دعائیں پہنچتی رہیں اور لگتی بھی رہیں۔ میں شہید تو نہیں ہوئی مگر غازی تو بنی ہوں۔ میری آپ سب سے التجا ہے کہ بے شک مجھے تمغے نہ دیں، میرے لیے نغمے بھی نہ لکھیں، میرے لیے کورونا ڈیفنس ڈے بھی نہ منائیں مگر پلیز اب مجھے قصائی ڈاکٹر کہنا چھوڑ دیں۔ ذرا ذرا سی بات پر میری بے عزتی کرنا چھوڑ دیں۔ بہت تکلیف ہوتی ہے یہ سب سن کر۔ میں بد دل ہو کر اپنا پیشہ نہیں چھوڑنا چاہتی۔ میں نہتی تھی، میرے مورچے کم زور تھے۔ میرے پاس اسلحے کی کمی تھی پھر بھی اپنا فرض چھوڑ کر نہیں بھاگی۔ میں زخمی ہو کے بھی ڈٹی رہی تھی اور آج پھر ڈیوٹی پر آ گئی ہوں۔

میں اپنے اس مقدس پیشے میں غلطی کر سکتی ہوں، بے ایمانی نہیں۔ کبھی نہیں کروں گی کیوں کہ نہ تو ماں اپنے بچوں سے بے ایمانی کرتی ہے اور نہ سپاہی اپنے ملک و قوم سے۔

میں تو ماں بھی ہوں اور بقول آپ کے ڈاکٹر سپاہی بھی۔

میرے ڈھول سپاہیا تینوں رب دیاں رکھاں

مدتوں بعد اتوار کو بھی آفس کھولنا پڑا کیوں کہ بہت سے ڈاکٹر رات سے ہی فون کر رہے تھے کہ حفاظتی لباس تو کجا ان کے پاس تو دستانے اور ماسک بھی نہیں اور صبح ڈیوٹی پر جانا ہے۔

میں تیس سال وردی میں ڈاکٹر رہا ہوں۔ انڈیا کے ساتھ جنگ کی تیاریاں بھی دیکھی ہیں۔ سیاچن پر ڈیوٹی بھی کی ہے۔ ایران عراق وار سے لے کر بوسنیا اور صومالیا وار میں ڈیوٹی کی اور بہت کچھ قریب سے دیکھا ہے۔ کوئی آرمی اس وقت تک جنگ نہیں لڑتی جب تک اس کے سپاہیوں کو یقین نہ ہو کہ زخمی ہو گئے تو ان کے ڈاکٹر مدد کو موجود ہوں گے۔

کوئی بھی جنگ میڈیکل پلان کے بغیر شروع نہیں ہوتی اور فوج کا کمانڈر اِن چیف اپنی میڈیکل ٹیم کو ان کی ضرورتوں سے مکمل لیس کرنے کے بعد فوج کو میدان میں اتارتا ہے۔

جب ہم فوجی جنگ میں جاتے ہیں تو پتا ہوتا ہے کہ گھر والے محفوظ ہیں۔ اگر جنگ میں

جان گئی تو بچوں کو رہنے کو گھر بھی ملے گا اور فیملی پنشن بھی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی تمغائے جرأت یا تمغائے شجاعت بھی مل جائے اور اس کے ساتھ فیملی کو چار بیگھے زمین بھی۔

آج ڈاکٹروں کی فوج جنگ لڑ رہی ہے۔ اس جنگ میں دشمن نظر نہیں آرہا۔ کہاں سے کس کس پر حملے کرے گا، کچھ پتا نہیں۔ اس فوج کا کوئی کمانڈر ان چیف بھی نہیں جو ان کے اسلحے کا بندوبست کر دے۔ ان کا کوئی اسلحے کا ڈپو بھی نہیں۔ یہ فوج اسٹیتھو اسکوپ کے زور پر اپنا بجٹ بھی نہیں لے سکتی اور اس کے پیچھے تو لاؤڈ اسپیکر سے آواز بھی نہیں آرہی کہ میریا ڈھول سپاہیا تینوں رب دیاں رکھاں۔

فوجی صرف خود زخمی ہوتا ہے یا جان سے جاتا ہے مگر اس جنگ میں جو ڈاکٹر خود زخمی ہوگا وہ اپنی فیملی کو بھی زخمی کر دے گا۔ جان سے گیا تو نہ کوئی تمغا ملے گا نہ گھر، نہ ایک سو بیس گز تک کا کوئی پلاٹ اور اگر بیوی بچے بچ گئے تو شاید پنشن بھی رشوت دے کر منظور کروانی پڑے۔

ہر وہ ڈاکٹر جو کورونا سے لڑتے مریض کو بچا رہا ہے خود کورونا کے حملے سے زخمی ہو رہا ہے۔ میں کل بہت سے ایسے ڈاکٹروں سے ملا ہوں جنھوں نے اپنے بیوی بچے اپنے سسرال یا ماں باپ کے گھر بھیج دیے ہیں۔ میں بہت سی ایسی لیڈی ڈاکٹرز سے ملا ہوں جن کے بچے دو سال سے بھی کم عمر کے ہیں اور وہ ان سے الگ رہ رہی ہیں کہ اگر وہ اس جنگ میں جان سے گئیں تو کم از کم اپنے بچے کو تو بچا لیں۔

فوج میں جنگی محاذ پر یونٹ کا کمانڈر لیڈ کرتا ہے مگر اس نہتی فوج کے سینئرز گھروں میں دبکے بیٹھے ہیں اور جونیئرز کو گھر سے کنٹرول کر رہے ہیں۔ میڈیا کو چاہیے کہ معلوم کریں کتنے سینئر ڈاکٹرز ڈیوٹی پر آرہے ہیں۔ بس اگر کوئی نظر آتا ہے تو ٹی وی پر ماہرانہ رائے دیتے ہوئے۔

کاش آج ہر گھر سے ایک جونیئر ڈاکٹر ڈیوٹی پر جانے کو نکلتا اور یہ ہر گھر اپنے اس سپاہی کے پیچھے ہوتا تاکہ ان کو پتا چلتا کہ یہ مسیحا کس طرح نہتا جنگ میں شریک ہے۔

کاش اس فوج کا کوئی کمانڈر ان چیف ہوتا اور اسے ضرورت کے اسلحے سے لیس کرتا۔

کاش اس فوج کا بھی کوئی وزیرِ اعظم ہوتا اور اعلان کرتا کہ ہم ان کی ضرورت کو پورا کرنے کو بھوکے جی لیں گے۔

میرے ہم وطنو یاد رکھو، اگر آپ کی یہ فوج ہار گئی تو ہم سب اپنے محل نما گھروں کے اندر بغیر علاج کے مر جائیں گے کیوں کہ کورونا اسٹیٹس دیکھے بغیر حملہ آور ہو رہا ہے۔ اس وقت صاحبِ اختیار لوگ آپس کی لڑائیوں میں مصروف ہیں اور کچھ بھی نہیں کر رہے سوائے ٹی وی پر باتیں کرنے کے۔

خدارا باہر نکلیں اور مدد کریں۔ ان ڈاکٹروں کی فوج کے حفاظتی سامان کے لیے عطیات کی بہت ضرورت ہے۔

کوئی میڈم نور جہاں کو بھی آواز دے کہ ایک دفعہ ان کے لیے بھی وہی نغمہ، وہی دعا گا جائیں: ''میریا ڈھول سپاہیا تینوں رب دیاں رکھاں۔''

ویکسین بمقابلہ موبائل سم

کراچی میں کووڈ کی چوتھی لہر کی تباہ کاریوں نے ہمیں چکرا کر رکھ دیا ہے۔ ایک طرف ہم سارا دن بائیکیا کو ایڈریس سمجھا سمجھا کر کووڈ کے مریضوں کو دوائیاں پہنچا رہے ہیں اور دوسری طرف فون کال پر ویکسین لگوانے کے نقصانات کے جوابات دینے میں وقت ضائع کرتے ہیں۔

پڑھے لکھے شخص کا فون آتا ہے کہ سر سنا ہے ویکسین لگوانے سے مردانہ کمزوری ہو جاتی ہے اور پھر بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت بھی مکمل ختم۔ میں نے پوچھا، کس سے سنا ہے۔ کہنے لگا، ہمارے ڈرائیور نے بتایا ہے کہ اس کے کزن نے ویکسین لگوائی اور اب پچھلے چھ ماہ سے اس کی بیوی حاملہ نہیں ہوئی۔

معزز اور جان پہچان کی خواتین کا فون آتا ہے کہ بشیر بھائی، کیا واقعی ویکسین لگوانے سے عورتیں بانجھ ہو رہی ہیں اور یہ دنیا کی آبادی روکنے کا منصوبہ ہے۔ میں نے پوچھا، بہن جی کس سائنس دان نے بتایا آپ کو؟ کہنے لگی، ہمارے گھر کام والی ماسی نے بتایا کہ ڈیفنس میں جن جن عورتوں نے ویکسین لگوائی ہے، بے چاری اب ماں نہیں بن پا رہیں۔

سامنے والے گھر کے باریش پانچ وقت کے نمازی دوست نے مجھے رازداری سے کہا،

بشیر صاحب، اللہ خیر کرے۔ سنا ہے، ویکسین لگوانے والوں کی زندگی دو سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔آج فجر میں مولوی صاحب نے یہودیوں کی مسلمانوں کے خلاف یہ سازش بے نقاب کر دی ہے کیوں کہ ویکسین لگوانے والے دوبارہ بیمار ہو رہے ہیں۔

میں نے گزارش کی کہ ہم جیسے ناچیز ڈاکٹرز، ہمارے ملک کے نام ور میڈیسن کے پروفیسرز، تمام ہیلتھ ورکرز اور گورنمنٹ کے نمائندے تو آپ کو بتا رہے ہیں کہ کووڈ ایک وبا ہے اور جان لیوا بھی ہے،اس سے خود کو اور اپنے پیاروں کو بچانے کے لیے بتائی گئی احتیاطی تدابیر پر عمل کریں اور جو ویکسین مہیا ہے، وہ ضرور لگوائیں مگر ہم سب کی رائے پر ڈرائیور، کام والی ماسی اور گاؤں کے مولوی کی سائنس بھاری پڑ رہی ہے۔

بہت سے لوگوں نے پھر سوال کیا کہ سر، آپ ڈاکٹر ہیں، کوئی ایسی پکی بات بتائیں کہ ہماری پڑھی لکھی قوم کے دل میں آپ کی بات بیٹھ جائے اور وہ ویکسین لگوانے پر ایمان کی حد تک یقین کر لے۔

میں نے کافی سوچ کر ایک وفاقی وزیر کی دھمکی سنا دی کہ اب تجویز یہ ہے کہ جو شخص ویکسین نہیں لگوائے گا،اس کی موبائل سم بند کر دی جائے گی۔

اللہ اکبر کراچی ایکسپو سینٹر پر جا کر دیکھیں ڈرائیور، ماسیاں،سوئپر اور مولوی، پڑھے لکھے معززین لائنیں توڑ توڑ کر آگے نکل کر ویکسین لگوانے کو مرے جا رہے ہیں۔ کہاں گیا نامرد ہونے کا ڈر، اب نہ بانجھ پن کی فکر ہے، نہ دو سال بعد موت کا خوف اور نہ یہودیوں کی اسلام کے خلاف سازشیں یاد ہیں۔

جان سے پیاری، جانم سے باتیں کرنے والی سم کے بند ہو جانے کی دھمکی نے پوری قوم کو یک جا کر کے لائن میں لگا دیا ہے اور آوازیں لگائی جا رہی ہیں، چلو لگاؤ ویکسین، جو موجود ہے وہی لگا دو۔

سم بند ہوگئی تو ساری ساری رات باتیں کیسے ہوں گی صنم بے وفا سے۔

ڈاکٹر قصائی، راشی پولسیے اور بھنگی بھائی تجھے سلام

اللہ بھلا کرے کورونا کا جس نے بڑے بڑے پہلوانوں اور پھنے خانوں کو ایسا چت کر دیا ہے کہ اگر ان میں ذرا سی بھی شرم ہوئی تو اب وہ قوم کے سامنے دوبارہ بڑکیں نہیں ماریں گے۔ وہ سڑکوں پر عزت گردی بھی نہیں کریں گے مگر ان میں شرم ہوئی تو۔

اگر اس لاک ڈاؤن کے ماحول میں آپ گھر سے باہر جھانکیں تو آپ کو صرف تین لوگ کام کرتے نظر آئیں گے جن کو ہم نے کبھی عزت نہیں دی، نہ اب دے رہے ہیں اور وہ ہیں ڈاکٹر قصائی، راشی پولسیے اور بھنگی بھائی۔

لیکن نیچے ایک لسٹ اور بھی ہے، ذرا ملاحظہ فرمائیں۔

میں سیاست دان ہوں، میں نے سینٹ، نیشنل اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کو تالا لگا دیا ہے مگر تنخواہ لے رہا ہوں۔ اپنی فیملی کے ساتھ ڈیفنس والے بنگلے اور گاؤں کی حویلی میں آ کر چھپ گیا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ کورونا مجھ تک کیسے پہنچتا ہے۔ ویسے میں نے ساری جنگ بھی تو بس ٹی وی پر ہی لڑنی ہے۔

میں جج ہوں، انصاف کرنا میرے دائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ آج کل میں نے کورٹ کچہری کو تالہ لگا دیا ہے۔ فی الحال انصاف کی ضرورت نہیں۔ مجھے کورونا کا شک ہو یا نہ ہو اپنے سب گھر والوں کی اسکریننگ کرواتا رہتا ہوں۔ میں نے گھر کے باہر پولسیا بھی کھڑا کر دیا ہے کہ کوئی کورونا لے کر ملنے ہی نہ آ جائے۔ ڈاکٹر قصائی اور میں حلوائی والا کھیل بھی کچھ دن کے لیے بند کر دیا ہے۔ ہاسپٹل کی چیکنگ پر بھی نہیں جاتا۔ سوچا کہ کورونا نے اگر مجھے پہچان لیا تو میں تو گیا۔ دو چار مہینے سوموٹو والے سہانے خواب بھی دیکھنے سے توبہ کی ہے۔

ارے میں وکیل ہوں، کالا کوٹ مکان کی بیسمنٹ میں چھپا دیا ہے۔ سنا ہے کورونا کالے کپڑوں کی طرف بھاگ کر آتا ہے۔ میرا ہاسپٹل میں گھس کر مارنے کا پروگرام بھی ختم ہی سمجھیں۔ قسم کھائی ہے، اب وہاں جا کر وکلا گردی نہیں کروں گا۔ کورونا گلے پڑ گیا تو علاج بھی

انھی سے کروانا ہے جن کو گالیاں دیتا ہوں۔ اب تو ہاسپٹل جائیں میرے دشمن۔

میں فوجی ہوں، سیلاب تھوڑی ہے جو لوگوں کو کندھوں پر اٹھا کر نکالوں۔ میں نے تو ڈنڈے کے زور پر کینٹ میں آنے جانے کے تمام راستے بند کر دیے ہیں۔ سی ایم ایچ میں کسی سویلین کا علاج بھی بند۔ فوجی ڈاکٹروں کی پرائیویٹ پریکٹس بھی بند۔ کورونا کی ایسی تیسی جو ہمارے علاقے کا رخ کرے۔ کہہ دیا ہے بھائی باہر رہو باہر۔

میں کے ایف سی ہوں، میں کولاچی ہوں، میں باربی کیوٹو نائٹ ہوں، میں کباب جی ہوں، میں لال قلعہ ہوں، میں شنواری اور آفریدی ہوں— میں صرف پیسے لے کر کھانا کھلاتا ہوں۔ بھوکے ننگے غریبوں کو منہ نہیں لگاتا۔ ان کو کھانا کھلانے کی ذمہ داری چھیپا، ایدھی اور سیلانی کی ہے۔ وہ کریں ناں اپنا کام۔

میں شیرٹن، میریٹ، پی سی اور رامادہ ہوں۔ میں صرف تندرست لوگوں کو کمرہ دیتا ہوں۔ کورونا کے زخمیوں کو رکھنے سے میرے بستر خراب ہوتے ہیں۔ آخر فائیو اسٹار بستر ہیں میرے۔

میں ہیلتھ کیئر کے سامان کا امپورٹر اور سپلائر بھی ہوں۔ دعا کرتا رہتا ہوں، اللہ میاں کورونا پھیلا دے۔ میری چاندی سونا بن رہی ہے۔ میرا دو روپے کا ماسک پچاس کا بک رہا ہے اور کوئی ریکارڈ بھی نہیں۔ سب کیش چلتا ہے۔ ٹیکس بھی ختم۔ میں تو افواہیں پھیلاتا رہتا ہوں کہ کورونا سے بچنا ہے تو ماسک خریدو۔ بھئی اور خریدو۔

میں چینی، آٹے کا ذخیرہ کرتا ہوں۔ میں وزیرِاعظم سے دوستی چھوڑ سکتا ہوں۔ ذخیرہ کرنا نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے تو وصیت بھی کر دی ہے کہ اگر کورونا سے مر جاؤں تو میرا مقبرہ چینی اور آٹے سے بنایا جائے۔

اور اب سنیں۔ ہم ہیں پولسیے اور بھنگی۔ آپ کو دن رات سڑکوں پر مزے کرتے گل چھڑے اڑاتے نظر آتے ہیں۔ سڑکوں پر ڈیوٹی کرتے ہیں تو بھوک لگتی ہے نہ پیاس۔ نہ دھوپ چبھتی ہے نہ لوگوں کی نفرت بھری نظریں۔ کبھی اکٹھے بیٹھیں تو دکھ سکھ کر لیتے ہیں۔ سمجھا لیتے ہیں خود کو کہ کسی کی باتوں پر نہ جانا۔ اپنا کام کرتے رہنا ہے ورنہ یہ مہذب لوگ شہر میں اتنی افراتفری اور کوڑا کرکٹ پھیلا دیں گے کہ ہم کورونا سے بچ بھی گئے تو ان کی لوٹ مار اور گندگی سے مر

جائیں گے۔

اور ہم ڈاکٹر قصائی، ملک کے ہر ہاسپٹل کے ہر وارڈ، ہر او پی ڈی میں موجود ہیں، پی پی سوٹ کے بغیر۔ کورونا کے زخمیوں کے ساتھ خود بھی زخمی ہو رہے ہیں اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اپنے بوڑھے ماں باپ کو بھی زخمی کر رہے ہیں مگر اپنے قصائی پن سے باز نہیں آتے۔ ایک نہ رہا تو پیچھے ہماری پوری فوج تیار کھڑی ہے۔ ایک ڈاکٹر قصائی گرے گا تو دوسرا آپ کو بچانے پہنچے گا۔ ہم زخمی کو اٹھاتے وقت یہ بھی نہیں سوچتے کہ:

''اس سیاست دان نے تو ہمیں معطل کروایا تھا۔''

''اس جج نے تو سرِ عام ہماری بلا وجہ بے عزتی کی تھی۔''

''اس کالے کوٹ والے نے تو ہمیں گھس کر مارا تھا۔''

ہم تو بس کورونا سے زخمی کو بچانے میں لگے ہیں بے شک خود ہی جان سے چلے جائیں۔ گواہ رہنا آپ سب لوگ۔

اور ہو سکے تو ڈاکٹر قصائی، راشی پولسیے اور بھنگی بھائی کو گالیاں دینا بند کر دیں۔

ٹھنڈا پانی

۲۰۲۰ء میں جب کراچی شہر میں کورونا کے بڑھتے مریضوں کی وجہ سے لاک ڈاؤن کرنا پڑا تو ڈاکٹرز اور ہیلتھ کیئر ورکرز کے پاس اپنی حفاظت کے لیے بھی کچھ نہ تھا۔ میں روزانہ صبح آٹھ بجے گھر سے نکلتا۔ نیو کراچی انڈسٹریل ایریا جاتا، فیکٹری سے تیار شدہ پی پی سوٹ جیپ میں لوڈ کرواتا اور پھر ہاسپٹلز میں ڈاکٹرز اور اسٹاف کو پہنچاتا۔ یہ سارا کام مجھے خود کرنا پڑتا تھا کیوں کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے کسی گاڑی کو چلنے نہیں دے رہے تھے۔

گیارہ بجے کے قریب واپسی میں خوب دھوپ ہوتی اور سڑک پر آپ کو کھڑے رینجرز اور پولیس کے جوان یا پھر صفائی کرتے سینٹری ورکرز نظر آتے تھے اور سب کے سب پسینے میں شرابور۔ ایک دن سہراب گوٹھ سے پہلے روڈ پر ایک چیک پوسٹ پر میری جیپ کو پولیس سولجر نے

روکا۔ جیپ چیک کرتے ہوئے اس نے پوچھا کہ آپ نے جیپ میں کیا بھر رکھا ہے۔ میں نے بتایا یہ ڈاکٹرز کے حفاظتی سوٹ ہیں اور ہماری فاؤنڈیشن یہ سب سامان ان کو فری مہیا کرتی ہے۔

سولجر نے میری جیپ پر لگے بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن کے اسٹیکر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس بریگیڈیئر سے کہنا کہ ڈاکٹروں کے لیے اتنا کر رہے ہو تو ہمیں پانی ہی پلا دیا کرو۔ سارا دن پیاسے کھڑے رہتے ہیں دھوپ میں۔ نہ کوئی دکان کھلی ہے، نہ کہیں سے کچھ کھانے پینے کو ملتا ہے۔ ہم تو ان ڈاکٹروں سے بھی سخت ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ اس سولجر کی یہ باتیں سن کر مجھے تو جیسے سانپ ہی سونگھ گیا تھا ایک دم۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھا جو کہہ سکتا کہ بریگیڈیئر تو میں خود ہی ہوں۔ چوں کہ میں نے مکمل گاؤن اور چہرے پر ماسک چڑھایا ہوتا تھا، اس لیے وہ مجھے جیپ کا ڈرائیور سمجھ رہا تھا اور فاؤنڈیشن کے کام کی وجہ سے چھوڑ دیتا تھا۔

سب بازار تو بند تھے۔ میں نے آگے جا کر گاڑی ایک محلے کی گلی میں موڑی۔ گھر میں بنی ایک دکان کھلی تھی۔ وہاں سے پانی کی چھوٹی بوتلیں اور بہت سارے بسکٹ خریدے اور واپس گھوم کر پھر اسی چیک پوسٹ پر پہنچ گیا۔ چپ چاپ گاڑی روکی اور دروازے کا شیشہ نیچے کر دیا۔ وہی سولجر تھا۔ میں نے کہا، جی یہ لیں پانی اور ان شاء اللہ اب آپ پیاسے نہیں کھڑے ہوں گے۔ کیوں کہ یہاں سے ہماری یہ گاڑی روزانہ گزرتی ہے۔

پھر میں نے یہ معمول بنا لیا کہ سہراب گوٹھ سے راشد منہاس روڈ اور پھر شاہراہِ فیصل پر سولجرز اور سینیٹری ورکرز کو پانی پلاتا اور بسکٹ بانٹتا آفس پہنچتا۔ شرمندگی یہ تھی کہ گاڑی میں پینے کے لیے خود تو ٹھنڈا پانی رکھتا تھا پر ان مجاہدوں کا خیال پہلے کیوں نہ آیا۔ ایک دوست سے بات کی تو انتہائی سستے ریٹ پر پانی اور بسکٹ مہیا ہو گئے۔ میں نے اپنی باقی دونوں گاڑیوں میں بھی رات کو ٹھنڈا کیا پانی اور ساتھ بسکٹ رکھنے شروع کر دیے اور پھر آہستہ آہستہ ہماری گاڑیوں کا انتظار ہونے لگا کہ گاڑی گزرے گی تو یہ سب ملے گا۔

ایک دن مجھے سہراب گوٹھ پر ایک پولیس انسپکٹر نے روکا اور پوچھا کہ آپ کون ہیں جو روز ہمیں پانی اور بسکٹ پہنچاتے ہو۔ میں نے بہت ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ بضد رہا کہ میں فیس ماسک اتار کر اپنا تعارف کرواؤں۔ مجھے بتانا پڑا کہ بریگیڈیئر بشیر آرائیں میں خود ہوں۔ وہ پولیس

انسپکٹر دو قدم پیچھے ہٹا اور مجھے سلیوٹ کر کے کہنے لگا، سر آپ ہمارے ڈی آئی جی کے برابر کے آفیسر ہیں اور اس گرمی میں سارا دن ہمیں سڑکوں پر پانی پلاتے پھرتے ہیں۔ آپ نے ہماری فوج کی عزت ہمارے دلوں میں مزید بڑھا دی ہے۔ سر ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو ہم حاضر ہیں۔ میں نے اسے بس اتنا کہا کہ اپنی حیثیت میں خلقِ خدا کے لیے آسانیاں پیدا کرتے رہا کریں۔

آج بھی یہ سب سوچتا ہوں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ ان دنوں پھر میں کہیں سے بھی گزرتا تھا تو لاک ڈاؤن میں ڈیوٹی کرتے سولجرز اور سینیٹری ورکرز کو پانی ضرور پلاتا جاتا تھا کیوں کہ اب تو گاڑی ٹھنڈے پانی اور بسکٹ سے بھری ہوتی تھی۔

بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن

بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن

میں نے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد ہاؤس جاب مکمل ہوتے ہی فوج میں کمیشن لے لیا۔ چھٹی پر جب بھی گھر آتا نواب شاہ میں علی بھائی کو اکثر لوگوں کی مدد کرتے دیکھتا تھا۔ میری شادی کے بعد وہ ہم دونوں میاں بیوی کے پیچھے بھی پڑے رہتے تھے کہ آپ دونوں کماتے ہو تو کچھ اللہ کی راہ میں بھی خرچ کیا کرو۔ بی بی جی کی تو عادت تھی ہی کہ جب دل چاہا آہستہ سے کچھ کہہ دیتیں۔ ان کا تو کہا حکم سمجھ کر کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح ہمارے گھر میں ضرورت مندوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا، حالاں کہ ہم خود بھی متوسط درجے کی زندگی گزار رہے تھے اور گھر میں پیسے کی ریل پیل تو کبھی بھی نہ تھی۔ علی بھائی نے بھی میاں جی کی طرح زندگی میں بہت محنت کی۔ فوج میں سولجر کی حیثیت سے نوکری کی۔ جلدی ریٹائرمنٹ لے کر سیشن کورٹ میں اسٹینوگرافر بن گئے۔ قانون کی کتابیں پڑھنا شروع کیں تو ایل ایل بی کر لیا اور ہائی کورٹ تک وکالت کرنے لگے۔ وہ انتہائی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ فیملی کیسز زیادہ لیتے تھے۔ لوگ پنجاب سے کورٹ کچہری کی تاریخوں پر آتے تو ان کو اپنے گھر میں ٹھہراتے۔ ان کے کیس لڑتے اور کبھی کوئی لمبی چوڑی فیس کا تقاضا بھی نہ کرتے۔ جس کی جو گنجائش ہوتی، چپ چاپ لے لیتے۔ لوگ اردگرد کے شہروں اور نواب شاہ میں ان کو بے تحاشا عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میں ان کی موت سے پہلے اس راز کو کبھی نہ جان پایا مگر ان کو اچانک ہارٹ اٹیک ہوا تو جس طرح پرائے لوگوں اور خاص طور پر بیواؤں اور غریب عورتوں کو روتے دیکھا، میں سمجھ گیا کہ ان کی اتنی سادہ زندگی کا راز کیا تھا۔ جو کماتے تھے اسی مہینے میں غریب ضرورت مند خاندانوں پر خرچ کر دیتے۔ ہائی کورٹ کے وکیل کی وفات پر اس کا بینک بیلنس چند سو روپے نکلا تو شہر میں ان کے احترام کے مزید در کھلے۔

بی بی جی ساری زندگی یہی سبق پڑھاتی رہی تھیں مگر بھائی کی وفات کے بعد کئی نئے راز سمجھ آئے۔ ایسی تحریک ملی کہ اب کسی ضرورت مند کی مدد کر کے خوشی محسوس ہوتی تھی۔ خلقِ خدا کے لیے کام کرنے کے سو طریقے ہیں مگر اب خاندان میں یہ مشورہ ہونے لگا کہ باضابطہ کام کے لیے کوئی نہ کوئی تنظیمی ڈھانچا بنانا ضروری ہے کیوں کہ لوگ اب پوچھنے لگے تھے کہ سر آپ کی فلاحی تنظیم کا نام کیا ہے۔ میں بتاتا کہ تنظیم تو نہیں ہے مگر ہم میاں بیوی اور سب بہن بھائی مل کر کسی کی بھی مدد کر دیتے ہیں۔ دوست بھی کہنے لگے، اب کوئی ادارہ بنائیں اور لوگوں کی تعلیم اور صحت کے لیے با قاعدہ کام شروع کریں۔ چوں کہ لوگ مجھے میرے نام سے جانتے تھے، اس لیے اسی مناسبت سے ۲۰۱۵ء میں بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن رجسٹر کروائی۔ تب سے ہم نے اس فاؤنڈیشن کے نام سے کام شروع کر دیا۔

اپنے کاروبار اور بیگم کی تنخواہ کا کچھ حصہ با قاعدگی سے اللہ کے نام سے نکالنا شروع کیا اور اس کارِ خیر سے کاروبار میں ترقی ہونے لگی۔ بی بی جی کی باتیں بھی سچ ہوتی گئیں کہ اللہ کے نام پر بانٹیں گے تو اس کے گھر سے مزید ملے گا۔ پروردگار ہمارے اس یقین کو پختہ کرتا گیا۔ میں نے دو سال بعد ہی سندھ اسمبلی کا رُخ کیا اور بغیر کسی رکاوٹ کے بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن کے لیے اتحاد یونی ورسٹی کا آل پاکستان چارٹر مل گیا۔ لوگ سمجھتے ہیں، میں نواب شاہ کا رہائشی ہونے کے ساتھ فوجی بھی ہوں تو اس لیے یونی ورسٹی بنانے کا چارٹر آسانی سے ہو گیا مگر میں سچ کہتا ہوں کہ صرف اللہ کی ذات ہی مددگار تھی کیوں کہ اس سارے قصے میں نہ تو سیاسی طور پر نواب شاہ کا نام استعمال ہوا اور نہ فوجی ہونے کے ناتے کہیں سے کوئی نامعلوم مدد آئی۔

۲۰۲۰ء میں کورونا کی وبا پھیلی تو بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن کا نام ملکی سطح پر نمایاں ہوا۔ کورونا کی وبا نے جہاں پوری دنیا میں تباہی مچائی وہیں پاکستان بھی بہت متأثر ہوا۔ جیسے جیسے وبا پھیلتی گئی پاکستان میں عام انسانوں کی زندگی مشکل ہوتی گئی۔ ملک لاک ڈاؤن کی طرف گیا تو لوگوں کے کاروبار بند ہوئے، نوکریاں گئیں۔ سب سے زیادہ دیہاڑی دار طبقہ بے روزگار ہوا۔ ریڑھی لگا کر روزی کمانے والے، اسکول ٹیچرز اور فوڈ انڈسٹری میں کام کرنے والے لوگ بے روزگار ہو گئے۔ دو تین ماہ میں ہی لوگوں کی جمع پونجی ختم ہو گئی اور ان کو ایک وقت کھانے کے لالے پڑ گئے۔

دوسری طرف کورونا کے متأثر بیمار لوگوں کے لیے گورنمنٹ سیکٹر میں علاج کی سہولیات مہیا

بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن اور اتحاد یونی ورسٹی کا لوگو

The Sindh Government Gazette

Published by Authority

KARACHI WEDNESDAY FEBRUARY 15, 2017

PART-IV

PROVINCIAL ASSEMBLY OF SINDH

NOTIFICATION

KARACHI, THE 15TH FEBRUARY, 2017

NO.PAS/LEGIS-PB-01/2017-The Etihad University Bill, 2017 having been passed by the Provincial Assembly of Sindh on 31st January, 2017 and assented to by the Governor of Sindh on 13th February, 2017 is hereby published as an Act of the Legislature of Sindh.

THE ETIHAD UNIVERSITY ACT, 2017.

SINDH ACT NO. I OF 2017.

اتحاد یونی ورسٹی کا چارٹر نوٹیفیکیشن گورنمنٹ آف سندھ

اتحاد یونی ورسٹی کی انتظامیہ ٹیم

نیشنل ہائی وے پر اتحاد یونی ورسٹی کی آراضی

بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن فری ایمبولینس سروس، نواب شاہ۔

بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن، تھر میں وومن ایمپاورمنٹ پروجیکٹ۔

تھر میں سولر واٹر سسٹم کے تحت کنویں لگانے کا پروجیکٹ۔

اسٹریٹ چلڈرن کے اسکول میں، بچوں کے ساتھ لنچ۔

ہونا مشکل ہوگیا۔ کورونا میں استعمال ہونے والی ادویات اور بچاؤ کا سامان مارکیٹوں سے غائب ہوگیا یا بلیک میں بکنے لگا۔ سرمایہ داروں نے منافعے کے لالچ میں سب کچھ لوگوں کی پہنچ سے باہر کر دیا۔ گورنمنٹ کی گرفت منافع خوروں پر ڈھیلی پڑی تو ملک میں خوف پھیلنے لگا۔ پرائیویٹ ہیلتھ انڈسٹری نے لوٹ مار شروع کر دی۔ لوگوں نے علاج کروانے کے لیے گھر کا سامان اور زیورات بیچنا شروع کر دیے۔ غریب غربا ہاسپٹلز میں بے یار و مددگار دھکے کھا رہے تھے۔ یہ سب حالات صرف دو ہفتوں میں عروج پر پہنچ گئے۔

یہی وہ وقت تھا جب بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن نے اس بلیک مارکیٹنگ اور منافع خوری کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔ چوں کہ میرا ذاتی کاروبار بھی میڈیسن سپلائیز کا ہے، اس لیے ہم نے بھی مارکیٹ اور کمپنیوں سے کورونا کے علاج کی ادویات اور احتیاط اور بچاؤ کا سامان خرید کر ذخیرہ کر لیا۔ پھر اپنی حکمت عملی کے مطابق فاؤنڈیشن کے نام سے سوشل میڈیا پر پیغام چلایا کہ پورے پاکستان میں کسی بھی شہر یا گاؤں قصبے میں اگر کوئی کورونا کا مریض دوائی نہیں خرید سکتا تو سب کچھ مفت حاصل کرنے کے لیے ہم سے رابطہ کرے۔ بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن نے پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں والنٹیئرز ڈھونڈے۔ ان کے پاس ادویات، سینی ٹائزر اور فیس ماسک رکھوائے اور ضرورت مندوں کو یہ سب کچھ کم سے کم وقت میں فری ملنا شروع ہوگیا۔ ہمارے اس کام کی تشہیر نیشنل ٹی وی چینلز نے بھی شروع کر دی۔

ہم نے اسکول اور کالج کے بچوں کی مدد سے شہر کے میڈیکل اسٹورز کے سامنے اور ہاسپٹلز میں تشہیر شروع کی کہ کوئی مریض بلیک میں دوائی نہ خریدے بلکہ ہم سے فری حاصل کر لے۔ پورے ملک سے لوگ ہمیں اپنی کورونا کی مثبت رپورٹ اور ایڈریس واٹس ایپ کرتے اور ہم ادویات کراچی سے باہر کوریئر سروس اور کراچی شہر میں بائیکیا کے ذریعے ان کے گھروں تک مفت پہنچانے لگے۔ فارماسیوٹیکل انڈسٹری کے بہت سے سیٹھ لوگ ہم سے بہت ناراض ہوئے کہ یہی تو کمانے کا وقت تھا، لیکن ہم نے ان کی منافع خوری کی حکمتِ عملی کو مٹی میں ملا دیا۔ کراچی میں تو ہماری فاؤنڈیشن نے کورونا کے مریضوں کو ان کے گھروں میں ہی رکھ کر ضرورت کی تمام دواؤں کے ساتھ انھیں دو ہفتوں کا راشن بھی مہیا کرنا شروع کیا اور وقت گزارنے کو اردو اور انگریزی ترجمہ کے ساتھ قرآن مجید مہیا کیے تا کہ بیماری میں ربِ کریم سے اپنا رشتہ بھی مضبوط کریں۔

شکر الحمدللہ کہ اس طرح ہمارے بہت ہی کم خرچے میں لوگوں کا علاج ہونا شروع ہوا اور وہ دو ہفتوں میں تندرست اور علامات سے فری ہوتے گئے۔ جو علاج پرائیویٹ ہاسپٹلز میں آٹھ دس لاکھ میں ہورہا تھا، وہی علاج ہم دس بارہ ہزار خرچ کر کے کسی بھی مریض کی مدد کرتے رہے۔ اس پورے وقت میں ہم نے فاؤنڈیشن کے پلیٹ فارم سے نہ کوئی فنڈ ریزنگ کی، نہ چندہ اکٹھا کرنے کی مہم چلائی اور سارا کام اللہ کی مدد سے اپنے ہی کاروبار سے خود ہی انجام دیتے رہے۔ ہمارے اس کام کی گونج بیرونِ ملک تک پہنچی اور اس طرح بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن مشہور ہوتی گئی۔ میرے انٹرویو لینے کو ٹی وی چینلز اور سوشل میڈیا کے لوگ تو آ ہی رہے تھے مگر حیرت تب ہوئی جب مجھے لیفٹیننٹ جنرل ہمایوں کمانڈر ۵ کورز کراچی کا ستائش بھرا پیغام ملا اور مجھے چائے پر مدعو کیا گیا۔ ان کی بات سنی تو ایک اور خوش گوار حیرت سے دوچار ہوا۔ کہنے لگے، آپ نے فوج کے لیے نیک نامی تو بہت کمائی مگر ایک سوال یہ ہے کہ پورے پاکستان میں مفت ادویات اور کورونا سے بچاؤ کا سامان مہیا کرنے کے لیے آپ کے پاس سرمایہ کہاں سے آرہا ہے؟

میں نے گزارش کی کہ اس کا جواب میں زیادہ آفیسرز کی موجودگی میں دینا چاہتا ہوں تاکہ سب کو پتا چل سکے کہ قوم پر مشکل آتی ہے تو ہم لوگوں کو کس طرح لوٹتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ جب چھ روپے والا ڈیکسامیتھازون انجکشن دو ہزار کا اور پندرہ سو روپے والا ریمڈیسویر انجکشن بیس ہزار کا فروخت ہونے لگے تو ضرورت مندوں کی مدد کرنے کے لیے آپ کو سرمائے سے زیادہ اچھی نیت اور توکل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے مجھے کسی سرمائے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ میں تو چھ روپے اور پندرہ سو روپے والے انجکشن مفت پہنچا کر کورونا سے مرتے لوگوں کی مدد کر رہا ہوں۔ یہ ساری معلومات کور کمانڈر کے لیے حیرت کا باعث تھیں اور اس طرح ان کی نظر میں بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن کی عزت مزید بڑھ گئی۔ ان کو فکر تھی کہ ایک ریٹائرڈ آرمی آفیسر کو کوئی غلط تنظیم یا فرد اپنے مقاصد کے لیے مالی طور پر اسپانسر نہ کر رہا ہو۔

آہستہ آہستہ دوست احباب اور ملنے جلنے والے بھی اس کارِ خیر میں شامل ہوتے گئے اور ہم لوگوں کی مدد کرنے کا دائرہ بڑھاتے گئے۔ ان دو سالوں میں ایک حیرت انگیز مشاہدہ ہوا کہ جو بڑے سرمایہ دار تھے وہ منافع کمانے میں لگے رہے۔ اس طرح کے لوگوں نے اپنے کاروبار

چھوڑ کر فیس ماسک، ہینڈ گلوز، سینی ٹائزر اور پروٹیکٹیو سوٹ امپورٹ کرنے شروع کیے اور ضرورت مندوں کو مہنگے داموں فروخت کر کے خوب منافع کمایا۔ اس کے برعکس چھوٹے کاروباری لوگ، تنخواہ دار طبقہ اور گھریلو خواتین اور نوجوان بچے بچیوں نے لوگوں کی مدد کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بہت سے لالچی لوگ اس کالے کاروبار میں اپنا سرمایہ ڈبو بیٹھے کیوں کہ بعد میں ان کے امپورٹ کردہ سامان کا کوئی خریدار نہ رہا اور سب ضائع ہو گیا۔

اللہ کا نظام دیکھیے کہ بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن لوگوں کی مدد کرتے کرتے غیر ملکی این جی اوز کی نظر میں آئی اور انھوں نے مستقل بنیادوں پر اپنے چیریٹی کاموں اور ہاسپٹلز کے لیے سامان ہم سے خریدنے کے معاہدے کر لیے۔ ہم نے خلقِ خدا کی مدد کے لیے جس قدر خرچ کیا تھا، ربِ کریم نے مختلف طریقوں سے کہیں زیادہ ہمیں لوٹانا شروع کر دیا ہے اور اس طرح جلد ہی اتحاد یونی ورسٹی بھی شروع ہو جائے گی۔

کورونا کے مریضوں کی دیکھ بھال سے فراغت کے بعد آج کل فاؤنڈیشن تھر میں گاؤں گاؤں سولر سسٹم کے ساتھ پانی کے کنویں لگا رہی ہے اور جس دن کسی گاؤں میں پہلی دفعہ موٹر چلا کر پانی مہیا ہوتا ہے، اس دن گاؤں کے لوگوں کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ میں سچ بولوں تو ہم نے اپنے سرمائے سے صرف پانچ کنویں لگائے اور اس کے بعد ستر کنوؤں کے لیے رقم دوستوں، بہن بھائیوں اور ملنے ملانے والوں نے مہیا کر کے ہمیں صرف سہولت کار بنا دیا ہے۔ لوگ اپنے لیے صدقۂ جاریہ اور بچھڑے پیاروں کے لیے ایصالِ ثواب کے طور پر تھر کے لوگوں کا پانی کا مسئلہ حل کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔

بی بی جی اور میاں جی کی خواہش کے مطابق بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن فری ایمبولنس سروس کا آغاز بھی نواب شاہ سے کر دیا ہے کیوں کہ اپنے گاؤں اور شہر کے ضرورت مندوں کا حق بہرحال ہم پر سب سے زیادہ ہے۔ میں ہر وقت اللہ سے دعا گو رہتا ہوں کہ موت سے پہلے وہ ہم سے بھلے کے کام لیتا رہے کہ اس کی رضا کے بغیر تو میں اپنا پیٹ نہیں بھر سکتا تو اوروں کی مدد کیسے کر پاؤں گا۔

خاک سا خا کی — کتاب کا دوسرا ایڈیشن

''خاک سا خا کی'' کا دوسرا ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ پچھلے سال کتاب شائع ہو کر آئی تو ارادہ تھا کہ خوب اہتمام کے ساتھ اس کی رونمائی کریں گے مگر ایسا ممکن ہو نہ سکا۔ ہمارے دوستوں اور اس سے بڑھ کر کتاب کے دوستوں کو خبر ہوگئی کہ ''خاک سا خا کی'' کا اسٹاک میرے گلشنِ جمال والے دفتر میں پہنچ چکا ہے۔ پھر کیا تھا صاحبِ ذوق کتاب حاصل کرنے آتے گئے اور چند ہی دنوں میں ہمارے پاس کتاب کی تعداد کم ہوتے ہوتے اتنی بچ ہی نہ پائی کہ ہم تقریبِ رونمائی منعقد کر پاتے۔

''جنگ'' کے سنڈے میگزین مورخہ ۱۳/نومبر ۲۰۲۲ء میں اختر سعیدی صاحب نے نئی کتابوں کے عنوان میں شہرۂ آفاق مصنّفین محترم جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی بارات''، محترم کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی ''یادوں کا جشن'' اور محترم احسان دانش کی ''جہانِ دانش'' کے حوالوں کے بعد مجھ ناچیز کی اس کاوش کے بارے میں ایسا کچھ لکھا کہ عام پڑھنے والوں کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کے فون بھی آنے لگے کہ سر آپ کی کتاب ''خاک سا خا کی'' کی نئی نسل میں مقبولیت کا راز کیا ہے جب کہ سوشل میڈیا کے اس دور میں تو بچے کتاب پڑھنے کی طرف زیادہ راغب نظر آتے ہی نہیں ہیں۔

میں نے ہر پوچھنے والے کے لیے کتاب کے بارے میں لکھ بھیجا کہ آپ کو زندگی میں اگر وسائل کی کمی کے باوجود امید کا دامن تھامے رکھنا ہے، اگر لمبی ٹھٹھرتی راتوں اور تپتی دھوپ میں لمبے کٹھن راستوں پر ہار جیت سے بے نیاز جہدِ مسلسل کی ہمت پانی ہے، اگر راستے اور منزلیں مشکل لگتی ہیں مگر ماں کی دعاؤں کے آسمان پر سنے جانے پر یقین ہے یا بچپن میں ماں کی شیشم کے گھنے درختوں جیسی ٹھنڈی ٹھار چھاؤں اور مخمل کی طرح نرم و گداز گود میں لیٹ کر سنی نصیحتوں پر عمل کرنے کے پھل کھانے ہیں، اگر پروردگار کی غیبی مدد سے اپنے ہی زورِ بازو پر زندگی کی دوڑ جیتنی اور بن پَروں کے اڑنا سیکھنا ہے، اگر توکل پر یقین محکم ہے اور ''اللہ دن پھیرتا ہے'' جیسی کہاوتوں کو دل سے مانتے ہیں، اگر والدین حیات نہیں اور ان کی یادیں کبھی ستاتی ہیں کبھی رُلاتی اور ہنساتی ہیں، اگر اپنی کمائی سے کسی ضرورت مند کی مدد کر کے خلقِ خدا کے دلوں سے نکلی دعاؤں کی آسمانوں پر قبولیت کی حقیقی بازگشت سننی ہے، اگر زندگی میں خوش رہ کر لمبی راتوں میں سکون کی نیند کے مزے لوٹنے ہیں، اگر رزقِ حلال کے کرشمے اور اس سے پلی نیک اولاد کے سکھ دیکھنے ہیں، اگر پھل دار درختوں کا زمین پر جھکے رہنا جیسی کہاوتوں کی سچائی اور اپنوں سے جڑے رہنے کی لذت چکھنی ہے اور پھر یہ سب کچھ سچ ہوتا بھی دیکھنا ہے تو کتاب ''خاک سا خا کی'' کا دوسرا ایڈیشن آنے پر اسے ایک دفعہ ضرور پڑھ لیں۔

شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

بریگیڈیئر بشیر آرائیں

زندگی سبھی گزارتے ہیں لیکن اس طرح کہ اکثریت کو نہ تو اُس کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی کبھی اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ تاہم کچھ لوگ زندگی کو نہ صرف انگلیوں کے پوروں سے چھو کر محسوس کرتے ہیں، بلکہ پیکروں اور قاشوں کی صورت میں اس طرح محفوظ بھی کرتے ہیں کہ بعدازاں یہ ٹکڑے جیتی جاگتی زندگی کی طرح دوسروں کو پیش کیے جا سکتے ہیں۔ بریگیڈیئر بشیر آرائیں اسی قبیل کے لوگوں میں ہیں۔

''خاک سا خاکی'' بریگیڈیئر بشیر آرائیں کا زندگی نامہ ہے۔ اس کتاب میں ہمیں اُن کی ابتدائی زندگی، تعلیم، خاندانی ماحول، ملازمت کے مختلف مراحل کی روداد، شب و روز کے اہم واقعات غرضے کہ وہ سب کچھ پڑھنے کو ملتا ہے جو ایک شخص کی یادوں یا سوانح عمری میں بالعموم پایا جاتا ہے، لیکن یہ عمومی مزاج کی سوانح عمری نہیں ہے۔ اپنے نام سے لے کر اندرونی صفحات پر درج واقعات تک اس کتاب میں کتنی ہی باتیں ایسی ہیں جو روشِ عام سے ہٹ کر ہیں۔ اس کا سبب دراصل بریگیڈیئر بشیر آرائیں کا اپنا مزاج، اندازِ نظر اور چیزوں، لوگوں اور حالات کو الگ رُخ سے دیکھنے کا رویہ ہے۔ یہ امر بھی لائقِ اعتنا ہے کہ اُن کی زندگی کے نشیب و فراز اور گرم و سرد کی نوعیت بھی کچھ الگ ہے۔ یہ قدرت کا عمل ہے کہ جن لوگوں کو ابھرنا ہو، انھیں وقت کی موجیں اچھالتی جاتی ہیں۔ تاہم زندگی کے سمندر میں تیرتے ہوئے تند و تیز موجوں کو سہارتا تو ہر فرد اپنی فطرت اور ظرف کے مطابق ہے۔ بریگیڈیئر بشیر آرائیں نے موج در موج زندگی کا لطف ہی کشید نہیں کیا بلکہ ان موجوں نے جو ہیرے موتی ان کو دیے ہیں، انھیں بھی دامنِ دل میں سنبھال کر رکھا ہے۔ بی بی، میاں جی، اساتذہ، سینئر جونیئر ساتھی اور اہلیہ کا تذکرہ اس کتاب میں محفوظ کیے گئے موتیوں ہی کی صورت میں ہم ملاحظہ کرتے ہیں۔

بریگیڈیئر بشیر آرائیں کا اندازِ نگارش رواں اور اسلوب سادہ ہے، لیکن باتوں میں گہرائی ہے جو زندگی کے تجربات و مشاہدات نے پیدا کی ہے۔ ان باتوں میں نئی نسل کی تربیت کا سامان بھی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ایک شخص کے ماضی سے اس کے مستقبل کی طرف راستہ بناتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

مبین مرزا

بریگیڈیئر بشیر آرائیں

پیدائش: ۳؍ نومبر ۱۹۵۵ء

جائے پیدائش: گاؤں ڈھولے والی گوٹھ، ضلع نواب شاہ (شہید بینظیر آباد)

تعلیم: (۱۹۶۸ء) اردو پرائمری مین اسکول، نواب شاہ
(۱۹۷۳ء) ڈی سی ہائی اسکول، نواب شاہ
(۱۹۷۵ء) گورنمنٹ ڈگری کالج، نواب شاہ
ایم بی بی ایس (۱۹۸۳ء) لیاقت میڈیکل کالج، جامشورو (لیاقت یونی ورسٹی آف ہیلتھ اینڈ میڈیکل سائنسز)
ماسٹرز ایڈوانس میڈیکل ایڈمنسٹریشن (۲۰۰۶ء) قائدِ اعظم یونی ورسٹی، اسلام آباد
ماسٹرز بزنس ایڈمنسٹریشن (۲۰۰۸ء) ہمدرد یونی ورسٹی، کراچی

پیشہ ورانہ مصروفیات

آرمی سروس: ۲۴؍ دسمبر ۱۹۸۳ء (کیپٹن) سے ۲۱؍ فروری ۲۰۱۲ء (بریگیڈیئر)

یونائیٹڈ نیشنز مشنز

گلف وار (آپریشن ڈیزرٹ اسٹورم ۱۹۹۱ء)
صومالیہ وار (آپریشن یونائیٹڈ نیشنز ریپیٹریشن فورس ۱۹۹۴ء)
بوسنیا وار (یونائیٹڈ نیشنز پروٹیکشن فورس ۱۹۹۵ء)

حج میڈیکل مشنز

ممبر (۱۹۹۶ء)، ڈپٹی ڈائریکٹر (۲۰۰۶ء)

فلاحی خدمات

مستحقین کے لیے صحت و تعلیم پروجیکٹ ۲۰۱۵ء (جاری ہے)
پیاسا تھر۔ سولر واٹر سسٹم پروجیکٹ ۲۰۲۰ء (جاری ہے)
بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن فری ایمبولینس سروس ۲۰۲۲ء (جاری ہے)

پریذیڈنٹ بریگیڈیئر بشیر فاؤنڈیشن ۲۰۱۵ء
چانسلر اتحاد یونی ورسٹی ۲۰۱۷ء
سرپرستِ اعلیٰ آرائیں برادری صوبہ سندھ ۲۰۲۱ء